بے سمت قافلے

(افسانے)



طارق شبنم

محترم سلیم سالک کی نذر

تحفۂ محبت

صادق شبنم

بے سمت قافلے

(افسانے)

طارق شبنم

جی۔این۔کے۔پبلی کیشنز

اس کتاب میں شامل سبھی کردار، کہانیاں اور واقعات فرضی ہیں۔
کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی جس کے لئے مصنف یا ناشر ذمہ دار نہیں ہوگا۔

BESAMT QAFLEY
(Short Stories)

by : Tariq Shabnam

Year of 1st Edition 2024
ISBN 978-81-19991-02-0
Price Rs. 450.00

نام کتاب	:	بے سمت قافلے (افسانے)
مصنف	:	طارق شبنم
طبع اوّل	:	2024
صفحات	:	282
قیمت	:	450 روپے
تعداد	:	500
مطبع	:	جی۔این۔کے پرنٹرس، نئی دہلی

:-ملنے کے پتے:-

☆ میزان پبلشرز، Opposite فائیر سروس ہیڈکوارٹر، بٹہ مالو، سرینگر
☆ کراون بک سیلرس، مین چوک، اجس بانڈی پورہ۔9797013952
☆ بٹ سٹیشنرس، گلشن چوک، بانڈی پورہ۔9858826000

Published by

GNK PUBLICATIONS

Head Office : Main Raod, Nowhar, Near Chaaryaar Masjid,
Charari Sharief, Budgam - 191112 (J&K)
Ph. No: 7006738304, 9541123110
E-mail: gnkpublications@gmail.com
www.gnkpublications.com

انتساب

اپنے والدین

کے نام

علامہ اقبال کے

اس شعر کے ساتھ

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
علامہ اقبالؔ

فہرست

☆☆☆

اپنی بات

اللہ تبارک وتعالیٰ کا بے پناہ شکر و احسان ہے کہ اسی کے فضل و کرم سے خاکسار کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''بے سمت قافلے'' پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''گمشدہ دولت''، جو 2020ء میں منظر عام پر آیا تھا، کو میری توقع سے زیادہ پزیرائی ملی۔ جموں و کشمیر یوٹی اور ملک کے دیگر حصوں کے علاوہ برصغیر کے ادب نواز حلقوں اور ناقدین نے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کر کے میرے حوصلے بڑھائے۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ اس مجموعے کو عام قارئین نے بھی پسند فرمایا اور مجھے اپنی محبتوں سے نوازا۔ یہ بھی میری خوش بختی ہے کہ میرے پہلے افسانوی مجموعے ''گمشدہ دولت'' پر نامور ناقدین اور ریسرچ سکالروں نے تنقیدی مضامین، تجزیے اور تبصرے لکھے جو ہند پاک کے مختلف رسالوں اور اخبارات کی زینت بنے، جب کہ سوشل میڈیا پر مختلف ادبی فوروموں پر بھی شایع ہوئے۔ ان مضامین اور تبصروں میں بے شک میری اس کاوش کو سراہا گیا لیکن ساتھ ہی فنی لحاظ سے کچھ خامیوں کی بھی نشاندہی کی گئی جسے میں نے بالکل برا نہیں مانا بلکہ اپنی خامیوں کو قبول کر کے انہیں سدھارنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ سال 2021ء میں میرا مرتب کردہ افسانوی مجموعہ ''منتخب افسانے'' بھی منظر عام پر آ گیا جس میں جموں کشمیر اور لداخ کے علاوہ ملک بھر کے کہنہ مشق اور نو آموز افسانہ نگاروں کے افسانے شامل ہیں، اس مجموعے کو بھی ادبی حلقوں میں کافی پزیرائی ملی۔ بہر حال سال 2023ء کے دوران ہی میں نے زیر نظر مجموعے کی اشاعت پر کام شروع کیا، لیکن اور بھی ہیں غم زمانے میں کتاب کے سوا کے مصداق اور اپنی کاہلی کے سبب یہ کام نہایت ہی سست روی کا شکار رہا۔ ایک مرحلہ مکمل ہوتا تو دوسرے مرحلے پر اٹک جاتا۔ بہر حال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل و کرم اور دوستوں رفیقوں کی کرم نوازیوں سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا اور افسانوی مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں آ گیا۔ اس ضمن میں میں اپنے

ان سبھی احباب کا از حد ممنون ہوں جنہوں نے نہ صرف مجھے افسانوی مجموعی شایع کرنے کی ترغیب دی بلکہ قدم قدم پر مجھے اپنے انمول مشوروں سے بھی نوازتے رہے۔

معروف ادیبہ ونقاد ڈاکٹر فریدہ بیگم تبسم، جو گلبرگہ یونیورسٹی کلبرگی میں بحیثیت مدرس اپنے فرائیض انجام دے رہی ہیں، کا بے حد ممنوں ہوں، جنہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر افسانوی مجموعے کو حرف بہ حرف پڑھا اور تنقیدی جائیزہ بھی پیش کیا۔اپنے مخلص دوست ڈاکٹر ریاض توحیدی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے ہیں جنہوں نے ادبی سفر میں ہمیشہ میری رہنمائی کی ہے۔اس مجموعے کے حوالے سے بھی انہوں نے نہ صرف اپنے انمول مشوروں سے نوازا بلکہ حوصلہ بخش تبصرہ بھی تحریر فرمایا۔نوجوان ادیب ایس۔معشوق احمد کا شکریہ کرنا بھی فرض ہے جنہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر کتاب کی پروف ریڈنگ کی جب کہ اپنے دوست راجہ یوسف کی محبتوں کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اس مجموعے کی اشاعت کے حوالے سے قدم قدم پر انمول مشوروں سے نوازا۔

تحریر کو طول نہ دیتے ہوئے آخر پر میں یہی عرض کروں گا کہ میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں کوئی بڑا افسانہ نگار یا ادیب ہوں، نہ ہی میں اپنے آپ کو افسانہ نگاروں کی قطار میں کھڑا کرتا ہوں، بلکہ ایک طالب علم اور قلم و قرطاس کا ادنیٰ سا خدمت گار ہونے کے ناطے اپنے جذبات اور خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر کہانی کے قالب میں ڈال دیتا ہوں اور مجھے اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ مٹھی بھر افسانے تحریر کر کے میں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا ہے، لیکن اس بات سے مجھے بے انتہا خوشی ملتی ہے کہ عام قارئین اور ادب سے وابستہ مخلص لوگ میرے افسانوں پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کر کے مجھ ناچیز کو اپنے بے پناہ محبتوں سے نوازتے ہیں اور مجھے اپنا قلمی سفر آسانی سے جاری رکھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔

امید قوی ہے ہمیشہ کی طرح اس مجموعے پر بھی آپ اس کی کمیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے مجھ ناچیز کو اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازیں گے ......آپ کی محبت اور قیمتی مشورے میرے لئے انمول سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں!!! اللہ حافظ

26 ستمبر 2023ء

طارق شبنم

''بے سمت قافلے'' ....تنقیدی جائزہ

ادب کی ہر تخلیق اعلی اور ارفع اسی وقت ہوسکتی ہے جب اس کے مطالعہ کے بعد قاری کا دل و دماغ غور وخوض کرنے کی طرف راغب ہواور فنی کسوٹی یا پیمانے پر بھی یہ تخلیق مکمل طور پر کھری اترے۔ متاثر کن تخلیقی عمل، آفاق فکر کو وسعت معنی فراہم کرتا ہے۔ ساکت فکریات کو متحرک کرنے کا عمل تخلیقی تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ جہاں تک افسانہ کی بات ہے اس کے فنی وفکری جہات میں کہانی کے ساتھ ساتھ افسانویت ابھر کر سامنے نہ آئے تو یہ روداد یا پھر خبر یہ بیان بن کر رہ جاتا ہے۔ تخیل کو تخلیقی فن میں ڈھالنے کا سلیقہ ہونا لازمی ہے۔

جہاں تک طارق شبنم کے افسانوں کی بات ہے ،ان کے یہاں موضوعات اطراف واکناف سے اخذ کئے گئے ہیں۔ زیادہ تر موضوعات میں اصلاح معاشرہ اور امن و امان اور خوشحال زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس افسانوی مجموعہ ''بے سمت قافلے'' میں کل 44 افسانے ہیں۔ چند افسانے بہت عمدہ ہیں۔ ان کے اکثر افسانے معنویاتی سطح پر کرب انگیز فکر میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔ واقعات کا مشاہداتی اظہار چارہ گر کی تلاش جستجو میں ہے۔ ہر کہانی میں امن وامان کی فکر انگیزی نمایاں نظر آتی ہے۔ زندگی کا دامن تلخی غم سے بھرا ہوا ہے۔ گویا گلچیں نے خود گلشن اجاڑ دیا ہے۔ حالات حاضرہ کی کربنا کی کو افسانوی پیکر عطا کر لائق تخلیق بنانے کی سعی کی گئی ہے۔

معاشرہ بہت بگڑ چکا ہے، ہر جا وحشت و دہشت ناک فضا رشتوں کی پامالی اور

تہذیب کے تنزل نے تخلیق کار کے قلم کو اصلاح و تربیت، سبق و نصیحت کی طرف راغب کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ تخلیقات وجود میں آئی ہیں جو قلبی احساسات و جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔

تخیل کے دریچہ احساس میں شعلہ برق آہ ہی نظر آتا ہے جو ان کی کہانیوں کا خاصہ ہے۔

انسان کی تلاش اور منصب انسانیت کی بحالی طارق شبنم کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے۔ انسان کی اصلیت کیا ہے۔ اس دنیا میں کس لیے آیا ہے، اس کا مقصد کیا ہے۔ خدا کا خوف اور نیکی کیا ہے، بدی کیا ہے اس سے بچنے کا طریقہ کیا ہے اور انسان کے اندر ان مکارم اخلاق کی تلاش ہے جن سے انسان اور انسانیت کی بقا ہو اور یہ سب حاصل نہ ہونے کی صورت میں زوال انسانیت کا نوحہ بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانے انسانیت، محبت و اخوت خوشحال معاشرہ کے خواب بنتے ہیں۔ جو معاشرہ دور حاضر میں ناپائید ہے۔ ہر طرف بے سکونی، انتشار، بے اطمینانی، بے بسی، افسردگی و مایوسی، دہشت و وحشت کا غلبہ ہے۔ ایسے حالات میں اس انسان کی تلاش ہے جسے خود کا محاسبہ کرنا بھی ضروری ہے ورنہ معاشرہ انسان کو حیوان بنا دیتا ہے۔ برے اعمال سے انسان کو حیوان ثابت کر کے اسے حیوانی عمل کی طرف گامزن کرتا ہے ان کے افسانوں میں عمومیت کے برعکس انفرادیت کا پہلو یہ ہے کہ شر کی طرف راغب کرنے والے محرکات و وجوہات کیا ہیں؟ اور ان کا حل کیا ہونا چاہیے۔

اس مجموعہ کا پہلا افسانہ ”ٹھنڈا جہنم“ ”یخ بستہ ہواؤں میں جہاں دور دور تک کسی آدم زاد کا شائبہ تک نہیں ملتا تھا اس خوفناک جگہ پر دور دور تک زندگی کے آثار موجود نہیں تھے۔ نہ مٹی نہ پانی، نہ درخت نہ پرندے نہ چرندے، نہ درندیا ور نہ ہی کیڑے مکوڑے غرض یہاں کوئی بھی حشرات الارض موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ سورج کی روشنی کم ہی دیکھنے کو ملتی تھی“۔

اس کہانی میں آپسی رنجشیں علاقائی دشمنی نے گمراہ کر دیا تھا کہ ایک دوسرے کے علاقہ پر قبضہ کئے ہوئے لوگ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے تھے مگر......جب مضروب داڑھی والے آفیسر جسے سانس لینے میں سخت تکلیف ہو رہی تھی نے نحیف سے لہجے

میں اپنے جوانوں سے مخاطب ہو کر کہا ''یہ ہمارا علاقہ نہیں ہے''۔

تو آفیسر کی بات سن کر اس کے ماتحت جوان ہکا بکا ہو کر رہ گئے۔

''ساتھیو......! مرتے وقت کوئی جھوٹ نہیں بولتا، میں سچ کہتا ہوں یہ سب دھوکہ ہے فریب ہے یہ محض جھوٹی انا کی تسکین کا مسئلہ ہے ورنہ یہ ٹھنڈا جہنم کسی انسان کا علاقہ نہیں ہوسکتا۔ کبھی نہیں دس از نو......نو مینز لی......لینڈ......''۔

طارق شبنم کے افسانوں میں سب سے بڑی حقیقت اللہ سے غافل انسان ہیں جو مادی زندگی میں اس حد تک مصروف ہیں کہ وہ یہ نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ اپنے کیئے گئے کارناموں کی وجہ سے خود کو مصیبت میں ڈال رہے ہیں۔ انسان نے مادی آسائشوں کے چکر میں انسانیت کو کھو دیا ہے اور اصل انسان کہیں کھو گیا ہے اس کا چہرہ گم ہو گیا ہے۔

دور حاضر میں انسانی رشتوں کی اہمیت ختم ہوگئی ہے لہذا خیر ختم ہو گیا ہے۔ احساس ختم ہو گیا ہے۔ جس کی تلاش ان کے افسانے سپاری، وارث، عدالت، ائینہ، خواجہ صاحب، حیٔ علی الفلاح، عید، چاند اور بادل، لمحہ گریزاں، رخصتی، قربانی، پچھتاوا، سلگتے ارمان وغیرہ میں نظر آتی ہے۔

انسان کی وجہ تخلیق کائنات کی ہر شے اس کے لیے مسخر کی گئی ہے۔ اسے اللہ کے نعمتوں پر غور کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ کائنات کی ہر ذرے کو اللہ تعالی نے انسان کے لیے بنایا جو نعمتیں عطا کی ہیں ان نعمتوں کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔ انسان کی ترقی تو اس قدر ہو گئی ہے کہ اس سائنسی ترقی میں بہت اگے نکل گیا ہے۔ نئی نئی ٹیکنالوجی، ایجادات، ایٹمی ہتھیار وغیرہ ترقی کی راہ پر گامزن اپنی بربادی کو خود دعوت دے رہا ہے۔

''اڑن طشتری'' افسانہ میں ملاحظہ ہو......

''ملکہ......یہ ہتھیار ہماری ترقی کا حصہ ہیں مگر......''۔

''ملکہ کا اقبال بلند ہو...... دھرتی کے شاہی محل کو پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ملبوس بے شمار فاقہ مست دھرتی واسیوں نے گھیر لیا ہے''۔

''مگر کیوں''؟

''ملکہ عالی جان......وہ انصاف مانگتے ہیں''۔

''انہیں کیا پریشانی ہے؟

''اس ترقی یافتہ دھرتی پر کروڑوں لوگ بے انصافی کی تپش میں نڈھال غربت، افلاس اور بھک مری کے شکار ہیں بھوک کی اس منڈی میں روزانہ بہت سے معصوم بچے اور بزرگ انسان بلک بلک کر موت کا نوالا بن جاتے ہیں، جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

ایک اور افسانہ ''ڈینجر زون'' کا یہ اقتباس دیکھئے......

''اہل زمین کے ترقی کے سارے دعوے کھوکھلے ہیں قدرت کا شاہکار سیارہ زمین ابن ادم کے خون سے ہی لالہ زار ہورہا ہے''۔

افسانہ کھنڈر میں بم باری میں سب کی موت ہوجاتی ہے، ڈاکٹر جب اس علاقہ میں علاج کے لئے جاتا ہے تو......

''ڈاکٹر صاحب......ورنہ یہاں زندہ ہی کون ہے، یہاں سب مر چکے ہیں میں بھی مر چکا ہوں امن اور ترقی کے نام پر ان پتھر دل درندوں نے یہاں سب کو مار ڈالا ہے ہا... ہا... ہا...''۔

''جنگلی آدم'' افسانہ میں جانور انسانوں سے دور رہنا چاہتے ہیں، جبکہ جانوروں میں احساس اور لحاظ ہے یہ اقتباس دیکھئے :

ایک جانور اپنے بچے کو نصیحت کرتا ہے......

''نہیں بچہ۔۔۔تم نے ٹھیک کیا ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے، ویسے بھی یہ لوگ بغض وعناد اور اپنی خود غرضیوں کی بنا پر خود ہی ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں''۔

ایک اور افسانہ ''بے سمت قافلے......''

''آخر یہ لوگ ہیں کون؟ یہاں کے تمام مذاہب سے وابستہ لوگ تو ہماری مدد گار رہیں''۔

''وہی جنہوں نے ہمارے گھروں کو تخت و تاراج کیا انسانیت کے دشمن ان بیمار ذہنیت والے خونی جنونیوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے''۔

افسانہ ''شہ رگ'' میں وسیم اپنے بھائی مخاطب ہے کہ......

''بھیا......اپنی شہ رگ کاٹ کر ترقی کے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کا بھیانک انجام ہے یہ''۔

اس سرزمین پر ''محبت'' انمول تحفہ ہے، اس کی حفاظت کی ذمہ داری انسانوں پر ہے مگر اس سرزمین پر محبت ہی کمیاب ہے دو محبت کرنے والے دل جنہیں حالات کی ستم ظریفی نے اپنے بے رحم پنجوں میں کس لیا۔ اس افسانہ میں کشمیر کے حالات کی عکاسی نظر آتی ہے۔

بندوق اور توپوں، گولا باری اور فائرنگ کے واقعات رونما ہوئے تو......

یہ دیکھیے......

''مائی۔۔۔سلمان کہاں ہے؟ وہ تو ٹھیک تو ہے نا؟

''تو ٹھیک ہے نا گل پتر......؟'' ماں نے اپنے چہرے سے آنسو صاف کر کے اس کی بات ٹالتے ہوئے کہا کیونکہ وہ اس کو یہ بتانا نہیں بتانا چاہتی تھی کہ سرسوں کے پھولوں کو گواہ بنا کر سلمان اس کو بچاتے ہوئے خود گولہ باری کی زد میں آ کر بری طرح سے زخمی ہو کر موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

جہاں محبت سچی ہو قربانی دی جاتی ہے ''محبت کے رنگ'' بھی ایسا ہی افسانہ ہے کہ خانہ بدوش لڑکی کی محبت میں گرفتار شہزاد نے گلابو کی محبت کسی اور سے ہے، معلوم ہوتے ہی وہ واپس لوٹ آیا گلابو نے بھی عیش کی زندگی کو نظر انداز کر کے اپاہج مائی اور بابا کا ساتھ دیا۔ ملاحظہ ہو.... ''بابا مجھے شادی کی پرواہ نہیں ہے لیکن میں اپنے عیش وآرام کے لیے شیرو کی اپاہج مائی اور بوڑھے بابا کو چھوڑ کر شہر نہیں جاسکتی''۔

قربانی کی ایک اور مثال، افسانہ ''ممتاز'' میں واضح طور پر عیاں ہوتا ہے کہ اپنے

شوہر کے لیے خون بیچ کر گھر کا کرایہ ادا کیا اور اپنی عزت بھی بچالی۔ یہاں یہ پیغام ملتا ہے کہ حالات انسان کو مجبور کرتے ہیں، لیکن عزت بہت اہم چیز ہے جسے بچا کر حالات کو سنبھالنا کمال ہوتا ہے۔

ان کے موضوعات میں اگر چہ تنوع کم ہے مگر اخلاقی درس اور آ گاہی کا پہلو نمایاں ہے۔اصلاح معاشرہ کی ترغیب دی گئی ہے۔

افسانہ ''کالی ناگن'' میں ایک جدید موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ہسپتال کی لاپرواہی پر گہرا طنز ہے اور آج کل بچوں کی چوری کے قصے آئے دن اخبارات میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔

> ''وہ خود کو ایک سوشل ورکر جتلاتی ہے۔زچگی کے ہسپتالوں میں جا کر مختلف بہانوں سے بھولی بھالی حاملہ خواتین سے دوستی اور ہمدردی کر کے اپنی چرب زبانی کی چکناہٹ سے ان کے دل جیت لیتی اور آخر پر اسی ہمدردی کہ پردے میں اپنے گینگ کے ذریعے ان کے نوزائدہ بچے چرا کر ان کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیتی ہے''۔

افسانہ ''ٹھنڈی چھاوں'' میں بچے کی نفسیاتی دباؤ اور ایک ٹیچر کے پیار و محبت کے نے بچے کو پھر سے پڑھنے کی طرف راغب کیا اس افسانے میں دو اہم نکات کی طرف توجہ مرکوز کروائی گئی ہے کہ ایک تو ہم بچے کی طرف پورے طور پر دھیان نہیں دیتے۔ ممتا کی محبت وشفقت سے دور رکھتے ہیں۔ دوسرا ماں کا اہم رول ہوتا ہے، جس کے سائے سے محروم بچے نفسیات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کسی تیسرے کی محبت سے بہت جلد اثر انداز ہوتے ہیں۔

ان کے بعض افسانوں میں عمدہ فضا بندی نظر آتی ہے۔

افسانہ ''لاڈلا'' میں یہ منظر......

> ''وقت کے سناٹے لمحہ بہ لمحہ گہرے ہوتے جارہے تھے موسم انتہائی خوشگوار تھا۔سسکیاں بھرتے ہوئے ہوا کے لطیف جھونکے نیلے آسمان پر تاروں کے جگمگاتے ہوئے ہیرے جواہرات اور چاند کی نرم وسبک روشنی

ماحول کو اور زیادہ دل کش بنا رہے تھے۔ شہر کے مکیں سکون سے نیند کی میٹھی بانہوں میں جھول رہے تھے''۔

ان کے بعض افسانوں میں منظر نگاری بھی مسحر کن ہے افسانہ ''سلگتے ارمان'' سے....

''صبح کی فضا سورج کی کنواری کرنوں میں نہا رہی تھی، خوش لہن پرندوں کی سریلی آوازیں ماحول میں ترنم پیدا کر رہی تھیں''۔

فنی اور تیکنیکی اعتبار سے دیکھا جائے تو مزید بہتری کی گنجائش نمایاں ہے۔ اس کے باوجود ان کا اسلوب کہانی نما ہے جو ادب اطفال کی یاد تازہ کراتا ہے۔ جہاں بچوں کو ادب کے ذریعے معاشرہ کی برائیاں اور شر کے خاتمے پر زور دیا گیا ہو۔

ان کے تخلیقی شعور میں معاصر حالات اور زندگی کے تجربے اور مشاہدے کا بیانیہ ہے۔ یہ کہانیاں اپنے اطراف و اکناف کی روداد حسرت انگیز انداز سے پیش کرتی ہیں۔ معاشرہ کے تلاطم خیز دریا میں غوطہ زن نظر آتے ہیں۔ حالات ستم گر سے آشنائے رموز حاضر کو تخلیقی فضا میں سبک روی سے موج کنار کرتے ہیں۔ ان افسانوں کے درون...... جیسے

''میٹھا زہر''......نقلی ادویات، کیمیکل سے بھرے میوے اور پھل جو میٹھا زہر بن گئے ہیں۔

''قربانی''......زمین جائیداد کے چکر میں رشتوں کی پامالی ہے۔

''بے اعتنائی''......نابالغ بچے جو ڈرگ نشے کے عادی ہیں کے لئے نصیحت ہے۔

''شکور بھنگی''......شکور کی چھپ کر مدد کرنے سے اس کی نیت جو بیوہ اور دو بچیوں کی کفالت کی ذمہ داری لینے پر حج کی سعادت نصیب ہوئی۔

''زخمی دُلہن''......ڈل جھیل کی آپ بیتی کو بیان کرتی ہے جو ناقدروں کے ہاتھوں تباہ ہو رہی ہے۔

''آتما''......جہلم کے کنارے اس سے گفتگو کرتے ہوئے کشمیر کی تاریخی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

آخری افسانہ ''بکھری کہانیاں'' میں تخلیق کار اپنے اطراف و اکناف کے ماحول

کو نظر انداز کر کے مختلف موضوعات کو زیر بحث بنائے ہوئے ہیں۔

یہ اقتباس دیکھئے......

''ہا۔ہا۔ ذہنی عیاشی ،تفریح اور واہ واہ بٹورنے کے لیے جھوٹ موٹ کے گل و بلبل کے قصے، کہانیاں گھڑنے کی عادی ہو تم اپنے ارد گرد درد کی شدت میں کراہ رہے مجھ جیسے مجبور بے بس و لاچار انسانوں کی غمناک کہانیاں تمہاری نظروں سے اوجھل ہیں یا تم انہیں درخور اعتنا بھی نہیں سمجھتے ہو؟

ان کے کرداروں کی بات کی جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں سکون کے سایے سے محروم ہیں۔ سکون کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

انسانیت کا درس دیتی یہ کہانیاں اپنے تخلیقی ہنر سے روح حزن اور غم زیست کا المیہ بیان کر رہی ہیں۔

ان کا اسلوب سادہ سلیس اور کہیں کہیں پر داستانوی ہے۔ کچھ افسانوں داخلی معنویت سے زیادہ سطحیت اور کہانی کے وسط میں ہی افسانہ کا انجام عیاں ہو جاتا ہے۔ جس سے افسانویت بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ یعنی کہانی میں تجسس اور گہرائی کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اگر تجسس و گہرائی کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا تو مزید جان آجاتی۔ انجام کو صیغہ راز میں رکھ کر آخر تک قاری کی جستجو برقرار رہتی......قوی امید ہے کہ آگے آنے والے افسانوں میں یہ تمام باتیں بدرجہ اتم موجود ہوں گی۔

دراصل تخلیق کار کا ذہن دور حاضر کے حالات میں امن اور سکون کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ہر طرف بحالی فرحت بخش نظارے امن و امان کی صورتحال کے متمنی ہیں۔

یہ مجموعہ سادہ و سلیس اسلوب میں قاری کی دلچسپی میں ضرور اضافہ کرے گا اس افسانوی مجموعہ کے لئے ہم طارق شبنم صاحب کو بہت مبارکباد پیش کرتے ہیں خلوص کے ساتھ۔

ڈاکٹر فریدہ تبسم

گلبرگہ (کرناٹک انڈیا)

☆☆

طارق شبنم کی افسانوی تخلیقات

اردو افسانے کے لئے جس قدر جموں وکشمیر میں ماحول سازگار ہے، اس قدر اردو ناول کے تیئں ماحول اور وہ فضا نظر نہیں آتی۔ اسباب جاننے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ فطرت کا خاصہ ہے کہ ہمارے اکثر نوجوان اپنے بزرگوں کو جس راستے پر قدم جماتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اُسی راستے اور نقش قدم وہ بھی چلنا پسند کرتے ہیں۔ بہرکیف مجموعی طور پر دیکھیں تو اس سے جموں وکشمیر میں افسانوی ادب کی پرواز پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ بلکہ افسانوی ادب یہاں دن بہ دن پھل پھول رہا ہے۔

جموں وکشمیر میں اردو افسانہ نگاری کے میدان میں طبع آزمائی کرنے والوں کا جمِ غفیر ہے۔ پریم ناتھ پردیسی سے لے کر حامدی کاشمیری تک اور نور شاہ سے طارق شبنم تک افسانہ نگاروں کی ایک لمبی قطار ہے جس میں نوجوان افسانہ نگاروں کی آمد سے توازن آتا جارہا ہے۔ تاہم نوجوان نسل کی افسانوی تخلیقات کا کتابی صورت میں منظر عام پر نہ آنا لمحہ فکریہ ہے۔ لیکن یہاں پر ایک اہم بات کا اظہار کرنا ہی پڑتا ہے کہ طارق شبنم جیسے افسانہ نگار آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں جو نہ صرف لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنی تحریروں کو آئندہ نسل کے لیے ورثے کے طور پر محفوظ رکھنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔

راقم الحروف کی طارق شبنم کے ساتھ شناسائی کو تقریباً ایک دہائی گزری ہے۔ اس لیے اس قلیل عرصے میں جن تخلیق کاروں کو قومی سطح پر سرگرم عمل دیکھا ہے، ان میں ایک نام طارق شبنم کا بھی ہے۔ جنھوں نے اپنی تخلیقات کی اشاعت کے لیے اردو روزناموں اور

موقر اردو رسالوں کو ذریعہ بنایا ہوا ہے۔اس پر اکتفا نہیں ہوا تو موجودہ زمانے میں ہلچل پیدا کرنے والا فیس بک بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا۔ جہاں موصوف نے ولر ادبی فورم کے ذریعے کووڈ کے دور میں مقامی اور قومی سطح پر افسانہ نگاروں کا ایک افسانوی یونٹ قائم کر کے انھیں متحرک اور فعال رکھا، بلکہ مبصرین کے لیے بھی غذا کا سامان مہیا کیا۔فیس بک پر منعقدہ دو برسوں تک مسلسل منعقد ہونے والے اس افسانوی یونٹ میں شائع ہوئے افسانوں کی دو کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔طارق شبنم صرف افسانے ہی نہیں لکھتے، بلکہ افسانوں پر بات کرنے کی مہارت بھی رکھتے ہیں اور یہ ہنر بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

طارق شبنم کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''گمشدہ دولت'' 2020ء میں شائع ہوا۔ جس میں ان کے اٹھائیس افسانے شائع ہوئے ہیں۔اس کتاب کا پیش لفظ نور شاہ نے لکھا ہے اور اس کے علاوہ ''طارق شبنم ایک ہونہار افسانہ نگار'' کے بعنوان اشرف آثاری کا مضمون بھی اس میں شامل ہے۔طارق شبنم کی افسانہ نگاری پر کئی نوجوان اسکالروں نے تجزیاتی اور تنقیدی مضامین لکھے ہیں جس سے ان کی افسانوی جہت نمایاں ہوتی ہے۔طارق شبنم کے پہلے افسانوی مجموعے میں ''بے درد زمانہ''، ''اندھیرے اجالے''، ''صدمہ''، ''آبرو''، ''فریبی اُجالا''، ''کہانی کا المیہ''، ''دہشت کے سائے''، ''اعتبار''، ''انتظار''، ''پشیمانی''، ''شکست''، ''اونچی اُڑان''، ''مہربان کیسے کیسے''، ''دھوپ چھاؤں''، ''آخری جام''، 'نسخہ کیمیا' وغیرہ افسانے شامل ہیں۔ان کے افسانوی موضوعات کے بارے میں کشمیر کے ایک بزرگ افسانہ نگار نور شاہ یوں رقمطراز ہیں:

> ''طارق شبنم کے اکثر افسانوں کے موضوعات سماج کے درماندہ اور پسماندہ لوگوں کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ان میں محبت کی چاشنی بھی ملتی ہے اور انسانی نفرتوں کی عکاسی بھی نظر آتی ہے۔طارق شبنم کے اکثر افسانوں کے کردار کشمیر کی کھردری زمینی سطح سے ابھرتے ہیں۔کبھی کبھی ان کے افسانے پڑھ کر لگتا ہے جیسے وہ اپنے گھر کی کھڑکی سے باہر کی دنیا میں جھانک رہے ہوں، باہر بکھری ہوئی کہانیوں کو اپنی نظروں میں

سمیٹنے کی کوشش کر رہے ہوں، حالات و واقعات کا جائزہ لے رہے ہوں، پھر وہ کھڑکی بند کر کے قلم اور کاغذ لے کر اپنے موضوعات میں رنگ بھرنے لگ جاتے ہیں''۔ (گمشدہ دولت، ص 7)

نور شاہ کی مذکورہ رائے بڑی اہمیت کی حامل ہے جس سے افسانہ نگار کے افسانوی موضوعات اور دائرہ کار کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''بے درد زمانہ'' میں طارق شبنم نے ایک بے بس، سیدھی سادی، غریب خاندان کی مچھیرن (سندری) کی زبانی اپنے آس پاس موجود خود غرض، فریبی اور بے ضمیر لوگوں کی تصویر کشی کی ہے۔ ''اندھیرے اجالے'' ایک علامتی کہانی ہے جس کے پس پردہ کشمیر اور کشمیریوں کی کربناکی کی داستان پوشیدہ ہے۔ ''صدمہ'' بھی اسی نوعیت کا افسانہ ہے۔ ''کہانی کا المیہ'' دراصل دنیا میں آدم زاد کی بدخواہی، ریاکاری اور مکروفریبی کا المیہ ہے۔ ''دہشت کے سائے'' میں دہشت ناکی اور خوف وہشت کے سائے میں جی رہے عام و بے بس کشمیریوں کا المناک پہلو دکھایا گیا ہے۔ ''انتظار'' میں امیری اور غریبی یعنی زندگی کے دو اہم پہلوؤں کو ابھارا گیا ہے۔ ''گمشدہ دولت'' میں افسانہ نگار نے اُن حقیقتوں کو آشکار کرنے کی کوشش کی ہے جن سے دنیا اب بے بہرہ نظر آتی ہے، بڑی بڑی چاہتوں اور ارمانوں کی تکمیل میں انسان چھوٹی اور زندگی کی بنیادی خوشیوں سے محروم ہو گیا ہے، اس افسانے سے بہت سی گتھیاں سلجھتی ہیں۔ ''نسخہ کیمیا'' میں مصنف نے کورونا کے دنوں میں لاک ڈاؤن کے اثرات کو علامتی انداز میں بڑے خوبصورت اسلوب میں تحریر کیا ہے۔ اس افسانے کے تناظر میں ملکی باگ ڈور حاصل ہونے اور اپنے مفادات کے لیے کھوکھلے وعدے کرنے والوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

طارق شبنم کے افسانوں کا بنیادی موضوع کشمیر اور کشمیریوں کے زندگی کے مسائل و مصائب ہیں۔ انھوں نے اپنے آس پڑوس کے ماحول اور سیاسی و سماجی تناظر میں انسانی زندگی کے نبض کو ٹٹولنے کی کامیاب سعی بلیغ کی ہے۔ ایک کہانی کار جس ماحول اور جن حالات میں سانس لیتا ہے اگر وہ اُس ماحول اور اُن حالات کی ترجمانی کرنے سے قاصر رہے تو وہ کوئی آفاقی نظریہ پیش کرنے سے بھی محروم ہو سکتا ہے۔ طارق شبنم کے

افسانے ایک قاری کو زندگی کی ہو بہو تصویر دکھاتے ہیں۔ جس طرح ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اسی طرح افسانہ نگار نے زندگی کے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔

طارق شبنم اردو افسانے کا ایک اہم نام ہے جنھوں نے گذشتہ برسوں میں ادبی حلقوں میں منفرد شناخت قائم کی ہے۔ مستقل افسانہ لکھنے والوں میں ان کا نام احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''بے سمت قافلے'' تینتالیس افسانوں پر مشتمل ہے۔ جس کے چند اہم افسانوں میں ''اُڑن طشتری''، ''ڈینجر زون''، ''پچھتاوا''، ''میٹھا زہر''، ''بے سمت قافلے''، ''بے اعتنائی''، ''لمحہ گریزاں''، ''سوشل ڈسٹنس''، ''بکھری کہانیاں'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان افسانوں کی تعداد سے طارق شبنم کی افسانہ لکھنے کی رفتار واضح ہو جاتی ہے۔ ''ٹھنڈا جہنم'' جو مجموعہ ''بے سمت قافلے'' کا پہلا افسانہ ہے، میں سرحد پر تعینات فوجیوں کی زندگی اور ان کے حالات کو موضوع بنایا گیا ہے، نیز دوران ڈیوٹی انھیں کس قدر مصیبتوں، تکلیفوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ بے چاروں کو بے سبب زندگیوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ ''اڑن طشتری'' میں انسان کے فرسودہ اور روئے زمین پر انسان اور انسانی املاک کو تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچانے والے ذخیروں کا تذکرہ عمدہ طریقے سے کیا گیا ہے۔ ''ڈینجر زون'' افسانہ میں زمین پر آدم زاد کی نامرادیوں، سرزد خطاؤں اور غفلت شعاری کا ذکر ملتا ہے۔ ''بے سمت قافلے'' بھی ایک عمدہ افسانہ ہے جس میں ہنستی کھلتی بستی اور انسانوں جن میں عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے اور جوان سب پر یکسر آسمان ٹوٹ پڑتا ہے، چند درندہ صفت انسان جن کا نہ کوئی دین وایمان ہوتا ہے اور نہ انسانیت نام کی کوئی چیز، بلکہ وہ ہنستی کھلتی زندگیوں کی لاشوں کو اپنے مفاد کی سیڑھی بنا لیتے ہیں۔ افسانہ نگار نے اس کا افسانے میں سخت نوٹس لیا ہے۔

مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو طارق شبنم نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کی قدر و قیمت کا احساس دلانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ وہ اپنے اکثر افسانوں میں انسانی جانوں کے زیاں پر افسوس کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ طارق شبنم نے انسانی کھال میں چھپے سیاسی بھیڑیوں پر سخت طنز کے وار کیے ہیں۔ جو بظاہر دکھنے میں آدم کی اولاد لگتے

ہیں لیکن کرتوت ان کے اتنے بھیانک اور خوف ناک ہوتے ہیں کہ جس سے اولادِ آدم بھی شرمندہ ہوں۔

طارق شبنم کے بیشتر افسانوں نے کشمیر کی سرزمین پر جنم لیا ہے، بعض کا موضوع افراد و کردار کا انفرادی کرب ہے جو زمینی لوگوں کے رویوں سے وجود میں آیا ہے۔ بعض کا موضوع آفاقی ہے جس نے دنیا کی پوری دھرتی کو بیک وقت نہ صرف متاثر کیا بلکہ حیران و ششش و پنج میں مبتلا کر دیا۔ ''سوشل ڈسٹنس'' اور ''نسخہ کیمیا'' اسی نوعیت کی کہانیاں ہیں۔

افسانہ کے لئے موضوع کا اختراع کیسا کرنا ہے، اسے کہانی کا روپ کیسا دینا ہے اور پھر اس میں فنی اور تکنیکی اعتبار سے ہنرمندی کے ساتھ کیسے جان بخشنی ہے، انھیں اس کا بہ خوبی علم ہے۔ گویا ان کے افسانے یہ احساس دلاتے ہیں کہ افسانہ نگار کو اپنے سماج اور معاشرے کی ہر ہلچل پر گہری نظر ہے۔

طارق شبنم کا زیرِ نظر افسانوی مجموعہ ''بے سمت قافلے'' ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے جو نہ صرف جموں و کشمیر میں اردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھانے کی ایک کڑی ثابت ہوگا بلکہ اس سے اردو افسانہ کی دنیا میں زرخیزی اور استحکام کا پیغام بھی ملے گا۔

ڈاکٹر غلام نبی کمار

☆☆

ٹھنڈا جہنم

وشال کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک سنسان جگہ پر برف میں دھنسا ہوا پایا۔ شدید ٹھنڈ سے اس کے ہاتھ پیر شل ہو چکے تھے، جسم کا انگ انگ ایسے درد کی شدت میں ڈوبا تھا جیسے اس کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اس نے غیر شعوری طور جسم کو حرکت دی۔

''ہائے میرا گن......''۔

جسم پر بندھے پاوچ کی طرف دھیان جاتے ہی اس کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔ پریشان ہو کر جھنجھلاہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سخت نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے اٹھ نہ سکا...... کچھ لمحوں کے بعد اس کے اوسان بحال ہونے لگے، برف باری اگر چہ اب تھم چکی تھی اور سورج کی روشنی میں بھی قدرے اضافہ ہو چکا تھا لیکن سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ چاروں اور ہیبت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی، دور دور تک کسی آدم زاد کا شائبہ تک نہیں ملتا تھا۔ ارد گرد کا جائیزہ لینے کے بعد اپنے آپ کو موت کے منہ میں دیکھ کر عالم یاس و اضطراب میں نیم مردہ جسم کو حرارت پہنچانے کے لئے اس نے پاوچ میں بندھی ڈبہ بند خشک غذا کے دانے نکالے اور انہیں چباتے ہوئے گزرے ہوئے واقعات کو یاد کرنے لگا۔

آج صبح سے ہی چل رہی یخ بستہ زمستانی ہواؤں کی خنکی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ آسمان پر گھرے کالے بادل چھائے ہوئے تھے، روشنی اتنی کم تھی کی دن کے گیارہ بجے بھی شام کا گمان ہوتا تھا۔ عجیب وحشت بھری پھنکار ہر سو گونج رہی تھی۔ ماحول کی اس ایکا ایکی

تبدیلی نے وشال پر عجیب سی کیفیت طاری کردی تھی اور وہ سوچوں میں گم سہما سہا برف سے بنے بنکر میں روشن دان سے آسمان کی اس خوفناکی کو تک رہا تھا کہ آفیسر کی بارعوب آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''وشال''۔

''یس سر''۔

''انی پرابلم''۔

''نو سر''۔

''گڈ......ہوشیاری سے ڈیوٹی کرو تاکہ ہمارے علاقے میں کوئی پرندہ بھی پر نہ مار سکے''۔

''یس سر''۔

وشال نے سلوٹ بجاتے ہوئے کہا۔آفیسر دوسری چوکیوں میں بھی سرسری نظر مار کر جلد ہی واپس اپنی بارک میں جا چھپا تو وشال مُنہ میں مونگ پھلی کے دانے ڈالتے ہوئے بنکر میں موجود اپنے ساتھی جو انگیٹھی میں تیل ڈال ڈال کر بنکر کو گرم رکھنے کی کوشش میں تھا سے مخاطب ہوا۔

''راج......یہ صاحب آج کیسی بات کرتا ہے، یہاں سالا پرندہ کہاں سے آئے گا؟......تو نے یہاں کبھی کسی پرندے کو دیکھا ہے؟''

''شاہب نے خواب میں کسی کبوتری کو دیکھا ہوگا...... ہاہاہا......چل شالا ایک شگریٹ دیدے۔''

راج مذاق کے انداز میں کہتے ہوئے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔

اس نے راج کی طرف سگریٹ بڑھایا اور خود بھی سگریٹ سلگا کر روشن دان سے باہر جھانکتے ہوئے گہرے سوچوں میں ڈوب گیا۔سطح سمندر سے ہزاروں فٹ بلندی پر واقع اس خوفناک جگہ پر دور دور تک زندگی کے آثار موجود نہیں تھے۔نہ مٹی، نہ پانی، نہ درخت، نہ پرندے، نہ چرندے، نہ درندے اور نہ کیڑے نہ مکوڑے۔غرض یہاں کوئی بھی

حشرات الارض موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کی سورج کی روشنی بھی کم ہی دیکھنے کوملتی تھی۔ ٹھنڈ اتنی شدید کہ گرم پانی کا گلاس منہ تک لیتے لیتے جم جاتا تھا اور ہوا اتنی کم کہ ایک صحت مند انسان کو بھی اکثر سانس لینے میں دشواری ہوتی تھی، جبکہ زندہ رہنے کے لئے آکسیجن کے سلنڈر استعمال کرنے پڑتے تھے۔ سرتاپاؤں مخصوص قسم کے گرم ملبوسات کے استعمال کے باوجود ٹھنڈ کی سوئیاں جسم میں چبھ جاتی تھیں اور جسم اور سانس کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے ہر پل انگیٹھی کے ساتھ چپک کے رہنا پڑتا تھا۔ کھانے پینے اور اور دیگر ضروریات کے لئے جمے ہوئے برف کو چولہا جلا کر پگھلانا پڑتا تھا جبکہ پاخانہ جانے کے بعد شریر کو پانی سے نہیں بلکہ مٹی کے تیل یا ڈیزل وغیرہ سے صاف کیا جاتا تھا کیونکہ جسم پر لگی ناپاکی پل بھر میں جم جاتی تھی۔ اس طرح ایک محافظ پر ہر روز لاکھوں روپیے کا خرچہ آتا تھا۔ وشال، جو ایک ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان تھا، کے ذہن میں اکثر یہ سوال گونجتا رہتا تھا کہ ترقی اور آپسی مفاہمت کے اس دور میں آخر اس خطرناک بے رحم جگہ، جہاں ہر پل وحشت اور ویرانی باہوں میں باہیں ڈالے اونگھ رہی ہوں، انساں کے سر پر موت کے بھیانک سائے رقصاں ہوں، کروڑوں روپے کے زیاں کے ساتھ سینکڑوں محافظوں کو کس لئے رکھا گیا ہے؟ جب کہ دیش واسیوں کو اچھی طبی، تعلیمی اور دیگر ضروری سہولیات ابھی بھی میسر نہیں ہیں اور لاکھوں لوگ روٹی کپڑا اور سروں کے اوپر چھتوں کے لئے ترس رہے ہیں...... سرحد پر ان کے مدمقابل دوسرے دیش، جس کی مالی حالت اس ملک سے بھی دگرگوں ہے اور عوام غربت، بھوک اور افلاس کی چکی میں پس رہے ہیں، کے محافظ بھی اسی طرح رقوم کے زیاں کے ساتھ گھٹ گھٹ کے ایک ایک پل کے کاٹ رہے تھے۔ بظاہر وہ اپنے اپنے دیش کی محافظت پر وہاں موجود تھے لیکن وشال کو وہاں کبھی دیش کے لئے کوئی خطرہ نظر نہیں آیا تھا، نہ ہی دونوں اطراف کے محافظوں کے درمیاں کبھی کوئی لڑائی جھگڑا ہوا تھا اور نہ ہی بظاہر کوئی دشمنی نظر آرہی تھی۔ اور تو اور موقعہ ملنے پر دونوں اطراف کے محافظ آپس میں ہائے ہیلو بھی کرتے تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے یہ سوال بھی پوچھ لیتے تھے کہ آخر جان جھوکھم میں ڈال کر موت کی اس خوفناک وادی میں ہم کس مقصد کے لئے بیٹھے ہیں

؟؟؟لیکن اس چُبھتے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

وشال سوچ فکر کے اتھاہ سمندر میں گم دوربین کے سہارے سرحد کی نگرانی میں مصروف تھا کہ آسمان سے اچانک برف کے بڑے بڑے گالے گرنا شروع ہو گئے۔ یہاں برف گرنا اگرچہ کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن آج موسم کے تیور کچھ ایسے خوفناک تھے کہ برف باری شروع ہوتے ہی یہاں تعینات جوانوں اور افسروں میں فکر و تشویش پیدا ہو گئی..... دیکھتے ہی دیکھتے برف کی شدت میں اضافے کے ساتھ ساتھ تیز ہوائیں چلنے لگیں اور برف ریگستان کی آندھی کی طرح خوفناک انداز میں رقص کرنے لگا۔ موسم کا یہ قہر انگیز روپ دیکھ کر خطرے کو بھانپتے ہوئے آفیسروں نے اپنی ہائی کمان کو مطلع کیا اور ریڈ الرٹ کا اعلان کرتے ہوئے کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنے کی ہدایات دیں۔ تمام جوانوں میں ایسی خلبلی مچ گئی جیسے جنگ کا بگل بج گیا ہو۔ دفعتاً تیز ہواؤں کی رفتار میں اور اضافہ ہوا جس کے ساتھ ہی بنکر اور چوکیاں تہس نہس ہونے لگیں، اس صورتحال سے افسروں اور جوانوں میں خوف و ہیبت کی تھرتھری، کپکپی اور بدحواسی چھا گئی اور وہ بے بسی کی حالت میں جان کی امان پانے کے لئے اوپر والے کو یاد کرتے ہوئے ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ تیز ہواؤں نے جلد ہی طوفانی رخ اختیار کر لیا جبکہ دوسری طرف تعینات محافظوں کی چوکیوں میں شور غل بلند ہو گیا اور ان کا ساز و سامان تنکوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگا۔ دوسری طرف کا یہ برا حال دیکھ کر اور نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی صورت حال سے پریشان سارے جوان اور آفیسر ایک جگہ جمع ہو کر صلح مشورہ کرنے لگے لیکن انہیں اتنی مہلت نہیں ملی......یک بار برف کا ایک بہت بڑا تودا طوفانی رفتار سے آیا اور سرحدوں کی تمیز کئے بغیر دونوں طرف کی چوکیوں اور بارکوں کو ملیا میٹ کر کے لے گیا۔

وشال مونگ پھلی کے دانے چباتے ہوئے بہت دیر تک گزرے ہوئے کربناک واقعات کو یاد کرتا رہا......جب جسم میں تھوڑی توانائی پیدا ہوئی تو اٹھ کر دھیرے دھیرے چند قدم ادھر اُدھر چل کر چاروں اور نظریں دوڑائیں۔ کچھ دوری پر اس کو برف پر بیٹھے کچھ انسانی ہیولے نظر آئے۔ وہ بھاری قدموں سے برف کو چیرتے ہوئے ان کے نزدیک پہنچا

تو دیکھا کہ اس کے کچھ ساتھی برف میں پھنسے کراہ رہے تھے۔اس نے ہمت سے کام لے کر ایک ایک کر کے ان کو نکالا۔ایک دوسرے کو دیکھ کر ان کی جیسے جان میں جان آ گئی۔وہ مونگ پھلی کے دانے چباتے اور بیڑی پیتے ہوئے دم سنبھالنے لگے۔مخصوص قسم کے گرم ملبوسات زیب تن ہونے کی وجہ سے برف کا پانی ان کے جسموں کو چھو نہیں سکا تھا ورنہ وہ بھی برف کی طرح جم گئے ہوتے۔کچھ دیر دم سنبھالنے اور صلاح مشورہ کرنے کے بعد وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو تلاشنے نکلے۔ان کی یہ کوشش رنگ لائی ایک ایک کر کے ان کے درجن بھر ساتھی مل گئے جن میں سے کچھ زخمی اور کچھ بے ہوشی کی حالت میں تھے۔

''وہ دیکھو دشمن کے جوان ہمارے علاقے میں گھس آئے ہیں ......وہ میجر صاحب کو اٹھا کر لے جا رہے ہیں''۔

ساتھیوں کو تلاش کرتے کرتے وشال کی نظر اپنے آفیسر پر پڑی جسے دشمن کے جوان بازوؤں سے پکڑ کر لے جا رہے تھے۔

''چلو جلدی......ہم ان کے گندے ارادوں کو ہرگز کامیاب نہیں ہونے دینگے''۔

وشال کو جلد ہی اپنا فرض یاد آ گیا......انسان جب کسی منجھدھار پر ہو تو دونوں کناروں پر نظر رکھنی پڑتی ہے، سو وشال نے بھی فوراً حکمت عملی طئے کر کے کچھ جوانوں کو زخمی اور بے ہوش ساتھیوں کی محافظت پر رکھا اور خود چند جوانوں کے ہمراہ بالکل نہتے ہی آفیسر کو دشمن کے چنگل سے بچانے کی مہم پر نکل گیا......کچھ دور جا کر انہوں نے دیکھا کہ دشمن نے ایک بڑا خیمہ نصب کیا ہے اور ان کے درجنوں جوان جن میں سے کچھ مسلح بھی تھے پریشانی کی حالت میں اِدھر اُدھر دوڑ بھاگ کر رہے ہیں۔دشمن کی اس حرکت سے اس کا خون کھول اٹھا اور چہرا غصے سے تمتمانے لگا۔

''تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ میجر صاحب کو چھوڑ دو اور جلدی سے ہمارا علاقہ خالی کر کے جاؤ......''۔

وشال نے جان کی بازی لگا کر انہیں اونچی آواز میں للکارتے ہوئے کہا۔

''آپ کے میجر صاحب اندر تمبو میں ہیں......''۔

دشمن کے ایک جوان نے اس کے دھمکی آمیز لہجے کا نوٹس لئے بغیر، نرم لہجے میں کہا۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد وہ خیمے کے اندر داخل ہوئے تو ان کا آفیسر کمبل میں لپٹا لکڑی کے تختے پر دراز تھا۔ اپنے کچھ جوان بھی اس کے اردگرد موجود تھے جبکہ دوسری طرف کا آفیسر، جس کے چہرے پر داڑھی تھی، بھی ایک تختے پر شدید مضروبیت کی حالت میں درد سے کراہ رہا تھا۔ وہاں جل رہی کئی انگیٹھیوں سے زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ دراصل دوسری طرف کے محافظ ایک چوکی سے وہ خیمہ اور کچھ ساز و سامان نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

''سر......ابھی ہمارے پانچ جوان لاپتہ ہیں اور دو کی موت ہو چکی ہے''۔

دوسری طرف کے ایک محافظ نے حواس باختگی کے عالم میں اندر داخل ہو کر پُرنم آنکھوں سے اپنے زخمی آفیسر کو خبر دی۔

''ورنہ یہاں زندہ ہی کون ہے؟''

آفیسر خود سے بڑبڑایا۔

''سر...؟''

''ریسکیو آپریشن جاری رکھو اور لاپتہ جوانوں کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کرو......''۔

آفیسر نے نخیف سے لہجے میں کہا۔

''یس سر''۔

''سر ہمارے کیول دو جوان لاپتہ ہیں، باقی سب مل گئے''۔

وشال کے ایک ساتھی نے بھی اپنے آفیسر کو بتایا۔

''سر......یہ لوگ ہمارے علاقے میں گھس آئے ہیں''۔

وشال نے آفیسر کو خبردار کرنے کی غرض سے کہا لیکن آفیسر، جو اسوقت نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا، کوئی جواب نہیں دے سکا۔

لیکن دوسرے طرف کے ایک محافظ نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ تمہارا نہیں ہمارا علاقہ ہے''۔

''یہ جھوٹ ہے، آپ لوگ ہمیں اسطرح دھوکہ نہیں دے سکتے''۔

وشال نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ۔ دونوں طرف کے محافظوں میں تو تو میں میں شروع ہوگئی، حالانکہ اب یہ ثابت کرنا کہ کون کس کا علاقہ ہے پانی پر پانی تحریر کرنے کے مترادف تھا کیوں کہ اب یہاں کوئی نشان نہیں بچا تھا......نہ کوئی کھمبا......نہ کوئی جھنڈا...... نہ کوئی لکیر......چاروں اور برف کے اونچے اونچے خوفناک ٹیلے نظر آرہے تھے جو چیخ چیخ کر بلاشرکت غیرے اپنی بادشاہت کا اعلان کرر ہے تھے۔ جب بات بڑھنے لگی اور محافظ اپنے اپنے دیش کی حفاظت کے لئے مرنے مارنے پر اتر آئے تو مضروب داڑھی والے آفیسر، جسے سانس لینے میں سخت تقلیف ہورہی تھی نے نحیف سے لہجے میں اپنے جوانوں سے مخاطب ہوکر کہا۔

''یہ ہمارا علاقہ نہیں ہے''۔

آفیسر کی بات سن کراس کے ماتحت جوان حقابقا ہوکر رہ گئے۔

''ساتھیو...... مرتے وقت کوئی جھوٹ نہیں بولتا......میں سچ کہتا ہوں، یہ سب دھوکہ ہے فریب ہے......یہ محض جھوٹی انا کی تسکین کا مسلہ ہے......ورنہ یہ ٹھنڈا جہنم کسی انسان کا علاقہ نہیں ہوسکتا......کبھی نہیں......دس ازنو...نو مینز لی....لینڈ۔

☆☆☆

اڑن طشتری

جشن کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں، شاہی محل کے خاص مشیر اور درباری بڑے انہماک سے خود جشن کی تیاریوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ کیوں کہ دھرتی پر رہنے بسنے والے انسانوں کا صدیوں پرانا سنہرا خواب پورا ہونے والا تھا۔ ہاں! وہی خواب جس کی تعبیر ڈھونڈتے ڈھونڈتے انسان نے بے پناہ محنت کے ساتھ ساتھ کافی سرمایہ بھی خرچ کیا ہے۔

اس خواب کی تعبیر سے یقیناً انسانی زندگی کے ایک نئے ناقابل فراموش انقلاب کی شروعات ہونگی۔ اسی عظیم خواب کے پورا ہونے کی خوشی میں دھرتی پر ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا گیا تھا، دھرتی کے شاہی محل کو دلہن کی طرح سجایا اور سنوارا گیا تھا۔ جشن میں شرکت کے لئے شہنشاہ دھرتی کے ساتھ ساتھ تمام بادشاہ اور وزیر بہ نفس نفیس موجود تھے۔

دفعتاً شاہی محل بارودی دھماکوں کی گن گرج سے گونج اٹھا اور درجنوں توپوں کی سلامی سے باضابطہ طور جشن کا آغاز ہوگیا، جس کے ساتھ ہی شہنشاہ دھرتی، بادشاہ، وزیر، بڑے بڑے سائینس دان اور وہاں موجود دھرتی کے دیگر ذہین ترین لوگ فرط نشاط وانبساط سے جھوم اٹھے۔ رقص وسرور کی محفل شروع ہوگئی، جس میں رنگ ونور کی بارش، زرق وبرق لباسوں میں ملبوس مچھلیوں کی طرح پھدکتی ہوئی نازک اندام حسینائیں اور مست ومدہوش کرتی ہوئی موسیقی کا دور چلنے کے بعد شہنشاہ دھرتی بڑے ہی کروفرو کے ساتھ سٹیج پر جلوہ افروز ہوگیا۔

’’پیارے دھرتی واسیو...... ہم نے اپنی ذہانت، تدبر اور محنت سے دھرتی پر ترقی

کی آخری حدوں کو چھولیا ہے۔ اب ایک اور سیارے مریخ پر قدم رکھ کر وہاں انسانی زندگی کی شروعات کرنے اور ترقی کے نئے جھنڈے گاڑھنے کا وقت آپہنچا ہے۔ مجھے اپنے دھرتی واسیوں سے یہ بات شیر کرتے ہوئے بے انتہا فخر اور خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ہمارا یہ صدیوں پرانا خوب صورت خواب بہت جلد پورا ہونے والا ہے.....''۔

شاہی محل تالیوں اور سیٹیوں سے گونج اٹھا، وہاں موجود لوگ شاداں و فرحاں اٹھ کر رقص کرتے ہوئے جھومنے لگے۔ جنہیں شہنشاہ نے ہاتھ ہلا ہلا کر خاموش ہونے کے لئے کہا۔

''اسی عظیم اور قابل رشک کامیابی کے تناظر میں ہم نے اس شاندار اور پر وقار جشن کا انعقاد کیا ہے۔ آپ لوگوں کی خوشی یہ جان کر دوبالا ہوگی کہ اس جشن کو رونق بخشنے کے لئے ہم نے سیارہ مریخ پر راج کرنے والی ملکہ امن کو مدعو کیا ہے۔ جن کے سامنے ہم دھرتی پر ہونے والی اس بے پناہ ولازوال ترقی کے سارے راز کھول کر مریخ پر انسانی زندگی شروع کرنے کے اس بڑے معاہدے کو حتمی شکل دیں گے پھر ہمیں دھرتی کے ساتھ ساتھ مریخ پر راج کرنے اور دیگر سیاروں پر پاؤں پسارنے سے کوئی بھی طاقت نہیں روک سکتی......''۔

شہنشاہ دل و دماغ میں تکبر کے بلند و بالا پہاڑ لئے دیکھتے ہی دیکھتے تختہ سلیمان پر جا بیٹھا اور بڑے ہی فخریہ انداز میں دھرتی پر آباد انسانی دنیا کی ترقی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ ایک بڑے پردے کے ذریعے انسانی ترقی کے مختلف رنگوں کی نمائش بھی ہوتی رہی۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ اگلے وقتوں میں زمین پر رینگنے والا یا بیل گاڑیوں میں سفر کرنے والا انسان آج بغیر کسی خوف کے خلاؤں میں اڑ رہا ہے۔ جنگلوں اور معمولی سے کچے مکانوں میں رہنے کے بجائے اب اونچے اونچے شاندار محلوں میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے۔ درختوں کے پتے اور جنگلی پھلوں پر گزارہ کرنے کے بجائے قسم بہ قسم کی اعلیٰ سے اعلیٰ ضیافتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ کروڑوں انسان ضرورت سے زیادہ غذا کھانے کی وجہ سے نہ صرف موٹاپے بلکہ سخت ترین بیماریوں کے شکار ہو رہے ہیں۔ لیکن نئی نئی بیماریوں کے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ سائینس کی ترقی کی بدولت ان

کا بہتر علاج و معالجہ دستیاب ہے، جب کہ بڑے بڑے ہوٹلوں اور دیگر تقریبات میں لاکھوں کروڑوں کی خوردنی اشیاء کوڑے دانوں کی نظر ہو جاتی ہیں۔ جہالت اور ناخواندگی کی جگہ علم کے نور نے لے لی ہے اور چاروں اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی دانشگاہوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ اونچے اونچے پہاڑوں کو چیر کر شاہراہیں اور ریلوے پٹریاں تعمیر ہو چکی ہیں۔ اطلاعاتی ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی میں ایک نیا ناقابل فراموش انقلاب بھرپا کر دیا ہے۔ غرض یہ دھرتی واسیوں نے ترقی کی جن حدوں کو چھو لیا ہے یہی ترقی کی معراج ہے...... شہنشاہ نے سینہ پھُلا کر اس بات کا بھی خلاصہ کیا کہ ہمارے خلائی ماہرین مریخ پر گالف کلب، سوئمنگ پول بڑے بڑے شاپنگ مال اور ہوٹل تعمیر کرنے کے منصوبے مکمل کر چکے ہیں۔ پلاٹوں کی الاٹمنٹ کا سلسلہ جاری ہے اور بہت جلد وہاں مکانات تعمیر کرنے کے لئے عملی اقدامات کئے جائیں گے۔

شہنشاہ دھرتی الف لیلیٰ کے جادوگھر بادشاہ کی مانند بڑی ہی چابک دستی اور فنکاری سے انسانی ترقی کے گن گانے میں مصروف تھا کہ اچانک زوردار سائیرن بج اٹھا اور شہنشاہ اپنی بات کا موضوع بدلتے ہوئے یوں گویا ہوا۔

''حاضرین محفل ......دل تھام کے رہیے، وہ مبارک گھڑی آ گئی جس کا ہمیں شدت سے انتظار تھا.....مریخ کی سلطنت کی ملکہ امن دھرتی پر قدم بہ رنجیدہ ہو رہی ہیں''۔

اس کے ساتھ ہی شہنشاہ اور سارے درباری ملکہ کے استقبال کے لئے شاہی محل سے باہر آ گئے۔ کچھ لمحوں میں ہی ملکہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ محل میں داخل ہو گئی، وہاں موجود حاضرین نے بھی کھڑے ہو کر اس کا پر جوش استقبال کیا جب کہ کئی توپوں کی سلامی بھی دی گئی۔ توپوں کے دھماکوں گن گرج سے ملکہ کے چہرے پر خوف اور رنج کی لکیریں نمودار ہو گئیں، تنگ آ کر اس نے انگلیاں کانوں میں ٹھونستے ہوئے پریشان لہجے میں شہنشاہ سے سوال کیا۔

''شہنشاہ دھرتی...... یہ بارود کے دھماکے کہاں اور کیوں ہو رہے ہیں؟''

''ملکہ..... یہ دھماکے آپ کے اعزاز میں کیئے جا رہے ہیں''۔

''دھماکے اور اعزاز......؟''

وہ حیرت زدہ سی ہوگئی۔

''اس ترقی یافتہ دھرتی پر دھماکہ خیز مواد بھی موجود ہے؟''

''ملکہ......ہمارے پاس ایٹم بم، نیوکلیر بم، ہائیڈروجن بم اور دیگر کیمیاوی بموں کے علاوہ بے شمار قسم کا گولہ بارود موجود ہے''۔

شہنشاہ نے ترقی بہ ترقی جواب دیا''۔

''یہ سب تو تباہی اور بربادی کا سامان ہے......میری جانکاری کے مطابق ایک زمانے میں اس کا استعمال کر کے دھرتی کے کئی خوب صورت شہروں کو کھنڈرات میں تبدیل کر کے زندگی کو نیست و نابود کیا گیا تھا۔ترقی کے اس دور میں بھلا ان جان لیوا تباہ کن ہتھیاروں کی ضرورت کیا ہے؟''

''ملکہ......یہ......یہ ہتھیار ہماری ترقی کا حصہ ہیں''۔

شہنشاہ نے شرمندہ ہو کر گول مول سا جواب دیا۔

''اس پر تو بہت سرمایہ خرچ ہوتا ہوگا؟''

''ملکہ......آپ کا اندازہ بالکل درست ہے، لیکن ہمارے پاس بھلا کس چیز کی کمی ہے۔اب ہم ہر لحاظ سے خود کفیل ہیں اور سارے دھرتی واسی انتہائی خوشحال زندگی گزر رہے ہیں''۔

''سامعین کرام ......دل تھام کے رہیے......اب آپ کے سامنے آرہی ہیں مریخ پر راج کرنے والی ملکہ امن''۔

کچھ وقت تک شہنشاہ سے محو گفتگو رہنے اور دھرتی پر ہوئی قابل رشک ترقی کا بچشم خود مشاہدہ کرنے کے بعد تالیوں کی گونج کے ساتھ ملکہ سٹیج پر جلوہ افروز ہوگئی۔

''پیارے دھرتی واسیو......بے شک آپ نے اپنی ذہانت اور محنت سے ترقی کی آخری حدوں کو چھو لیا ہے۔ مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ دھرتی پر اب کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے اور سارے دھرتی واسی خوشحال اور پر سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں......''۔

''بھوکوں کو روٹی دو......ننگوں کو کپڑا دو......''۔

''شہنشاہ تیرے راج میں......بچے بھوکے مرتے ہیں......''۔

دفعتاً شاہی محل کے چاروں اطراف ایک شور سا بھرپا ہوگیا، جو ہر لمحہ کے ساتھ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ شور سن کر شہنشاہ کے عقل کے طوطے اڑ گئے جب کہ ملکہ بھی پریشان سی ہوگئی اور بے قراری کے عالم میں شہنشاہ سے مخاطب ہوئی۔

''شہنشاہ......دھرتی پر یہ کیسا شور ہے؟''

''ملکہ ......یہ لوگ ہماری ترقی کے دشمن ہیں......آپ اپنی بات جاری رکھیں......میں سب سنبھالوں گا''۔

ملکہ نے اگرچہ اپنی بات جاری رکھنی چاہی لیکن شور شرابے میں وہ خود بھی اپنی بات نہیں سن پا رہی تھی۔

جب بادلوں کی طرح گرجتے نعروں کی گونج اور سخت شور سے ملکہ کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے تو اس نے اپنے ذاتی سیکریٹری، جو دیکھنے میں جاسوسی ناولوں کا پراسرار کردار لگتا تھا، کو حالات کا جائیزہ لینے کا حکم صادر فرمایا، حکم کی تعمیل کے بعد وہ جلد ہی ملکہ کے سامنے حاضر ہوکر گویا ہوا۔

''ملکہ کا اقبال بلند ہو......دھرتی کے اس شاہی محل کو پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ملبوس بے شمار فاقہ مست دھرتی واسیوں نے گھیر لیا ہے''۔

''مگر کیوں؟''

''ملکہ عالی جان......وہ انصاف مانگتے ہیں''۔

''انہیں کیا پریشانی ہے؟''

''اس ترقی یافتہ دھرتی پر کروڑوں لوگ بے انصافی کی تپش میں نڈھال غربت، افلاس اور بھکمری کے شکار ہیں......بھوک کی اس منڈی میں روزانہ بہت سے معصوم بچے اور بزرگ انساں بلک بلک کر موت کا نوالہ بن جاتے ہیں، جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہے''۔

ملکہ کے خوش وخرم چہرے پر ایک دم تاسف وافسردگی کی برف جم گئی اور اور جھیلوں

سی اتھاہ گہرائیوں والی آنکھوں میں اُداسی پھیل گئی۔

''او مائی گارڈ......اس قدر گھمبیر صورت حال اور اتنا بڑا دھوکہ.......''۔

اس نے حیرت واستعجاب میں ڈوب کر دھرتی کے شہنشاہ اور اس کے اردگرد موجود بادشاہوں پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا اور غصے کی حالت میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایسے جانے لگی جیسے کوئی تتلی مکڑی کے جالے سے آزاد ہو کر بھاگ رہی ہو۔

''ملکہ امن.....ملکہ......''۔

شہنشاہ اور اس کے درباری بوکھلاہٹ کے عالم میں اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کو روکنے کے لئے آوازیں دیتے رہے لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی اور اپنی اڑن طشتری میں بیٹھ کر فضاؤں میں گُم ہوگئی۔

☆☆☆

سرسوں کے پھول

گل افروز رسوئی میں کام میں مصروف تھی کہ دفعتاً سائیرن بج اٹھنے سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔اس نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی کا پٹ کھول کر باہر جھانکا تو زندگی حسب معمول رواں دواں تھی۔لوگ کھیتوں کی طرف جارہے تھے۔سب اپنے اپنے کام میں مشغول تھے ،خوش پوش وردیوں میں ملبوس بچے سکولوں کی جانب رواں دواں ، جب کہ میدان میں بہت سے مویشی اطمیناں سے گھاس چرنے میں مست تھے۔چند لمحے حالات کا جائیزہ لینے کے بعداس نے دوسری طرف کی کھڑکی کھولی جہاں سے اس گاؤں بلکہ اس ملک کی آخری حدیں دکھائی دے رہی تھیں ،اس طرف بھی سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔حدمتارکہ پرملک کی حفاظت پر معمور فوجی چوکیاں ،جن پر ملک کے جھنڈے اونچے لہرائے ہوئے تھے ،بھی پرسکون تھیں۔باہر کا نظارہ بھی کافی پر کشش تھا کیوں کہ کئی دن کی لگاتار بارشوں کے بعد آج مطلع صاف تھا، بلند وبالا پہاڑ سورج کی روشنی میں نہائے ہوئے تھے ،اونچے اونچے درختوں کی ٹہنیاں سورج کی شعاؤں سے سنہری ہورہی تھیں۔پاس ہی موجود آبشار بھی شور مچارہا تھاجب کہ اردگرددوردور تک پھیلے ہوئے سرسوں کے کھیتوں کامسحور کن نظارہ قابل دید تھا،جن میں کھلے ان گنت معصوم پھول کئی دنوں تک طوفانی بارشوں سے نبرآزمارہنے کے بعد مسکراتے ہوئے اپنی فتح کا اعلان کررہے تھے۔اب اس کوکسی حدتک اطمینان ہوگیا کہ یہ ایک معمول کا سائیرن تھااور خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔

’’کاش میں کوئی پنچھی ہوتی‘‘۔

کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے دلفریب نظاروں کے سحر میں کھو کر گل افروز، جسے گھر کی چار دیواری سانپ بن کر ڈس رہی تھیں، کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا، اس نے ایک لمبی انگڑائی لی اور بدستور کچھ دوری پر واقع سلمان کے گھر جس کا آدھا حصہ ہی نظر آ رہا تھا کی طرف دیکھتے ہوئے گنگنانے لگی......

''گل پتر......آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تم کچھ دیر کے لئے بکریاں لے کر میدان چلی جاؤ''۔

سلمان کے گھر کی طرف نظریں ٹکائے سرور کی کیفیت میں گنگنانے میں مصروف گل افروز، کی سماعتوں سے دفعتاً ماں کی آواز ٹکرائی۔

''اچھا مائی......''۔اس نے چونک کر سر کی چادر سنبھالتے ہوئے کہا اور بکریاں لے کر گھر سے تھوڑی دوری پر واقع میدان کی طرف چل پڑی۔ آج بہت دنوں کے بعد بکریوں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے دل افروز باغ باغ ہو رہی تھی۔ یوں تو اس کی ساری عمر بکریوں کے پیچھے پیچھے ہی گزری تھی لیکن یہاں کے رواج کے مطابق شادی طئے ہو جانے کے بعد لڑکیاں بہت کم گھروں سے باہر قدم رکھتی تھیں۔ چند مہینے قبل گل افروز کی شادی بھی سلمان کے ساتھ طئے ہو چکی تھی اور رخصتی کی رسم صرف دو دن بعد انجام پانے والی تھی۔ میٹھے سوچوں میں گُم گل افروز، جس کے نفسیاتی زیر و بم میں عجیب سرور چھایا ہوا تھا، کو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب میدان میں پہنچی جہاں بکریاں چرنے میں مصروف ہو گئیں اور وہ ندی کنارے بیٹھ کر سرسوں کے پھولوں کے خوب صورت نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ماضی کی سنہری یادوں میں کھو گئی......

سلمان اور گل افروز ایک دوسرے کے پڑوسی تھے جو بچپن سے ان ہی سرسوں کے کھیتوں میں اکٹھے ہنستے کھیلتے جوان ہوئے تھے۔ تین چار سال اکٹھے سکول بھی گئے تھے۔ غربت کے سبب دونوں نے تعلیم کو خیر آباد کہا اور خوب صورت جنگلی نظاروں میں ایک ساتھ کئی سالوں تک مویشی چراتے رہے۔ چھوٹی عمر سے ہی ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی تھا اور ایک دوسرے کا بے حد خیال بھی رکھتے تھے۔ جوانی کے دہلیز پر قدم رکھتے ہی ان کا یہ

معصوم سا تعلق کب پیار میں بدل گیا انہیں پتہ ہی نہیں چلا۔ گل افروز پر شباب کے پھول کھلنا گیا شروع ہوئے کہ سلمان اس پر فریفتہ ہو گیا، اس کا دھلا دھلا گلاب جیسا چہرہ...... معصوم آنکھیں جن میں عجیب سی چمک تھی...... گھنے سنہرے بال..... خوب صورت خدوخال...... تیکھے تیکھے نقوش اور پتلے پتلے ہونٹوں پر ہر وقت تبسم کی ہلکی سی لہریوں کھلتی رہتی کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ یہ مسکرا چکی ہے یا مسکرانے والی ہے۔ دن بہ دن اس کے حسن کے نکھار سے سلمان کی دیوانگی میں اضافہ ہونے لگا، جب ضبط کی ساری حدیں پار ہو گئیں تو ایک دن اس نے سرسوں کے پھولوں کو گواہ بنا کر ڈرتے ڈرتے گل افروز کو اپنے دل کا حال بتاتے ہوئے کہا۔

''گل...... اے گل...... میں تمہارے ساتھ بہت پیار کرتا ہوں، تمہارے بغیر ایک پل بھی جینا مشکل ہو رہا ہے''۔

''ہائے میں مرگئی......''۔

گل افروز، جس کے دل پر سلمان کی ہی حکومت چلتی تھی، کے دل کے تار جھنجھنا اٹھے۔ وہ لاج کے مارے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے خوشی سے پاگل ہو کر دوڑتے دوڑتے گھر کی طرف چل دی۔ اس دن کے بعد دونوں چوری چھپے پیار کی پینگیں بڑھاتے ہوئے خوابوں کے اڑن کھٹولوں پر سوار ہو کر آسمانوں کی سیر کرنے لگے۔ وعدے ہوئے، ساتھ جینے ساتھ مرنے کی قسمیں اٹھائی گئیں۔ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے کے مصداق دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بچگانہ حرکتوں کی خبر ان کے والدین کے کانوں تک پہنچی، جنہوں نے صلاح مشورہ کر کے بڑی دانشمندی سے دونوں کا رشتہ پکا کر دیا۔ اسطرح گل افروز کا بکریوں کے پیچھے جانا بھی بند ہو گیا اور دونوں کا ملنے پر پابندیاں لگ گئی۔ رشتہ طئے ہونے کے بعد گل افروز سلمان سے کبھی نہیں ملی، صرف دو تین بار اس کو دور سے ہی دیکھا تھا۔ یہ سارا وقت اگرچہ اس نے تڑپ تڑپ کر انگاروں پر گزارا تھا لیکن اب وہ بہت خوش تھی کیوں کہ محض دو دن ہی کی بات تو تھی جس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سلمان کے ساتھ ہی رہنے والی تھی......

''تڑاک...تڑاک...تڑاک......''۔

گل افروز میٹھے سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ اچانک گولیاں چلنے کی خوفناک آوازیں آنے لگیں، جس کے ساتھ ہی زوردار آواز میں سائیرن بج اٹھا اور لوگ اپنا اپنا کام چھوڑ کر چیختے چلاتے افراتفری کے عالم میں ادھر اُدھر بھاگنے لگے، جب کہ میدان میں چر رہے مویشی بھی دم بخود ہو کر رہ گئے۔ گل افروز یہ منظر دیکھ کر بہت زیادہ گھبرا گئی، خوف و دہشت کے سائے اس کے وجود کے ریشوں پر چھا گئے۔ پہلے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے لیکن جب سارا علاقہ گولیوں کی سنسناہٹ اور دھماکوں کے سماعت شکن آوازوں سے دہل اٹھا اور سرسوں کے پھول سہم کر رہ گئے تو وہ مٹھیاں بند کر کے روتے ہوئے خوف زدہ ہرنی کی طرح گھر کی طرف بھاگنے لگی' بھاگتے بھاگتے دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ اسے سلمان بھی نظر آیا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش تو ہو گئے لیکن خوف کے مارے کچھ نہ بولے بلکہ جان بچانے کی فکر میں گھر کی جانب دوڑتے رہے لیکن نصف فاصلہ طئے کرنے کے بعد ہی ایک زوردار دھماکے کے ساتھ اس کے سر سے کوئی چیز زور سے ٹکرائی اور وہ سرسوں کے لہلہاتے کھیت میں دھڑام سے گر پڑی......

''سلمان......سلمان......جلد......''۔

غنودگی کی حالت میں سلمان کو پکارتے ہوئے کچھ لمحے تڑپنے کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی......

گل افروز کا خوب صورت گاؤں ملک کی سرحد کے نزدیک واقع تھا، جہاں کے لوگ سیدھی سادھی زندگی گزرتے تھے۔ زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی اور مویشی پالن کے پیشوں سے وابستہ تھے اور سخت محنت کر کے اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ گولہ باری اور فائیرنگ کے واقعات رونما ہونا یہاں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ دہائیوں سے پڑوسی ملک کے ساتھ جاری کشیدگی کے سبب یہ غریب بستی کٹھن حالات سے دوچار تھی، یہاں رہائیش پذیر لوگ سرحد پر جاری پر تناؤ صورت حال اور آئے روز کی گولہ باری کے سبب گھٹ گھٹ کر جینے پر مجبور تھے، جن کے ذہنوں میں ہر وقت اندیشوں اور خدشات کے اذیت ناک ناگ

پھن اٹھائے پھرتے تھے۔ سرحد پر کسی بھی وقت دونوں طرف سے بندوقوں اور توپوں کے دہانے کھلتے تھے، جس کے نتیجے میں سرحد کی حفاظت پر معمور فوجی جوانوں کے ساتھ ساتھ بستی کے لوگوں کو بھی جانی اور مالی نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان حالات کے چلتے آج تک کئی گھرانے اجڑ چکے تھے جب کہ بیسوں لوگ مضروب ہو کر عمر بھر کے لئے ناکارہ ہو چکے تھے۔

کئی گھنٹوں کے بعد جب گل افروز کو ہوش آیا تو وہ اسپتال کے امرجنسی وارڈ میں چارپائی پر دراز تھی، سر اور جسم کے کئی حصوں سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں کچھ دیر تذبذب کی حالت میں ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ چونک کر اپنی ماں، جو اس کے سامنے کھڑی تھی، سے مخاطب ہوئی۔

''مائی...... سلمان کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا''؟

''تو ٹھیک ہے نا گل پتر......''۔

ماں نے اپنے چہرے سے آنسوں صاف کر کے اس کی بات ٹالتے ہوئے کہا، کیوں کہ وہ اس کو یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ سرسوں کے پھولوں کو گواہ بنا کر سلماں اس کو بچاتے ہوئے خود گولہ باری کی زد میں آ کر بری طرح سے زخمی ہو کر موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

☆☆☆

نیا شہر

شہر کی آلودگی، گہما گہمی اور اکتاہٹوں سے تنگ آ کر سکون کے چند دن گزارنے کے لئے میں کئی مہینوں سے کسی دور دراز، خاموش، صاف وشفاف علاقے میں کچھ وقت گزارنے کے بارے میں سوچ رہا تھا، لیکن میرے ذہن میں ایسی کسی جگہ کا خیال نہیں آرہا تھا۔ ایک دن میں نے اپنے ڈرائیور نیاز احمد، جس سے میں نیازی کہہ کر پکارتا ہوں اور جو میرا اچھا دوست بھی ہے، سے اس بات کا ذکر کیا تو چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بول پڑا......

''جناب.........اگر آپ میری مانیں تو یہاں سے سو میل کی دوری پر ایک شہر ہے......''۔

''تم پھر شہر کی بات کر رہے ہو''۔

میں نے ہنسی میں لوٹ پوٹ ہو کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''حضور......آپ میری پوری بات تو سنیئے۔ وہ سر سبز جنگلوں کے دامن میں واقع ایک صاف ستھرا شہر ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ آپ جس چیز کے متلاشی ہیں وہاں آپ کو سو فیصد ایسا ہی ملے گا''۔

اس نے سرسری طور پر اس شہر کے ماحول اور رہن سہن کے بارے میں بتایا تو مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ میں نے اس کو جلدی سے اس شہر میں دس دن کے قیام اور دیگر ضروریات کا انتظامات کرنے کے لئے کہا۔ ایک ہفتے کے بعد میں اپنی فیملی سمیت اس شہر کے لئے

روانہ ہوا اور قریب تین گھنٹے بعد جب ہم اس شہر کے مضافات میں داخل ہوئے تو سڑک کے دونوں اطراف کے نظارے دیکھ کر دل باغ باغ ہوا۔ وسیع رقبے پر بنے سادہ سے مکانات، صاف ستھری کھلی سڑکیں، خوبصورت درختوں اور سبزے کی بہتات، صاف وشفاف آب و ہوا اور تا حد نظر پھیلے باغات اور کھیت کھلیان فطرت سے قریب محسوس ہو رہے تھے۔

''حضور...... کیسا محسوس ہو رہا ہے''۔

میں ان ہی نظاروں میں کھویا ہوا تھا تو نیازی کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

''بہت بڑھیا نیازی...... تم نے واقعی ایک بہترین جگہ چنی ہے''۔

میں نے اس کو داد دیتے ہوئے کہا اور پھر سے نظارے دیکھنے میں محو ہو گیا۔ اس دوران جو خاص بات میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ وہاں زمین کی ایک فٹ بھی کہیں پر بیکار نہیں تھی اور سڑکوں پر گاڑیاں کم اور پیدل چلنے والے لوگ اور سائیکل سوار زیادہ تھے۔

''یہ دیکھیے حضور......''۔

میں ان ہی سوچوں میں گم تھا تو اچانک گاڑی رکنے سے میں چونک سا گیا۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو سامنے وسیع عریض زمین کے ٹکڑے پر بنا وہ خوبصورت فارم ہاوس تھا جسے نیازی نے رہائش کے لئے بک کیا تھا۔ نیازی نے مین گیٹ کھولا اور گاڑی لے کر اندر داخل ہو گیا۔ دور دور تک گھنے جنگلوں میں گھرے انسانی آبادی سے دور اس واحد گھر کو دیکھ کر یوں لگا جیسے جنگل میں بہار آ گئی ہو۔ گھر کے چاروں اطراف بڑے درختوں کے بجائے بے شمار چھوٹے اور پھولدار پودے قوس قزا کے رنگ بکھیر رہے تھے جب کہ مختلف قسم کے میوہ درخت بھی شامل تھے۔ مرکزی دروازے پر لگی انگور کی بیل گھر کی دیوار پر پھیلی تھی جس پر انگوروں کے بڑے بڑے گچھے لٹک رہے تھے جب کہ عقب میں دور تک پھیلا گھاس کا میدان تھا جہاں گھوڑے، بکریاں اور گائیں چر رہیں تھیں۔ اب ہمارے لئے مسئلہ یہ کھڑا ہو گیا کہ فارم ہاوس کے صدر دروازے پر تالا لگا تھا، کچھ لمحے سوچنے کے بعد میں نے فارم ہاوس کی مالکن کو فون کیا تو اس نے فون پر ہی ہمارا والہانہ استقبال کیا اور بتایا کہ صدر دروازے کے دائیں طرف بنے بکسے میں چابیاں ہیں اور بکسہ کھولنے کا کوڈ نمبر بھی بتایا۔ اس

نے یہ بھی بتایا کہ اندر آپ کو حسب وعدہ ہر چیز صاف ستھری اور معیاری ملے گی، اگر کوئی بھی شکایت ہوگی تو بلا تامل مجھ سے رابطہ کر لینا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے تو واقعی پورا گھر سجا سنورا اور انتہائی صاف ستھرا تھا۔ جہاں بھینی بھینی خوشبو کی فوارسی برس رہی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں ایک لائبریری بھی تھی، جہاں مختلف مذاہب اور دیگر موضوعات پر سینکڑوں کتابیں موجود تھیں۔ جو کہ میرے، بیگم اور نیازی کے مطالعہ کے لئے بڑی مفید تھیں۔ اس کے علاوہ جس چیز سے میں زیادہ متاثر ہوا وہ یہ تھا کہ نلوں کے ذریعے چوبیس گھنٹے پانی کی سپلائی میسر ہونے کے باوجود فارم ہاوس کے ملحق دو بڑے بڑے پلاسٹک کی ٹینکیاں لگی تھیں جن میں بارش کے وقت چھت کا پانی جمع ہو جاتا تھا اور یہی پانی نہانے، دھونے وغیرہ کے کام آتا تھا۔

دوسرے دن صبح صبح ہی ایک حسینہ پھول لے کر آئی اور گڈ مارننگ کہہ کر بیگم کو پھول پیش کیے، کئی اخبارات میرے سامنے رکھ دئے اور فارم ہاوس کی صفائی کرنے میں جٹ گئی، جب کہ صفائی ختم کرنے کے بعد فارم ہاوس کے پیچھے خالی زمین میں جا کر گھوڑوں، گائیوں اور بکریوں کو چارہ ڈالا، گائیوں اور بکریوں سے دودھ لے کر بڑے بڑے برتنوں میں رکھا اور کچھ وقت وہاں گزار کر چلی گئی۔ دوپہر کے وقت ایک نوجوان گاڑی لے کر آیا اور دودھ گاڑی میں ڈال کر چلا گیا۔ ان دونوں کا روز کا یہی معمول تھا۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ دونوں یہاں ملازم ہیں، دونوں بغیر کسی نگرانی کے بڑی ایمانداری اور خوش اسلوبی سے اپنا کام انجام دیتے تھے۔

ہم اکثر دوپہر کے بعد گاڑی نکال کر وہاں کے مختلف علاقوں کی طرف گھومنے جاتے تھے جس دوران ہمیں بالکل نئے تجربوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ وہاں اکثر گھروں کے سامنے چھوٹے چھوٹے دکان بنے تھے، جن میں مختلف چیزیں فروخت کے لئے رکھی ہوئی تھی جن پر قیمت درج ہوتی۔ گاہک رقم وہاں رکھ کر خود ہی چیزیں اٹھاتے رہتے۔ ایک کھلا بکس بھی رکھا ہوتا تھا۔ جس سے ادائیگی کے دوران ریزگاری نکال سکتے تھے۔ وہاں کوئی آدمی موجود ہوتا تھا اور نہ کوئی کیمرہ لیکن کیا مجال کہ کوئی گاہک چوری یا بے ایمانی کرتا۔ ہم

میاں بیوی وہاں کے طور طریقوں کو جلد ہی سمجھ گئے اور کافی حیران بھی ہو گئے لیکن بچے اس طرح کا ماحول دیکھ کر طرح طرح کے سوالات کرتے رہے جیسے اگر کوئی چیز اٹھائے اور پیسے نہ رکھے؟ یا اگر کوئی بکسے میں سے پیسے چرائے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ایک روز ہم ایک چھوٹی سی پارک میں بیٹھے تھے، بچوں نے حسب عادت چپس کھا کر خالی پاکٹ اور مشروب کی خالی بوتل ایک طرف پھینک دی، تھوڑی دوری پر بیٹھی ایک لڑکی نے دیکھا تو دوڑ کے آئی اور پاکٹ اور بوتل اٹھا کر کوڑے دان میں چھوڑ کر ہمارے پاس آئی اور بڑے ہی پیار بھرے انداز میں بچوں کو ایسے سمجھایا کہ وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ لڑکی پارک کی دیکھ ریکھ پر معمور ہوگی اور باتوں ہی باتوں میں اسے اس کے پیشے کے بارے میں پوچھا، جب اس نے کہا کہ وہ ایک پروفیسر ہے تو میرے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔

ایک روز ہم گھوم پھر کے شام دیر گئے فارم ہاوس کی طرف واپس جا رہے تھے تو ٹائیر پنکچر ہو گیا، نیازی ٹائیر بدلنے لگا تو میں اور بچے وقت گزارنے کے لئے ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ اسی دوران پاس ہی واقع ایک عمارت سے کچھ چاک چوبند جوان نکل کر گاڑی کے پاس آکر نیازی سے کچھ کہنے لگے لیکن اسے ان کی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی تو اس نے اشارے سے مجھے بلایا، میں وہاں گیا تو انہوں نے کہا کہ وہ پولیس کے سپاہی ہیں۔ جب میں نے ان سے کہا کہ ہم دوسرے شہر سے سیر کے لئے آئے ہیں تو انہوں نے خوش ہو کر ہمارا استقبال کیا، ایک جوان نیازی کی مدد کرنے لگا اور دوسرے مجھے اور بچوں کو دعوت کر کے پولیس تھانے کے اندر لے گئے اور گرما گرم کافی سے ہماری خاطر تواضع کی جب کہ تھوڑی دیر بعد نیازی کو بھی اندر لا کر کافی پلائی گئی۔ وہاں پولیس کے کچھ آفیسر اور چھ سات سپاہی موجود تھے جو بالکل بے کار بیٹھے تھے، میں نے ایک آفیسر سے ان کے کام کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ پورے سال میں یہاں قانون شکنی کی دس بارہ شکایات ہی درج ہوتی ہیں جن میں سے اکثر دوسرے شہروں سے آنے والوں سے غلطی یا لاعلمی کے سبب سرزد ہوتی ہیں جنہیں ہم کونسلنگ کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔

دوسرے دن ہم شہر کے مرکزی علاقے میں گھومنے کی غرض سے گئے تو وہاں ایک عمارت پر میں نے ہائی کورٹ کا سائین بورڈ دیکھ کر نیازی کو گاڑی روکنے کو کہا۔ وہاں ہماری عدالتوں کی طرح سخت گہما گہمی نہیں تھی۔ کوئی آتا جاتا بھی دکھائی نہ دیا۔ عدالت کا صدر دروازہ کھلا تھا کچھ لمحوں کے بعد ہم گاڑی لے کر اندر داخل ہو گئے۔ عدالت کے وسیع صحن میں کوئی بھی نہیں تھا، میں اندر داخل ہو گیا تو ملازمین اور چند وکلاء کے علاوہ وہاں آٹھ دس لوگ بھی موجود تھے۔

''کہیے سر......ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟''

میں ابھی وہاں کا جائیزہ ہی لے رہا تھا تو ایک ادھیڑ عمر کا خوب رو شخص مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں نے جب اسے کہہ دیا کہ ہم اس شہر میں گھومنے پھرنے کے لئے آئے ہیں تو اس نے خوش ہو کر مجھے ایک کمرے، جہاں اعلیٰ قسم کا فرنیچر تھا، لے کر بٹھایا اور اور بڑی خوش اخلاقی سے مجھ سے باتیں کرنے لگا جب کہ چند منٹ بعد ہی ایک نوجوان چائے اور بسکٹ لے کر آ گیا۔ باتوں باتوں میں مجھے پتہ چلا کہ وہ اس عدالت میں تعینات سرکاری وکیل ہے۔ جب میں نے اسے عدالت کے کام کاج کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے برجستہ جواب دیا۔

''پورے سال معمولی نوعیت کے دس بیس کیس ہی اس عدالت میں پہنچ جاتے ہیں جنہیں ہم چٹکیوں میں حل کر دیتے ہیں اس کے علاوہ شادیاں، جائیداد کی رجسٹریشن وغیرہ کا کام ہی ہوتا ہے''۔

''یہاں کی جیل خانوں کے بارے میں کچھ بتائیے؟''

اس کے جواب سے میرے ذہن میں دوسرا سوال ابھرا۔

''اس شہر کے جیل خانے ہمیشہ خالی رہتے ہیں کیوں کہ یہاں جرم ہی نہیں ہوتے''۔

اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا، کافی دیر تک اس سے باتیں کرنے کے بعد میں وہاں سے واپس نکلا تو نیازی کو کچھ پریشان سا دیکھا میں نے وجہ پوچھی تو اسنے بتایا کہ میرا پرس کہیں کھو گیا جس میں میرا شناختی کارڈ اور دس بارہ ہزار روپے تھے۔

’’کوئی بات نہیں دس بارہ ہزار روپے کوئی بڑی رقم نہیں ہے......‘‘۔

’’نہیں سر......اس میں تیس ہزار روپے کی ایک سونے کی چین بھی تھی‘‘۔

اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

’’ویری بیڈ......خیر غم نہ کرو......میں تم کوئی چین خرید کے دونگا‘‘۔

میں نے اس کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

ہم نے فارم ہاوس کو دس دن کے لئے بک کیا تھا لیکن آٹھویں روز میرا ایک دوست بھی آیا جس نے مزید ایک دن ٹھہرنے پر اصرار کیا۔

میں نے فارم ہاوس کی مالکن کو فون کر کے مہمان کی آمد اور مزید ایک دن ٹھہرنے کے بارے میں بتایا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ مہمان کا اضافی کرایہ طلب کرے گی کیوں کہ گھر میں جتنے زیادہ لوگ ہونگے بجلی اور پانی بھی اسی حساب سے خرچ ہوتا ہے۔

’’مہمان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے جب کہ آپ بغیر کسی معاوضہ کے مزید ایک دن رک سکتے ہیں کیوں کہ اس دن کے لئے ابھی کوئی بکنگ نہیں ہے‘‘۔

اس کا یہ غیر متوقع جواب سن کر میں ششدر رہ گیا۔ گیارہ دن ہاتھ سے سرکتی ریت کی طرح ایسے گزر گئے کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا۔ اب ہم واپسی کے لئے تیار تھے اور مجھے پورا یقین تھا کہ فارم ہاوس کی مالکن سامان وغیرہ چک کرنے اور کرایہ وصولنے کے لئے ضرور آئے گی لیکن جب صبح کے دس بجے تک وہ نہیں آئی تو میں نے فون کر کے اسے مطلع کیا کہ ہم جا رہے ہیں آپ آ کے فارم ہاوس کو چک کیجئے اور کرایہ بھی لے کر جائیے۔ پہلے اس نے دوستی سے لبریز لہجے میں سخت اصرار کیا کہ آپ لوگ آج رات ہمارے گھر مہمان بن کے ٹھہریں۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا تو اس نے بھی معذرت کرتے ہوئے کہا کہ کچھ مصروفیات کی وجہ سے میں نہیں آسکوں گی، آپ کرائے کی رقم چابی والے بکسے میں رکھ کر جائیے اور اگر آپ کو کوئی پریشانی ہوئی ہو تو دل سے معاف کر دینا۔

اس کا یہ غیر متوقع جواب سن کر میں ایک نئی ہی دنیا میں پہنچ گیا۔ ہم ابھی جانے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ نیازی کا فون بج اٹھا اور بات کرتے ہی اس کی آنکھوں میں مسرت

کی چمک عود آئی۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ گھر والی کا فون تھا جو کہہ رہی تھی کہ آپ کا پرس نقدی اور سونے کی چین سمیت بذریعہ ڈاک گھر پہنچ گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہم تیار ہو کر نکلے تو میں وہاں گزارے وقت اور فرحت بخش یادوں میں کھو گیا...... دل چاہتا تھا کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی خوب صورت شہر میں رہوں جو مجھے بالکل ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔

''کیا ہمارا اپنا شہر اس نئے شہر جیسا نہیں بن سکتا......؟''

آخر اپنے شہر کو ہی اس نئے شہر جیسا بننے کے حسین خواب میری آنکھوں میں سجنے لگے اور میرے اندر ایک عجیب سا سرور چھانے لگا......

''صاحب.....ایک بات کہہ دوں......''۔

دفعتاً نیازی، جو پرس واپس ملنے کی خوشی میں جھومتے ہوئے گاڑی چلا رہا تھا، مجھ سے مخاطب ہوا۔

''ہاں......کہہ دو''۔

''فارم ہاؤس کی مالکن نے ہم سے زیادہ کرایہ وصول کیا لیکن ہم سے بھی غلطی ہوگئی''۔

''کیسی غلطی؟''

''اگر ہم نے بکسے میں کچھ ہزار روپے کم رکھ دیے ہوتے تو وہ ہمیں کہاں سے ڈھونڈتی؟''

نیازی کے الفاظ سن کر درد کی ایک تیز ٹیس میرے پورے وجود میں دوڑ گئی لیکن میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور مبہوت ہو کر اس کو دیکھتا رہا۔

☆☆☆

آئینہ فروش

''کیا میرے سارے آئینے نا کارہ ہو گئے ہیں......؟''

آئینہ فروش مایوس ہو کر اپنے آئینوں کو سامنے رکھ کر بڑبڑایا، اس کے دماغ میں راجا کے کہے ہوئے الفاظ اذیت بن کر گونج رہے تھے۔

''پیارے دیش واسیو...... ہمارے ذہین و فطین سائنس دانوں نے دن رات ایک کر کے جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے ہوا میں اڑنے والا آگ کا ایک ایسا طاقت ور گولہ بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے کہ نگری میں سب سے زیادہ طاقتور اور ترقی یافتہ بننے کا ہمارا دیرینہ خواب پورا ہو گیا۔ اب کوئی بھی دیش ہمارے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا...... نہ ہی ہمارے ترقی کے منصوبوں میں روڑے اٹکانے کی ہمت جٹا سکتا ہے''۔

آدم نگری کے ایک جزیرے کے راجا نے اپنی رعایا کے نام پیغام کی آڑ میں دل و ذہن میں تکبر کے بلند و بالا پہاڑ لئے سینہ پھلا کر دھمکی آمیز لہجہ میں نگری کے دوسرے راجاؤں کو اپنی طاقت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تو نگری کے دوسرے تباہی کے سوداگر راجاؤں میں کھلبلی مچ گئی اور وہ اپنی اپنی دکانوں کا مال بڑھانے کے لئے تگ و دو میں جٹ گئے، اس طرح نگری کا سیاسی درجہ حرارت عروج پر پہنچ گیا۔

''نگری کو امن شانتی اور خوشحالی کا مسکن بنانا ہمارا مشترکہ خواب ہے......''۔

اپنے ہاتھوں تخلیق کردہ خوب صورت آئینوں سے باتیں کرتے ہوئے ایک آئینے پر درج یہ الفاظ دیکھ کر ایک پل کے لئے آئینہ فروش کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا، لیکن دوسرے

ہی لمحہ یہ سوچ کر پھر سے اداسی آنکھوں میں سمٹ آئی کہ آدم زاد کے خون سے تر بتر آدم نگری کا باوا آدم ہی نرالا ہے، یہاں کے سیاہ وسپید کے مالک ایک سانس میں نگری کو امن اور خوشیوں کا جنت بنانے کی گُل افشانیاں کرتے ہیں تو دوسری ہی سانس میں انا کے بے لگام گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے دوزخ کے شعلے بھڑکا کر نگری کو اپنے ہی جنس کے خون سے نہلاتے ہیں۔ ان متضادریوں کے چلتے آدم نگری اپنی ہیت بدل کر وحشت نگری کا روپ دھارن کر چکی ہے، جہاں قریہ قریہ بستی بستی سرخ آندھی کی زد میں ہے۔ ننھی کلیاں، دوشیزائیں، جوان و بزرگ بے بسی کی حالت میں اپنی جانیں گنوا رہے ہیں۔ بزرگ والدین اپنے بڑھاپے کے سہارے جوان بیٹوں کی لاشوں کو کاندھا دینے پر مجبور ہیں۔ جنگل راج کے چلتے مقتول کو پتہ ہی نہیں کہ اسے کیوں قتل کیا گیا اور نہ قاتل کو خبر ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کیوں انسانی خون سے رنگ رہا ہے۔ بدامنی کے چلتے روتی بلکتی ہزاروں مائیں اپنے جگر کے ٹکڑوں کو آنچل میں چھپائے غاروں اور کھنڈروں میں چھپ کر زندگی کی بھیک مانگ رہی ہیں۔ پیٹ میں سلگ رہی بھوک کی آگ لئے روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو ترس رہے لاکھوں بے بس لوگ جنگلوں، بیابانوں اور صحراؤں میں کھلے آسمان تلے ننگی زمین پر کسم پرسی کی حالت میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔

''آخر کب تک یہ موت اور تباہی کا خونین رقص جاری رہے گا......؟''

نگری کا آئینہ فروش، جس کو اپنی ساری محنت رائیگاں ہوتی نظر آ رہی تھی، کے دل میں کئی چبھتے سوالات کُلبلانے لگے......

نگری میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق اندھے اور بہرے قانون کی حکمرانی کے چلتے بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے، طاقتور کمزور کو کچلتا ہے، انصاف کا جنازہ نکل چکا ہے اور محبت و انسانیت کی تجہیز و تکفین ہو چکی ہے۔ آپسی رقابتیں، سازشیں، جنگ وجدل، لوٹ مار اور دیگر سنگین جرائیم عروج پر ہیں اور کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ نگری کے بے شمار باشندے بیماری، بے روزگاری، غربت بھوک اور افلاس سے جھوج رہے ہیں لیکن طاقت کے نشے میں چور انا کے دائروں میں قید نگری کے راجے اس خام خیالی میں مبتلا

ہیں کہ انہوں نے نگری کو ترقی کی معراج پر پہنچا دیا ہے۔ نگری کے انصاف کے اعلیٰ ایوانوں میں براجمان نام نہاد منصف اور چودھری اپنی اپنی گدیوں کی حفاظت کے لئے نگری کے ان غنڈوں کی کاسہ لیسی کرتے ہوئے نہ صرف ساری سنگین صورت حال سے آنکھیں چرا کر محض دکھاوے اور زبانی جمع خرچ پر ہی اکتفا کرتے ہیں، بلکہ ان کی سیاہ کاریوں کی پردہ پوشی میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔

یہ سوچ کر آئینہ فروش کا وجود کانپ اٹھتا تھا کہ نگری کے کئی طاقت ور راجاؤں کے پاس نگری کو تباہ و برباد کرنے اور نسل آدم کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے کام آنے والا کھربوں روپے کا بے شمار ساز و سامان موجود ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں طاقت ور ترین آگ کے گولے موجود ہیں۔ نگری کے جس راجہ کے پاس تعداد میں زیادہ اور طاقت ور گولے موجود ہیں وہ اپنے آپ کو نگری کا بے تاج بادشاہ کہلاتے ہوئے ساری نگری کو اپنا غلام سمجھتا ہے، جب کہ نگری کے دستور کے مطابق بھی وہی نگری کا مہاراجہ کہلاتا ہے اور ساری نگری پر اسی کا حکم چلتا ہے۔ نگری کا بے تاج بادشاہ کہلانے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کشمکش میں نگری کے راجے زر کثیر بہاتے ہوئے نتائج کی پرواہ کئے بغیر زیادہ سے زیادہ اور طاقت ور آگ کے گولے اور دوسرا تباہی پھیلانے والا ساز و سامان بنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس طرح نگری کے کونے کونے میں بڑی تعداد میں یہ تباہ کن آگ کے گولے موجود ہیں جن کے بٹن دبانے سے آدم نگری کا وجود بھسم ہو کر یہاں موجود تمام مخلوقات کا خاتمہ یقینی ہے۔

نگری کی اس خوفناک صورت حال سے فکر مند اور بے چین آئینہ فروش عرصہ دراز سے نگری کے راجاؤں اور دیگر متعلقین کو حقیقت کی تصویر دکھانے کے لئے اپنے آئینے بیچ رہا ہے۔ حالانکہ مُنہ میں رام رام بغل میں چھری والے یہ راجے بڑی تعداد میں اس کے آئینے خرید تو رہے ہیں، لیکن ان کے رویے میں ذرا بھر بھی فرق نہیں آ رہا ہے، اُلٹا وہ اپنے خطرناک عزائم کی تکمیل کے لئے زیادہ سے زیادہ ابلیسی کاوشوں میں مصروف عمل ہیں اور نگری میں زہریلی سرخ آندھی روز بروز پھیلتی ہی جا رہی ہے۔

''میں ایک ناکام آئینہ فروش ہوں...... میرے سارے آئینے ناکارہ ہیں''۔

بہت دیر تک سوچ بچار کے اتھاہ سمندر میں کھوئے رہنے کے بعد آئینہ فروش، جس کا دعویٰ تھا کہ نگری کے سارے مسائل اور پریشانیوں کا حل صرف اور صرف محبت، یگانگت اور آپسی بھائی چارے میں پنہاں ہے، کے وجود میں درد و کرب کی ٹیسیں اٹھنے لگیں، اپنے مقدس خوابوں کا شیش محل چکنا چور ہوتا دیکھ کر سخت جنونی ہو کر وہ چیخ پڑا۔ اس نے آئینے تخلیق کرنے والا اپنا مقدس بیش قیمتی آلہ توڑ کر اپنی خوب صورت دکان بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''رک جاؤ......ایسی حماقت کبھی نہیں کرنا''۔

دفعتاً آئینہ فروش کی سماعتوں سے ایک زوردار آواز ٹکرائی۔ وہ رک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن کسی کو نہ پا کر اپنے فیصلے پر عمل کرنے کے لئے اپنا ریزہ ریزہ وجود لئے آگے بڑھا۔

''غور سے دیکھو......تمہارے یہ آئینے ناکارہ نہیں بلکہ انمول ہیں''۔

پھر سے وہی آواز آئی۔

''پھر......پھر......لیکن آپ ہو کون؟''

اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''میں ہی سچائی کا علمبردار ہوں......اعتماد سے اپنے اندر ٹٹول کر تو دیکھو''۔

''پھر سچ کیا ہے؟''

''سچ یہ ہے آپ نابیناؤں کی نگری کے آئینہ فروش ہو، جہاں کے راجاؤں کی بینائی مادی مفادات کی بدنما پٹیوں تلے دب چکی ہے''۔

☆☆☆

ڈینجر زون!

''اے زمین والو......؟''

بل کینڈی اپنے دفتر میں کام میں مصروف تھا کہ دفعتاً اس کے پیغام رسانی کے آلے پر کسی نامعلوم مقام سے پیغام موصول ہوا اور حیرت انگیز طور یہ الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے۔

''ہیلو......ہیلو......میں زمین سے بات کر رہا ہوں......اوور''۔

اس نے آواز کا جواب دیتے ہوئے واپس تحریری پیغام بھی بھیج دیا اور جواب ملنے کا انتظار کرنے لگا، لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ وہ خلاء میں سگنل پہ سگنل بھیجتا رہا جس دوران اس نے اپنے تحقیقاتی ادارے کے اوپر سے چند اڑن طشتریوں کو مسلسل پرواز کرتے ہوئے دیکھا۔ نامعلوم مقام سے ملے اس مختصر پیغام اور اڑن طشتریوں کے مسلسل پرواز سے تحقیقاتی ادارے میں ہلچل مچ گئی اور سارا عملہ متحرک ہو کر اڑن طشتریوں کے حرکات وسکنات کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنے لگا۔

مشہور خلائی سائنس دان بل کینڈی سیدھا اپنی خاص لیبارٹری میں پہنچ گیا جہاں دنیا کی طاقت ور دوربین (Hubble space telescope) لگی تھی جس پر جان ریگن کام کر رہا تھا۔ یہ دوربین کائینات میں پھیلے ذرات کے ساتھ ساتھ سپیس کے تمام ستاروں اور سیاروں کو کھوجنے کا کام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہی تھی۔

''ہائے جان.....تازہ جانکاری کیا ہے جسے ہمیں آگے بڑھنے میں مدد مل سکتی

ہے''۔

''سریوں تو سپیس میں موجود سارے سیارے ہماری نگاہوں میں ہیں، لیکن ہمارا اصل ہدف اب بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہے''۔

''میں اب زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا......''۔

وہ بڑبڑاتے ہوئے نہ جانے اور بھی کیا کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں دوربین پر ہی ٹکی تھیں۔

بل کینڈی برسوں سے اپنی ٹیم کے ہمراہ پُراسرار خلائی مخلوق کے بارے میں تحقیق کے ساتھ ساتھ خلاء میں پیغامات بھیج کر اس پُراسرار مخلوق سے رابطہ کرنے کے مشن اور سمندر کے اس حصے کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا، جس طرف جانے والے بحری جہاز، کشتیاں وراس علاقے کے اوپر اڑان بھرنے والے ہوائی جہاز سینکڑوں مسافروں اور عملے سمیت غائب ہو جاتے تھے۔ تحقیقاتی ادارے کو نامعلوم جگہوں سے ایسے پیغامات پہلے بھی موصول ہو چکے تھے جن کا کافی کوششوں کے باوجود کچھ پتہ نہیں چلا تھا کہ یہ پیغامات کہاں سے اور کس نے بھیجے ہیں؟ لیکن نہ جانے کیوں بل کینڈی نے آج کے مختصر پیغام کو سنجیدگی سے لیا اور اُسے نامعلوم خلائی مخلوق کے ساتھ رابطے استوار ہونے اور اپنے مشن میں کامیابی کی امید پیدا ہوگئی۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کیا واقعی ایک دن ایسا آئے گا جب ہم کسی اور کائینات کے مخلوق سے رابطے استوار کرنے میں کامیاب ہونگے؟ یہ نئی مخلوق کیسی ہوگی؟ ان کے ساتھ ہمارے تعلقات دوستانہ ہونگے یا دشمنانہ؟ ان کے سبب ہماری ترقی پر کیا اثرات مرتب ہونگے؟ دوران سفر غائب ہوئے سینکڑوں لوگوں کا پتا ملے گا کہ نہیں......؟

وہ پُراسرار خلائی مخلوق سے رابطے کے فراق میں لگاتار کئی دنوں تک اس نامعلوم مقام، جہاں سے اس کو مختصر پیغام موصول ہوا تھا، کی طرف پیغامات اور سگنلز بھیجتا رہا، لیکن حسب معمول اُسے کوئی کامیابی نہیں ملی۔ اس دوران اس کا حوصلہ یوں برقرار رہا کیوں کہ فضاء میں غیر معمولی طور اڑن طشتریاں لگاتار پرواز بھرتی رہیں، جس کا اس نے یہ مطلب

نکلا کہ پُراسرار مخلوق کی غیر معمولی سرگرمیوں میں ضرور کوئی راز ہے جسے جاننے کے لئے اس کا تجسس ہر لمحہ کے ساتھ بڑھتا ہی گیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد آخر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ایک بار پھر خلاء میں جا کے اس راز سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرے گا، حالانکہ ایک بار وہ خلائی سفر کے دوران بڑی مشکل سے جان بچا کر واپس آیا تھا۔ اس نے اپنی ٹیم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور سفر کی تیاری میں جُٹ گیا......

''سر...... یہ بہت ہی پر خطر سفر ہے اور آپ کی جان کو خطرہ ہوسکتا ہے''۔

جان ریگن نے اس کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں لیکن اس پُراسرار خلائی مخلوق سے رابطہ اور ان سینکڑوں لوگوں کی تلاش، جو اس جانب سفر کے دوران غائب ہوگئے ہیں، کی تلاش ضروری ہے۔ اس چلینج میں اگر میری جان بھی چلی جائے تو سودا مہنگا نہیں ہے، ویسے بھی لوگوں کے چلے جانے سے ارادے ختم نہیں ہوتے''۔

اپنی ٹیم کے ساتھیوں سے صلاح مشورے کے بعد بالآخر وہ تمام سہولتیوں سے لیس جدید ترین خلائی جہاز میں بیٹھ کر سفر پر روانہ ہوگیا اور اپنے سفر کی پل پل کی خبریں اور تصویریں اپنے تحقیقاتی مرکز کو بھیجتا رہا۔ اس دوران اچانک اس نے عجیب قسم کا خوف ناک شور سنا جیسے ہزاروں مرد و زن ایک ساتھ چیختے، چلاتے اور رو رہے ہوں۔ اس نے جاننے کی بہت کوشش کی کہ اس ویرانے میں یہ شور کہاں سے اٹھ رہا ہے؟ لیکن اسے کوئی سراغ نہیں ملا۔ اسی لمحہ اس نے سمندر کی طرف نظر ڈالی تو سمندر کے ایک حصے کا پانی بالکل سفید تھا اور ایک بہت بڑی غار نما جگہ سے آگ کے بھیانک شعلے بلند ہو رہے تھے۔ یوں تو وہ ایک مضبوط دل کا انسان تھا لیکن یہ مناظر دیکھ کر اس پر خوف اور گھبراہٹ طاری ہوگئی اور جسم سے ٹھنڈے پسینے کے قطرے چھوٹنے لگے کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سفر کے دوران جہاز اور کشتیاں مسافروں سمیت غائب ہو جاتی ہیں اور پھر ان کا کوئی بھی اتہ پتہ نہیں چلتا۔ اس نے خود کو خطرے میں محسوس کرتے ہوئے اپنے ادارے کو ساری صورت حال سے واقف کرانے کے لئے پیغام بھیجنا چاہا لیکن حیرت انگیز طور پر اس کے جہاز میں

نصب مواصلاتی نظام کے ساتھ ساتھ اس کی گھڑی اور کیمرہ نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے خوف میں تب اور اضافہ ہوا جب اچانک اس کی خلائی جہاز کو تیز آندھی اور چمکدار بادلوں نے گھیر لیا لیکن خوف کے باوجود اس کے حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی اور اس نے خلاء کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔ وہ خلاء میں اُڑان بھرتے ہوئے بہت دور پہنچ گیا تھا کہ دفعتاً اس کی خلائی جہاز کو چند اُڑن طشتریوں نے گھیر لیا جن کے پائیلٹ خوفناک انداز میں اسے گھور رہے تھے اور اشاروں سے جہاز کا رخ موڑنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ ان کے اشاروں کو نظر انداز کرتا رہا لیکن آخران کے تیور دیکھ کر اس نے جہاز کا رُخ موڑا اور ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے نقش راہ کے مخالف سمت اپنا سفر جاری رکھا۔ اب اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ بھی اس طرف سفر کرنے والے غائب ہو چکے ان سینکڑوں لوگوں کی طرح اغوا ہو چکا ہے۔ اس کے اندازے کے مطابق بیسوں گھنٹوں کے سفر کے بعد اسے ایک جگہ، جو ایک نئی ہی دنیا تھی، ایک صاف وشفاف کھلے میدان میں، جہاں رنگا رنگ پانی کی نہریں بہتی تھیں، خلائی جہاز اتارنے کی ہدایت دی گئی اور جہاز سے نیچے آتے ہی اس کو ہتھیاروں سے لیس ایک نئی ہی مخلوق کے لوگوں نے گھیر لیا جنہیں دیکھ کر اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہی خلائی مخلوق (ایلین) ہے۔ اس کے دل میں ایک طرف جہاں یہ خوشی تھی کہ برسوں بعد خلائی مخلوق سے رابطے کی اس کی کوششیں رنگ لانے والی ہیں وہیں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے بھی جنم لے رہے تھے کہ نہ جانے یہ اجنبی مخلوق اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی، واپس زمین پر جانا اس کے نصیب میں ہوگا بھی کہ نہیں۔ جامہ تلاشی کے بعد اسے پاس ہی واقع ایک عمارت میں لے جایا گیا اور پوچھ تاچھ شروع کی گئی۔ اس نے بغیر کسی لگی لپٹی کے اپنے مشن کے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتایا، بہر حال کئی گھنٹوں کی سخت پوچھ تاچھ کے بعد بغیر کوئی اذیت پہنچائے اسے وہاں سے واپس نکالا گیا اور آرام دہ سواری میں بٹھا کر پاس ہی واقع ایک عالیشان خوب صورت محل تک پہنچایا گیا جو ٹمٹماتی روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا اور وہاں بھینی بھینی خوشبو کی فوار سی برس رہی تھی۔ کچھ لمحے صحن میں انتظار کرنے کے بعد اس کو محل خانے کے اندر لے جایا گیا جہاں تخت پر براجمان ایک پر

وقار حسینہ، جس پر سپیدہ سحر کا ہالہ چھایا ہوا تھا، وہاں موجود بیسوں درباریوں سے محوِ گفتگو تھی، اس کے اندر جاتے ہی سارے درباری اس کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے اور ملکہ شریں لہجے میں گویا ہوئی......

''خوش آمدید...اے اولادِ آدم''۔

''بہت بہت شکریہ ملکہ صاحبہ''۔

اس نے ہاتھ جوڑ کر ملکہ کا شکریہ ادا کیا۔

''آپ ڈینجررڑ زون کی طرف کس مقصد سے جا رہے تھے؟''

''ملکہ صاحبہ....وہ....دراصل مجھے.....''۔

اس سے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا کیوں کہ ڈینجر زون کے بارے میں اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا اور تھوڑی دیر پہلے ہوئی پوچھ تاچھ کے دوران ان ہی کی وساطت سے وہ اس بارے میں جان چکا تھا۔

''شکر کرو کہ ہمارے سرحدی محافظوں سے آپ کو وہاں جانے سے روکا، جہاں جانے والے کبھی واپس نہیں لوٹتے۔ آپ زمین والوں کا یہ المیہ ہے کہ آپ کارخانہ قدرت میں بے جا مداخلت کر کے اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہے ہو''۔

اسے جب کوئی جواب نہیں بن پایا تو ملکہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور اپنا کلام جاری رکھتے ہوئے حکم صادر فرمایا۔

'' اس خاص مہمان کو عزت و توقیر کے ساتھ مہمان خانے میں ٹھہرایا جائے، خیال رہے کہ اسے کوئی پریشانی نہ ہو''۔

اسے مہمان خانے میں لے جایا گیا جہاں اس کی خدمت کے لئے کئی خادم موجود تھے، جنہوں نے اس کی خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ انتہائی لذیذ پھل، مشروبات اور دیگر انواع قسم کی غذائیں لا کر اس کے سامنے رکھی گئیں۔ اسے چونکہ بہت بھوک لگی تھی سو اس نے بھی خوب پیٹ بھر کے کھا لیا اور تھکان دور کرنے کے لئے وہاں موجود انتہائی خوبصورت پلنگ پر بچھے نرم و گداز بستر پر لیٹتے ہی نیند کی میٹھی آغوش میں چلا گیا۔ نہ جانے

کتنی دیر تک محو آرام رہنے کے بعد جب وہ جاگا تو سب کچھ ویسا ہی تھا، یعنی دن اور رات کا وہاں کوئی تصور نہیں تھا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کا جائزہ لینے کے بعد اس نے نہانے کی خواہش کا اظہار کیا تو ایک خادم اسے مہمان خانے کے اندر ہی موجود سوئیمنگ پُول تک لے گیا، نہانے کے بعد جب وہ واپس آیا تو خادموں نے اس کے سامنے انتہائی لذیذ قہوہ پیش کیا۔ قہوہ نوش کرنے کے بعد اس نے ملکہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ایک خادم نے اس کی یہ خواہش ملکہ تک پہنچادی اور کچھ دیر بعد ہی اسے ملکہ کے سامنے پیش کیا گیا۔

''اے اولاد آدم......کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

ملکہ نے انتہائی مشفقانہ لہجے میں پوچھا۔

اس نے اپنا تعارف دینے کے بعد اپنے مشن کے بارے میں بتانے کے ساتھ ساتھ اہل زمین کی ترقی کے بارے میں بھی تفصیل سے جانکاری دی اور زمین والوں کی اس خواہش کا اظہار کیا کہ زمین والے آپ کی دنیا کے ساتھ اچھے تعلقات اور رشتے قائیم کرنا چاہتے ہیں۔

''اولاد آدم......ہمیں زمین پر رونما ہونے والے واقعات کی پل پل کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ اہل زمین کے ترقی کے سارے دعوے کھوکھلے ہیں۔ وسائل کے فراوانی کے باوجود وہاں بھوک ہے، غربت ہے اور اولاد آدم کی خود غرضیوں کے سبب فتنے فساد اور خون ریزی کے بے شمار واقعات رونما ہو رہے ہیں......سائینس کی ترقی بھلائی سے زیادہ انسانوں کو نقصان پہنچا رہی ہے......قدرت کا شاہکار سیارہ زمین ابن آدم کے خون سے ہی لالہ زار ہو رہا ہے''۔

ملکہ نے بے رخی سے جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ ملکہ کی باتیں پگھلا ہوا سیسہ بن کر اس کے کانوں میں اتر گیئں۔ خفت اور خجالت سے اس کا وجود گندی نالی میں پڑی ہوئی اوجڑی کی طرح سڑنے لگا۔

''ملکہ کا اقبال بلند ہو......آپ نے میرے سوال کا پورا جواب نہیں دیا''۔

کچھ دیر انتظار کے بعد وہ ملکہ سے مخاطب ہوا۔

''کوئلے کی کان میں ایک بار بھی جانے والوں کے مُنہ اور ہاتھ کالے ہو کے ہی

رہتے ہیں''۔

''ملکہ صاحبہ......میں کچھ سمجھا نہیں؟''

''آپ زمین والوں تک ہمارا یہ پیغام پہنچادو کہ جب تک وہاں امن و امان، آپسی بھائی چارہ، محبت، انصاف اور سچائی کا پرچم بلند نہیں ہوگا تب تک ہم یہاں کے قانون کے مطابق زمین والوں سے کوئی بھی تعلق یا رشتہ قائیم نہیں کر سکتے۔آپ جب تک چاہو ہمارے مہمان بن کر رہ سکتے ہو''۔

ملکہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا اور اسے واپس مہمان خانے میں لے جایا گیا، جہاں کچھ دیر سنجیدگی سے غور فکر کرنے کے بعد اس نے واپس اپنے سیارے پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ملکہ سے اجازت لے کر کچھ لوگوں نے اسے اس کی خلائی جہاز تک پہنچایا اور اڑن طشتریوں میں سوار ہو کر اپنی نگرانی میں اس کو اپنے سیارے کے سرحد تک پہنچا کر واپس چلے گئے۔اسے اپنے مشن کی ناکامی کا سخت افسوس تھا اور وہ سوچوں کی بھول بھلیوں میں گم ہارے ہوئے جواری کی طرح زمین کی طرف واپس آنے لگا۔

''اہل زمین کے ترقی کے سارے دعوے کھوکھلے ہیں ......قدرت کا شاہکار سیارہ زمین ابن آدم کے خون سے ہی لالہ زار ہو رہا ہے........''۔

ملکہ کے کہے ہوئے یہ الفاظ اذیت بن کر اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔کچھ دیر بعد ہی وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں ایک راستہ ڈینجر زون کی اور دوسرا زمین کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے زمین کی طرف ایک بھرپور نفرت بھری نظر دوڑائی اور عالم یاس و اضطراب میں اچانک خلائی جہاز کا رخ ڈینجر زون کی طرف موڑ دیا۔

☆☆☆

پردیسی

''تلہا......کیا نظارے دیکھ رہے ہو؟''

''نظارے نہیں سر......لڑائی دیکھ رہا ہوں''۔

''یہ لڑائی تو روز کی بات ہے، اس سیارے کی یہی ایک عجیب مخلوق ہے جو بہت ذہین بھی ہے لیکن آپس میں نہ صرف بہت زیادہ لڑتے ہیں بلکہ مرتے اور مارتے بھی ہیں جب کہ باقی سارے جاندار پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ اینی وے تم اپنے تمبو کی نگرانی ٹھیک سے کراؤ، مجھے بہت کام کرنا ہے......''۔

مسٹر ڈچ، جسے خون ریز لڑائیوں سے گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی، نے تلہا کو ہدایات دیں اور کچھ دیر تک گہرائی سے اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد خیمے میں اپنی نشت پر بیٹھ کر کام میں منہمک ہو گیا۔

''آخر یہ معمہ کیا ہے؟ جسے میں اتنے دنوں سے سمجھ نہیں پا رہا ہوں''۔

کچھ دیر تک سامنے پڑے کاغذات کے ساتھ اُلجھے رہنے کے بعد وہ خود سے بڑ بڑایا اور آنکھیں بند کر کے اپنے مشن کے بارے میں سوچنے لگا......

مسٹر ڈچ کسی دوسرے سیارے کا ایک قابل اور تجربہ کار سائینس دان تھا جو اپنی ٹیم کے ہمراہ زمین پر ایک خاص مشن پر آیا تھا۔ دراصل زمین پر آباد ایک خاص مخلوق کی طرف سے ان کے سیارے کے بار بار چکر لگانے کے پس منظر میں وہاں کے حکام نے اس کو زمین کے حالات و واقعات اور یہاں گزر بسر کر رہے مخلوقات کی طرز زندگی کے بارے

میں مکمل معلومات حاصل کرنے کی غرض سے بھیجا تھا تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ زمین کے باشندوں کی طرف سے ان کے سیارے کو کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔ وہ کئی ہفتوں سے خفیہ طور پر زمین پر مقیم اپنی ٹیم کے ہمراہ زمین پر آباد مخلوقات کی طرز زندگی، رہن سہن اور حرکات و سکنات کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کرتا رہا۔ دیگر جانداروں جیسے جانور، چرند، پرند، جنیات وغیرہ، جن کی زندگی گزارنے کے لئے اس سیارے کا ماحول انتہائی موافق دکھائی دے رہا تھا اور جو نہایت پرسکون انداز میں اپنے شب و روز گزار رہے تھے، کو سمجھنے میں اسے زیادہ اُلجھنوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لیکن اپنے آپ کو زمین کا بادشاہ کہنے والے آدم زاد کے بارے میں اس کے دل میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ اس سیارے کی دو پاؤں پر چلنے والی یہ مخلوق دوسرے جانداروں کے مقابلے میں انتہائی نازک مزاج اور آرام طلب ہے جب کہ یہاں کا ماحول ان کے رہنے بسنے کے لئے کسی بھی طور موافق نہیں ہے۔ بہت زیادہ ذہین ہونے کے سبب یہ یہاں کے ماحول کو اپنی زندگی کے موافق بنانے اور زندگی کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور پرسکون بنانے کے لئے بے شمار جتن کر رہے ہیں۔ سائینس کی ترقی کی بدولت نئے نئے ایجادات کر رہے ہیں لیکن ان کے مسائل ہیں کہ روز بروز بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ اس سیارے کے موسمی حالات بھی ان کے لئے موافق نہیں ہیں وقت وقت پر پڑنے والی سردی اور گرمی کا مقابلہ کرنے کے لئے طرح طرح کے مصنوی انتظامات کے باوجود یہ مختلف امراض کا شکار ہو جاتے ہیں جب کہ بارشیں اور برف باری بھی ان کی زندگی میں بے شمار مشکلات پیدا کر دیتی ہیں۔ یہ اس سیارے کی واحد مخلوق ہے جنہیں رہنے کے لئے گھر تعمیر کرنے پڑتے ہیں اور سونے کے لئے نرم و گداز بستروں وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے جب کہ غذائی اجناس حاصل کرنے کے لئے کافی مشقت اور انہیں کھانے سے پہلے کئی مراحل سے گزارنا پڑتا ہے تب جا کے یہ ان کے نظام ہاضمہ کے موافق بن جاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہاں موجود دوسرے جانداروں کو رہنے کے لئے نہ ہی گھر تعمیر کرنے پڑتے ہیں اور نہ ہی اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے کوئی مشقت کرنی پڑتی ہے۔ وہ سب یہاں موجود قدرتی غذاؤں کا جوں کا توں استعمال کرتے

ہیں۔ یہ واحد مخلوق ہے جسے بیمار ہونے کے بعد دوبارہ صحت یاب ہونے کے لئے دوائیوں کی ضرورت پڑتی ہے جو انہوں نے خود ایجاد کئے ہیں، لیکن یہاں موجود دیگر جانداروں کی وقتی اور عارضی بیماریاں بغیر کسی دوا کے خود بخود ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازین اس مخلوق کو ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے کے لئے مختلف قسم کے ذرائع کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔

غرض اس سیارے کا ماحول یہاں موجود دوسرے جانداروں کے مقابلے میں اگرچہ ان کی زندگی گزارنے کے لئے کسی بھی طور موافق نہیں ہے، لیکن یہ اپنی زندگی کو اپنی نازک مزاجی کے مطابق زیادہ سے زیادہ آرام دہ بنانے کے لئے دن رات سرگرداں رہتے ہیں.......

''کسی سیارے کے اصل باسیوں کو اتنے ناموافق حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے، جیسے اس سیارے پر گزر بسر کر رہے دوسرے جاندار! پھر یہ دو ٹانگوں والی ذہین اور طاقت ور مخلوق......؟؟؟''

''سر......آپ اپنے اپ سے کیا باتیں کر رہے ہیں''۔

مسٹر ڈچ سوچوں میں غلطاں و پیچاں خود سے بڑ بڑا رہا تھا کہ دفعتاً ماہی کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''ارے ماہی......تم کب آئی، کوئی خاص بات؟''

''یس سر......آج میں نے ایک خاص بات یہ نوٹ کر لی کہ اس دو ٹانگوں والی مخلوق پر اکثر بلا وجہ اس طرح اُداسی طاری ہوتی ہے جیسے اپنے گھر سے ہزاروں میل دور کسی مسافر پر ہوتی ہے اور دوسری بات یہ کہ یہ مخلوق مختلف طریقوں سے کسی کی پوجا بھی کرتی ہے......''۔

''کیا کہا......''۔

''سر......''۔

ماہی نے کچھ کہنا چاہا تو ڈچ نے اس کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا، کیوں کہ دفعتاً مشن کے حوالے سے اس کی دماغ کی تاریخ سرنگ میں روشنی کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے اور کچھ دیر قلم سے سر کھجاتے ہوئے سوچوں کی بھول بھلیوں میں کھوئے

رہنے کے بعد وہ مسرت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

''وری گڑ ماہی ...... تم نے ایک بہت قیمتی راز کو جانا ہے جسے ہمیں مشن کی کامیابی میں بہت مدد ملے گی''۔

''وہ کیسے سر......''۔

''فی الحال تم اپنا کام کرو...... بعد میں سب بتادوں گا......''۔

ڈچ کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک عود آئی، اس نے ایک موٹی سی کتاب کھولی اور اسے پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔ دیر رات تک مطالعے میں غرق رہنے کے بعد وہیں ٹیک لگا کر سو گیا اور صبح پو پھٹتے ہی روپ بدل کر مشاہدے کے لئے ایک بار پھر، ماہی، جو اس کی خاص معاون تھی کے ساتھ دھرتی کی سیر کو نکل گیا۔ انہوں نے مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا اور ان مذاہب کے پیروکاروں سے بات بھی کی۔ کافی دیر تک دھرتی کی سیر کرنے کے بعد واپس اپنے ٹھکانے طرف لوٹ گئے۔

''ماہی...... تمہیں لگتا ہے کہ اس سیارے کی یہ طاقت ور مخلوق اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور پرسکون بنانے کے لئے کافی ہاتھ پیر مار رہی ہے اور انہوں نے اس حوالے سے بہت سے معرکے بھی سر کئے ہیں؟''

دیر رات تک کام میں مصروف رہنے کے بعد ڈچ ماہی سے مخاطب ہوا۔

''یس سر..... میں اس بات سے بالکل متفق ہوں، اس حوالے سے یہ آپس میں لڑنے اور ایک دوسرے کا خون بہانے سے بھی نہیں چوکتے ہیں۔

''کیا تم بتا سکتی ہو کہ ایسا کیوں ہے؟''

''یہی تو ایک معمہ ہے سر...... اوپر سے اب اس پردیس میں دل بھی نہیں لگتا''۔

ہمت نہ ہارو ماہی...... یہاں پردیسی صرف ہم ہی نہیں بلکہ ایک دوسری مخلوق بھی ہے۔ بہر حال تمہارے لئے اچھی خبر یہ ہے کہ یہ معمہ حل ہو گیا، ہمارا مشن کامیاب ہو گیا اور اب واپس اپنے سیارے پر لوٹنے کی تیاری کر لو''۔

''جو حکم سر ...... لیکن کیا میں مشن کی کامیابی کے بارے میں جان سکتی ہوں؟''

ماہی نے فرطِ نشاط و انبساط میں جھومتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... ہاں......کیوں نہیں، تمہیں ہی تو یہ رپورٹ فائنل کرنا ہے۔ یہ ہے ہمارے مشن کی عبوری رپورٹ"۔

ڈچ نے ایک فائل ماہی کی اور بڑھاتے ہوئے کہا اور وہ فائل پڑھنے میں مصروف ہوگئی......جس کا لب لباب کچھ اس طرح تھا۔

"ہر زاویے سے گہری تحقیق کے بعد یہ ٹیم اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ دو ٹانگوں پر چلنے والی آدم زاد نامی یہ مخلوق اس سیارے کی اصل نہیں بلکہ پردیسی مخلوق ہے، کیوں کہ ٹھوس شواہد کے مطابق اس مخلوق کی تخلیق کسی اور، ہر سہولیت سے مزین نرم و نازک ماحول والے آرام دہ، سیارے پر ہوئی ہے، لیکن کسی غلطی کے سبب اپنی اس شاہکار تخلیق کو تخلیق کار، جو کوئی بہت ہی طاقت ور ہستی ہے اور جس کے تابع تمام سیارے بھی ہیں، نے اس مخلوق کو اُس پر سکون سیارے سے نکال کر اس جیل نما سیارے پر پھینک دیا ہے تاکہ سزا کی زندگی گزار کر یہ واپس اپنے اصلی ٹھکانے پر آجائیں۔ جہاں کا ماحول ان کی نازک مزاجی کے عین مطابق ان کی زندگی گزارنے کے لئے موافق ہے اور جہاں بغیر کسی محنت اور مشقت کے عیش و عشرت کی ہر سہولیت میسر ہوگی، لیکن ان میں سے زیادہ تر اپنے اصل ٹھکانے پر واپسی کو بھول کر اس کوئلے کے بازار کے مانند سیارے پر ہی عطر کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں اور کبھی کبھی سکون کی تلاش میں بھٹکتے ہمارے سیارے کا رخ کرتے ہیں"۔

☆☆☆

شکور بھنگی

قرعہ اندازی میں شکور بھنگی کے نام کی پرچی نکلتے ہی نتیجے کے انتظار میں دل تھام کے بیٹھے مل کے مزدوروں میں ہل چل مچ گئی اور وہ مایوسی کے عالم میں اس کی نکتہ چینی میں جٹ گئے۔

''واہ کیا زمانہ آ گیا ہے......جسے کلمہ یاد نہیں وہ حج پر جائے گا''۔

سلام الدین نے اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آج تو مجھے اپنے مالک پر بھی شک ہو رہا ہے، ورنہ ہر سال اسی بھنگی چرسی کا نام کیوں نکل آتا ہے''۔

انصار احمد، جو مل کی مسجد میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتا تھا، نے جھنجھلا کر کہا......

غرض جتنے مُنہ اتنی باتیں۔

''آپ لوگ خاموش ہو جائیں، قرعہ اندازی میں شکور کا نام نکل آیا ہے، ہم اسی کو حج پر بھیجیں گے''۔

مل کے مالک احسان احمد نے ذرا سخت لہجے میں کہا تب جا کر مزدور خاموش ہو گئے۔ شکور، جو ساری صورتحال سے بے خبر مل کے صحن کے کسی کونے میں چھپ کر چرس پی رہا تھا، کو بلا کر جب یہ خبر دی گئی تو وہ کانپ اٹھا۔

''نہیں جناب......مجھے معاف کیجئے، میں نہیں جا سکوں گا''۔

اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ احسان احمد نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ تیار نہ ہوا اور فیصلہ یہ ہوا کہ نئے سرے سے قرعہ اندازی کی جائے۔ قرعہ اندازی ہوئی اور اس بار بھی شکور کا ہی نام نکل آیا لیکن اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ احسان احمد اور چند ساتھیوں نے اسے بہت سمجھایا کہ ایسے موقعے بار بار نہیں آتے ہیں لیکن وہ ہرگز بھی حج پر جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔

''ارے یہ بے چارہ کیا جائے گا......اسے تو ٹھیک سے نماز بھی نہیں آتی ہے''۔

انصار احمد نے اس پر طنز کرتے ہوئے کہا۔ تیسری مرتبہ قرعہ اندازی ہوئی اس بار غفور کے نام کے بدلے ایک خالی پرچی ڈالی گئی لیکن اللہ کا کرنا تھا کہ اس بار وہی خالی پرچی نکلی اور شکور یہ دیکھ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا کیوں کہ حج کا نام سنتے ہی وہ نہ جانے کیوں لرز اٹھتا تھا۔ مزدور نئے سرے سے قرعہ اندازی کرنے پر اصرار کرنے لگے کیوں کہ ہر مسلمان کی طرح ان کے دلوں میں بھی اللہ کے گھر کا دیدار اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری کا شوق مچلتا تھا۔

''اب آپ لوگ اپنے اپنے کام پر جائیے......اس سال شکور ہی حج پر جائے گا''۔

احسان احمد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور اپنے دفتر میں جا کر آرام دہ کرسی پر بیٹھے سوچوں میں گم ہو گیا۔ احسان احمد ہر سال اپنی مل کے ایک ملازم کو حج پر بھیجتا تھا اور اس ملازم کا انتخاب قرعہ اندازی کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ پچھلے سال بھی قرعہ اندازی میں شکور کا ہی نام نکل آیا تھا لیکن تب بھی وہ جانے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوا اور دوسری بار قرعہ اندازی کر کے کسی دوسرے ملازم کا نام نکل آیا تھا۔

شکور، جس کو مل کے سارے ملازم بھنگی کے نام سے پکارتے تھے، ایک الگ ہی قسم کے مزاج کا بندہ تھا۔ ہر وقت پھٹے پرانے میلے کپڑوں میں ملبوس رہتا تھا، اس کے اُلجھے ہوئے بے ترتیب لمبے بالوں اور داڑھی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ کوئی ملنگ ہے۔ وہ بھلا کا کام چور، دھوکے باز، سست اور کاہل انسان تھا۔ کبھی کبھی مل سے گندم اور آٹا چوری کر کے بیچ دیتا تھا، اسے زندگی میں کسی نے کبھی مسجد جاتے ہوئے یا نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور نہ کوئی

نیک کام کرتے ہوئے۔ وہ سگریٹ پہ سگریٹ پھونکنے کے ساتھ ساتھ چرس بھی پیتا تھا۔ اس کی مالی حالت قابل رحم تھی اور ہر وقت قرض میں ڈوبا رہتا تھا۔ احسان احمد نے کئی بار اسے نوکری سے نکالنے کا من بنالیا تھا لیکن اس کے والد صاحب کی نصیحت آڑھے آتی تھی جس نے مرنے سے پہلے اسے تاکید کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد کسی ملازم کو نوکری سے نہیں نکالنا۔ قرعہ اندازی میں بار بار شکور کا نام نکل آنے پر احسان احمد کے دل میں یہ بات گھر کر گئی کہ اللہ تبارک تعالیٰ شکور کو ہر صورت میں حج کرانا چاہتا ہے اور وہ اس کو راضی کرنے کے لئے دیر تک ترکیبیں سوچتا رہا۔ آخر اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی، اسنے شکور کو دفتر میں بھلا کر حج پر جانے کی صورت میں ایک سال کا اضافی تنخواہ دینے کی پیش کش کی۔ ایک سال کے اضافی تنخواہ کا سنتے ہی شکور مخمصے میں پڑ گیا اور کچھ دیر سوچ بچار کرنے کے بعد آخر لالچ میں آ کر اس شرط پر حج بیت اللہ پر جانے کے لئے راضی ہو گیا کہ اضافی تنخواہ پیشگی ادا کی جائے، جس پر احسان احمد راضی ہو گیا اور اس نے مل میں امامت کے فرائض انجام دینے والے انصار احمد کو بلا کر شکور کو نماز کا طریقہ، حج کے ارکان سکھانے اور دعائیں یاد کرنے کے کام پر معمور کر دیا۔ شکور نے بھی چرس اور دیگر خرافات چھوڑ کر سیکھنے میں بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور مکمل تربیت کے بعد وقت مقررہ پر حج کے لئے روانہ ہو گیا......

احسان احمد کے دل میں اکثر یہ خیال آتا تھا کہ اتنے نیک اور عابد مزدوروں کے ہوتے ہوئے مالک دو جہاں نے حج کے لئے شکور کا ہی انتخاب کیوں فرمایا؟ ضرور اس میں کچھ راز ہوگا لیکن کافی کوشش کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ایک دن وہ شکور کے اہل عیال کی خیر عافیت دریافت کرنے کے لئے اس کے گھر گیا۔ وہاں بھی اسے یہی خیال آیا تو باتوں ہی باتوں میں اس نے شکور کی زوجہ سے شکور کی اس خوش بختی کے بارے میں پوچھا تو اس نے یوں جواب دیا۔

''میرے شوہر میں کوئی خاص خوبی نہیں تھی، نہ وہ اللہ کی عبادت کرتا تھا اور نہ ہی اسنے کوئی قابل ذکر نیکی کی تھی۔ باقی اس کی عادتوں سے تو آپ اچھی طرح واقف ہیں...... ہاں ایک بات ہے جسے شکور اور میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے''۔

’’وہ کیا......؟‘‘

’’ہمارے محلے میں ایک پاکدامن، خوبصورت جوان بیوہ رہتی ہے، جس پر محلے کے تمام لوفر اور آوارہ قسم کے مرد بری نظر ڈالتے تھے۔ اس کی دو چھوٹی چھوٹی بیٹیاں بھی ہیں۔ اپنی بیٹیوں کے پڑھائی کا خرچہ اور دیگر ضروریات کے لئے وہ لوگوں کے گھروں میں کام کرنے جاتی تھی لیکن سیاہ دل کمینے لوگ وہاں بھی اس کو بھوکی نظروں سے دیکھتے اور اس کی عزت پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے، کوئی اس کو اپنے جال میں پھانسنے کے لئے خوشامدی اور چاپلوسی کے ہنر آزماتا تھا تو کوئی ہمدردی کے پردے میں اس کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جس وجہ سے وہ ہر بار اپنی عزت بچانے کے لئے کام چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ معاشرے کی اس کج ادائی کی وجہ سے آخر اس نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا اور پائی پائی کی محتاج ہوگئی جس وجہ سے اکثر ان کا چولہا بھی نہیں جلتا اور اس کی بچیوں کی تعلیم بھی چھوٹ گئی۔ ایک دن میں نے اس کا ذکر شکور سے کیا تو......‘‘۔

کہتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

’’پھر کیا ہوا؟‘‘

احسان احمد نے بے تابی سے پوچھا۔

’’کل یوگ کے اس زمانے میں انسانیت کہاں ہے، بھوک اور افلاس کے بازار میں جسم اور جنس ایک ہی باؤ بکتا ہے‘‘۔

’’شکور نے کہا اور سخت غمزدہ ہو کر رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح سویرے ہی اس نے مل کے منیجر سے کچھ روپے پیشگی لئے اور کچھ قرض بھی اٹھا لایا اور اسی دن سے اس بیوہ کی مدد کرنی شروع کردی۔ اس کی دونوں بچیوں کو سکول میں داخل کرایا۔ تب سے وہ لوگوں سے قرض لے کر، مل سے چوری کر کے مسلسل ان بچیوں کی تعلیم اور گھر کے دیگر اخراجات پورے کرتا تھا۔ غرض وہ فرشتہ رحمت بن کر تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح اس کی زندگی میں آیا جیسے جھلستی دھوپ میں بارش کا قطرہ۔ وہ ہر ہفتے چپ کے سے شام دیر گئے ان کے لئے راشن اور دیگر ضروری چیزیں لے کر ان کے گھر جاتا تھا، لیکن اس نے کبھی

اس کے گھر کی دہلیز پار نہیں کی تھی۔ وہ سامان باہر رکھ کر اس بیوہ کو بلاتا تھا اور کبھی اس کی طرف نظر بھی نہیں اٹھاتا تھا۔ کئی بار میں بھی اس کے ساتھ وہاں گئی اور میں نے دیکھا کہ وہ بیوہ سامان اٹھاتے وقت ہمیشہ نم آنکھوں سے گلوگیر لہجے میں اسے بے شمار دعائیں دیتی تھی اور اکثر کہتی تھی''۔

''جا میرے بھائی، میرے مددگار...... اللہ تمہیں حج کی سعادت نصیب فرمائے اور تمہارا خاتمہ ایمان پر کردے''۔

پچھلے سال بھی آپ نے اس کو حج پر جانے کی پیشکش کی تھی لیکن اس نے یہی سوچ کر انکار کردیا کہ اگر میں حج پر چلا گیا تو وہ بے چاری بے آسرا ہوجائے گی۔ اس بار وہ صرف اس وجہ سے حج پر جانے کے لئے راضی ہوگیا کہ آپ نے ایک سال کی اضافی تنخواہ جو اس کو دے دی وہ ساری رقم اس نے اسی بیوہ کو تھما دی تب جا کے اسے اطمینان ہوا۔

شکور کی اہلیہ کی زبانی یہ باتیں سن کر احسان احمد کو شکور پر رشک آنے لگا، شکور کے لئے دل میں بے حد احترام پیدا ہوگیا۔ بہر حال دن گزرتے رہے۔ شکور کے گھر والوں کے ساتھ ساتھ اس بیوہ اور احسان احمد کو بھی شکور کی واپسی کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ حج کے آخری دن دیر رات احسان احمد کا فون بج اٹھا۔ دوسری طرف شکور کے گروپ کا معلم لائین پر تھا جس نے یہ خبر دی کہ حج مکمل کر کے طواف وداع کے بعد عشا کی نماز ادا کر کے حرم پاک میں سجدے میں شکور احمد اللہ کو پیارے ہوگئے۔

''یا میرے مولیٰ...... مجھ گناہ گار کو بھی شکور احمد جیسی موت عطا فرماؤ''۔

احسان احمد کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

☆☆☆

زخمی دُلہن

قدرت کا کتنا انمول تحفہ ہے یہ، بے مثال کاریگری اور مصوری کا نادر شاہکار جس کے نام پر لاکھوں دل دھڑکتے ہیں۔ اگر وادی فردوس بریں ایک دلہن ہے تو یہ خوب صورت جھیل بلاشبہ اس دلہن کے ماتھے کا جھومر ہے۔ نہیں...... نہیں...... یہ پرکشش جھیل تو خود ایک دلہن کے مانند ہے، جس کے حسن و جمال اور دلکشی کا کوئی ثانی نہیں......

''بھائی صاحب...... آپ ذرا وہاں جا کر شکارہ روک لیجئے''۔

شکارے میں بیٹھا ڈل جھیل کی سیر کے دوران میں دل ہی دل میں قدرت کی اس بے مثال کاریگری کی داد دے رہا تھا کہ دفعتاً راجا، جو میرے ساتھ تھا، نے ڈل کے بیچوں بیچ ایک جزیرہ نما جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شکارے والے سے کہا جس نے بغیر کسی تامل کے وہاں جا کر شکارہ روکا اور ہم شکارے سے اتر کر اس دلکش جزیرہ نما جگہ پر بیٹھ کر ڈل جھیل کی سحر انگیز خوب صورتی سے لطف انداز ہونے لگے۔ دراصل آج بہت دنوں بعد ایک ادبی تقریب پر راجا سے ملاقات ہوئی تھی، چونکہ بہار اپنے جوبن پر تھا اس لئے ہم نے تقریب کے دوران ہی ڈل جھیل کی سیر کا پروگرام بنایا تھا اور تقریب ختم ہوتے ہی ہم سیر کے لئے نکلے۔ بہرحال کچھ دیر گپ شپ کرنے اور تصویریں کھینچنے کے بعد راجا خاموشی سے ایک جگہ بیٹھ گہرے سوچوں میں ڈوب گیا۔

''راجا صاحب...... کہاں کھو گئے آپ؟''

میں نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

’’طارق ...... کچھ دیر مجھے ڈسٹرب نہ کرو، جی بھر کے قدرت کے ان خوبصورت نظاروں سے لطف اندوز ہونے دو‘‘۔

اس نے سنجیدہ انداز میں کہا، اس کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں یہ سوچ کر، کہ مشہور کہانی کار راجا یوسف شاید کسی کہانی کا تانہ بانہ بن رہا ہے، خاموشی سے اٹھ کو ادھر اُدھر گھومتے ہوئے خوب صورت نظاروں میں کھو گیا۔ زبرون کی خوبصورت پہاڑیوں کی طرف ٹک ٹکی باندھے ڈل کنارے تعمیر ہوئے فلک بوس ہوٹل عمارتوں کو دیکھتے ہوئے میرے دل میں خیال آیا کہ کسی زمانے میں تخت سلیمان کی پہاڑی کی جھاڑیوں میں بسنے والے جانور ڈل کنارے اپنی پیاس بجھانے آتے تھے جواب ممکن نہیں رہا۔

’’یہ پانی اب ان کے استمال کے قابل بھی کہاں رہا‘‘۔

میرے اندر سے آواز آئی اور ڈل جھیل کی موجودہ صورتحال میرے ذہن کے پردوں پر گھومنے لگی۔ ان پانچ ستارہ ہوٹلوں، دلکش ہاوس بوٹوں اور نجی گھروں، جن میں مقامی آبادی کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں ملکی اور غیر ملکی سیاح ٹھہرتے ہیں، سے جتنا بھی کوڑا کرکٹ، فضلہ وغیرہ نکلتا ہے اسے اسی ڈل میں بہایا جاتا ہے.....لیکن مجھے اُسے کیا لینا دینا ہے میں نے ایک دم منفی سمجھ کر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور ارد گرد کے نظاروں میں کھو گیا۔ ڈل کے شفاف وگداز سینے پر کھلے ان گنت مسحور کن کنول کے پھول، مقامی اور غیر مقامی سیاحوں کی ایک کثیر تعداد، جن میں فرنگی بابو گوری میمیں اور دیگر رنگ ونسل کے مرد وزن اور بچے شامل تھے، اپنے روحوں کو سکون پہنچانے کے لئے مختلف اندازوں سے ڈل کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے میں محو تھے، جن کے سبب اس کی رونق دوبالا ہو جاتی تھی۔ کچھ دیر ادھر اُدھر گھومنے کے بعد مجھے تھکاوٹ سی محسوس ہوئی اور میں ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ راجا ابھی بھی سنجیدہ غور فکر میں محو تھا اس لئے میں نے اس کے سوچوں میں خلل ڈالنا مناسب نہیں سمجھا اور آنکھیں بند کر کے نہ کیا سوچنے لگا۔ دفعتاً ہوا کا ایک لطیف جھونکا آیا اور مجھے میرے انگ انگ میں راحت محسوس ہوئی......اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی دبے قدموں میرے قریب آ رہا ہے۔ ایک لمحہ بعد ہی میرے سامنے نہایت ہی حسین و

جمیل دلہن کا لباس زیب تن کئے ایک دوشیزہ کھڑی ہوگئی، جس کے بے مثال حسن کو دیکھ کر میں نہ صرف حیرت زدہ ہوگیا بلکہ میرے جسم سے پسینے چھوٹنے لگے۔اس کے وجود سے شبنم کی سے تازگی اور ستاروں کی سی پاکیزگی چھلکتی تھی ......آنکھوں میں نیلی نیلی جھیلوں کی اتھاہ گہرائیاں ڈوبی ہوئی اور بال بادلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے......اس کی آمد سے پورے ڈل جھیل پر قوس قزاح کے رنگ ایسے بھر گئے جیسے چاندنی نے ڈل میں چھلانگ لگادی ہو۔

''کیا ہو رہا ہے حضور......؟''

میں ابھی اپنے آپ کو سنبھال ہی رہا تھا کہ ایک خواب دیدہ آواز ترنم ریز ہوئی۔

''ک...ک...کچھ نہیں بس یوں ہی......''۔

میری زبان ایسے گھونگ ہو رہی تھی جیسے میری کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

''کہانی کار ہو؟''

''جی ہاں...... پر آپ کو کیسے معلوم؟''

''مجھے سب معلوم ہے......بہت سے کہانی کار، شعرا اور مصور یہاں آ کر لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔حبہ خاتوں اسی ڈل جھیل کو اپنا دکھڑا سناتی تھی ......مہجور اسی جھیل کی آغوش میں بیٹھ کر اپنے ہجر کی داستانیں دہراتا تھا......لل عارفہ کے واکھ یہی گنگنائے جاتے تھے......رسول میر اپنی محبوباؤں کی شکایت اسی ڈل سے کرتا تھا......آزاد اپنے پیار کے نغمے اسی ڈل کی گود میں بیٹھ کر ترتیب دیتا تھا......کلہن نے راج ترنگی اور زون راج نے جین راج ترنگی یہیں بیٹھ کر تالیف کی ہیں......بہارستان شاہی بھی یہی ایک ڈونگے میں لکھی گئی تھی......تاریخ دانوں جن میں عزت اللہ، پادری جیروم (Father Jerom) لارنس (Lawarance) کی تحریروں میں اسی ڈل کے وجود سے جوش پیدا ہوگیا اور جلا ملی۔اسی ڈل کی مجلس میں بیٹھ کر رشیوں، منیوں نے تپسیا کی، صوفیوں نے وضائف دہرائے، گوئیوں نے کویتائیں کہیں اور شعرا نے دل کے تاروں کو چھیڑنے والے رسیلے نغمے تخلیق کئے......''۔

''پر آپ ہو کون محترمہ؟''

وہ بغیر کسی توقف کے بے باک انداز میں بولے جا رہی تھی تو میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا کیوں کہ میں اس پراسرار حسینہ کے بارے میں جاننے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔

''بتاؤں گی.....آپ اتنے اتاولے کیوں ہو رہے ہو، پہلے پوری داستان تو سن لو''۔

اس نے ایک ادا سے کہا تو میرے دل و دماغ میں خوشیوں کے رباب بجنے لگے کیوں کہ میں کسی بھی قیمت پر اس خوب رو حسینہ سے شناسائی کرنا چاہتا تھا۔

اسی وقت کئی سے گانے کی سریلی، پر درد آوازیں آنے لگیں تو میں نے اُسے پوچھ لیا۔

''یہ گانے کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں''۔

''یہ آوازیں اسی دوشیزہ ڈل کے وجود سے آ رہی ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ پیار کرنے والے اس کے کانوں کے پاس سرگوشیاں کرتے ہیں، لڑکیاں گاتی ہیں، حوریں ناچتی ہیں، سہاگنیں اونچے گھنے چناروں کی چھاؤں میں اپنے پیار کا انتظار کرتی ہیں۔ پیار محبت کی کتنی داستانیں اس ڈل کی نظروں کے سامنے پروان چڑھتی ہیں اور کتنی دم توڑتی ہیں۔ یہ ڈل بے شمار رازوں کا امین ہے لیکن......؟''

کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر بیسوں چیچک کے داغ اور جسم کے کئی حصوں سے خون بہہ رہا تھا جسے دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ اس کے رنگین دیدہ زیب لباس کے نیچے زخموں سے چور بدن ڈھکا ہوا ہے۔

''الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟''

میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

''محترمہ......آپ کے چہرے پر یہ چیچک کے داغ اور جسم پر یہ زخم......''۔

''میری چھوڑو، آپ کو معلوم ہے کہ جس ڈل کی آغوش میں تم بیٹھے ہو اس کے خوب صورت چہرے پر کتنے چیچک کے داغ اور جسم پر کتنے گہرے زخم دیئے ہیں آپ لوگوں نے''۔

''اس نے اپنے لہجے میں برف کی سی کھنکی ڈال کر کہا''۔

''ہم نے؟؟؟''

''ہاں ہاں.....آپ نے''۔

اس نے چیخنے کے انداز میں کہا اور کچھ توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھی۔

''اگلے وقتوں میں اس ڈل کی خوب صورت جسم کی بے داغ چادر پچیس کلومیٹر تک پھیلی ہوئی تھی جسے مادیت اور حیوانیت کے ظالم پجاریوں نے ظلم و جبر کر کے نہ صرف داغدار کر دیا بلکہ کاٹ کاٹ کر بارہ کلومیٹر سے بھی کم کر دیا۔ اس جھیل کی شفاف وگداز سینے پر مونگ دلتے ہوئے اونچی اونچی عمارتیں، ہوٹل اور دیگر تجاوزات و تعمیرات کھڑی کر دی گئی۔ جتنی بھی گندگی ان ہوٹلوں ہاوس بوٹوں اور مکانوں سے نکلتی ہے اسے تلف نہیں کیا جاتا بلکہ بڑی بے دردی سے ڈل کے سینے پر تھونپ دیا جاتا ہے۔ جس وجہ سے اس عالمی شہرت یافتہ جھیل کو طرح طرح کی جان لیوا بیماریوں نے گھیر لیا اور یہ سکڑ کے رہ گیا۔ ہمدردی کے پردے میں دشمنی نبھانے والے ہمدرد، جو ڈل کی خوبصورتی کے گن گاتے اور اس کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے کے لئے بلند بانگ دعوے کرتے تھکتے نہیں، ان کی تان ہمیشہ اپنے تجوریاں بھرنے پر ہی ٹوٹتی ہے۔ وہ اپنے چوڑے جسموں کو صاف رکھتے ہیں لیکن ساری غلاظت کالک کی طرح اسی جھیل کے چہرے پر پوت دیتے ہیں۔ آپ سے بہتر تو سات سمندر پار کے غیر لوگ ہیں جنہیں اس جھیل سے جنون کی حد تک محبت ہے جو اس کو بچانا چاہتے ہیں اور از سر نو زندگی کی نعمتوں سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں......''۔

''محترمہ.....آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا، آخر آپ ہو کون؟''

میں نے پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

میرا سوال سن کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی لیکن یہ دلنواز مسکراہٹ، جس کے پردے میں ایک بے نام سا حزن و ملال پوشیدہ تھا، ایک پل بعد ہی غائب ہو گئی اور وہ سنجیدہ انداز میں گویا ہوئی۔

''میں کون ہوں؟.....آپ خود ہی سمجھ جاؤ گے۔ لیکن ایک بات غور سے سنو،

آپ لوگوں کی خود غرضیوں اور ناقدریوں سے مجھے اپنے مٹنے یا فنا ہونے کا غم نہیں لیکن جب مستقبل میں آنے والی نسلیں اور دنیا کے کونے کونے سے آنے والے سیاح لوگ میرے بارے میں پوچھیں گے تو آپ کیا جواب دو گے......؟''

کہتے ہوئے وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی، اس کی آنکھوں میں درد کا بیکراں سا اتر آیا اور موٹے موٹے آنسوں ایسے گرنے لگے جیسے پگھلتے ہوئے شمع سے موم کے گرم گرم قطرے تیز تیز قطار در قطار ٹپکتے ہیں۔

''آپ اپنے جذبات پر قابو رکھئے اور اپنی پوری کہانی اطمینان سے سنائیے''۔

اس کی اصلیت جان کر میرا تجسس بڑھ گیا۔

''میں کہانیاں سنتے اور سناتے بوڑھی ہو گئی ہوں لیکن یاد رکھنا میری کہانی کبھی بوڑھی یا پرانی نہیں ہوگی......''۔

کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں
ہزاروں ہیں شکوے میں کیا کیا بتاؤں

شعر کہتے ہوئے اس کے ہونٹ خشک ہو کر یوں پھڑ پھڑانے لگے جیسے شدید دمے میں مبتلا کوئی مریض بے بسی سے سسک سسک کر سانس لینے کے لئے تڑپتا ہے، کچھ لمحے اس حالت میں رہنے کے بعد دفعتاً اس کا وجود پگھل کر بوسیدہ ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل ہو گیا، اسی حالت میں وہ ایک دم اٹھی اور بے پروائی سے ڈل کی پانیوں کی طرف چلنے لگی، چند قدم چل کر اس کا ریزہ ریزہ وجود دھیرے دھیرے ڈل کے پانیوں میں تحلیل ہو گیا اور میں دیکھتا ہی رہ گیا......خفت اور خجالت کے سبب مجھے لگا کہ ڈل کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطے کھا رہا ہوں اور بے شمار سانپ اور بچھو میرے بدن پر رینگ رہے ہیں۔

''چلو شبنم ......دیر ہو گئی''۔

اسی لمحے راجا یوسف کی آواز سے میں چونک گیا اور ہم نے شکارے میں بیٹھ کر واپسی کی راہ لی۔

☆☆☆

سونے کا پیالہ

بستی سے بہت دور نکل کر جب میں ایک گھنے جنگل تک پہنچ گیا تو جنگل میں ایک جگہ میں نے صاف وشفاف نیلے پانی کی ایک خوب صورت جھیل دیکھی ۔ پانی دیکھ کر میں خوش ہوا اور جھیل کے میٹھے پانی سے اپنی پیاس بجھائی، ہاتھ مُنہ دھوکر اوپر والے کی بارگاہ میں گڑگڑاتے ہوئے اپنے دل کی مراد پوری ہونے کی دعا مانگی ۔ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے ستانے بیٹھ گیا اور سوکھی روٹی کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی۔

''یہ کیسی زندگی ہے؟ جہاں لوگ اپنے ہی گھروں میں قید ہو کر رہ گئے ہیں، جہاں انسان کو انسان سے ہی ڈر لگے، جہاں کوئی کسی کے گھر نہ جا سکے، کسی سے مل نہ سکے اور کسی کے دکھ سکھ میں شامل نہ ہو سکے، یہاں تک کہ اوپر والے کے گھر میں جا کر عبادت بھی نہ کر سکے ۔آخر خوف، ڈر، مار دھاڑ اور بے بسی کی اس آگ سے انسانوں کو کب اور کیسے خلاصی نصیب ہوگی؟''

''چھپاک......چھپاک......''۔

میں پریشان سوچوں کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا تو دفعتاً اس خاموش جھیل میں چھپاک کی زوردار آواز سے طلاطم برپا ہو گیا اور میں سوچوں کے خول سے باہر آکر جھیل کی طرف دیکھنے لگا۔چند لمحے بعد جھیل خاموش ہوگئی اور جھیل کے کنارے خوب صورت لباس میں ملبوس ایک باوقار حسینہ، جس کے چہرے سے شبنم کی سی تازگی اور ستاروں کی سی چمک تھی، کھڑی تھی ۔اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد وہ حسینہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتے میری

طرف بڑھنے لگی جس کے ساتھ ہی چار جانب عطر کی خوشبو پھیل گئی۔ یہ منظر دیکھتے ہوئے گھبراہٹ کے عالم میں میرے ذہن میں کئی طرح کے سوالات جنم لینے لگے......

''اے خدا کے بندے...... یہاں اس خوفناک جنگل میں کیا کر رہے ہو؟''

اسی لمحہ شہد سے بھی میٹھی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

''میں...میں...ایک مسافر ہوں اور یہاں کچھ دیر آرام کرنے بیٹھا ہوں''۔

میں نے ہمت جٹا کے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''تمہاری منزل کہاں ہے؟''

''میری منزل...وہ.....''۔

اس کے سوال کا مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا اور میری گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔

''گھبراؤ نہیں اے آدم زاد......میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی''۔

اس نے انتہائی شفقت بھرے لہجے میں کہا تو میری گھبراہٹ کسی حد تک دور ہو گئی ،میں نے اسے تفصیل سے اپنے حالات اور منزل کے بارے میں بتایا۔

''اووہ...... ''کل یگ'' کے آدم زاد کی پریشانیوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں ،لیکن......''۔

''لیکن کیا محترمہ......؟''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں ایک ایسی دنیا میں پہنچا سکتی ہوں جہاں کوئی پریشانی نہیں ہوگی اور سکون ہی سکون ہوگا ،لیکن بدلے میں تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا''۔

اس نے میرے سوال کو نظر انداز کر کے کچھ سوچتے ہوئے قدرے توقف کے بعد بتایا۔

''کون سا کام؟ اور آپ ہو کون؟''

''میں پریوں کے دیس کی شہزادی ہوں اور اس جنگل کے پیچھے ایک غار ہے ،جس میں ایک بدمست جن نے میری ایک سہیلی کو قید کر رکھا ہے، تمہیں پانی کا ایک پیالہ

میری سہیلی تک پہنچانا ہوگا''۔

''نہیں.......نہیں......یہ مجھ سے نہیں ہوگا، جن مجھے مار ڈالے گا''۔

میں خوف سے کانپنے لگا۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا کیوں کہ وہاں سے انسانوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور جنوں کی خاص نظر صرف ہم پر ہوتی ہے۔ خیر کوئی جلدی نہیں ہے، اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دے دینا''۔

کہتے ہوئے وہ غائب ہوگئی اور میں تذبذب میں پڑ گیا کہ کیا کروں۔ دراصل میں دنیا کے موجودہ پریشان کن حالات سے سخت بے چین اور خوفزدہ تھا اور بہت دنوں سے اوپر والے سے دعا مانگ رہا تھا کہ مجھے کسی ایسی جگہ پہنچا دے جہاں یہ خوف و ڈر، پریشانی، بے چینی اور بے یقینی نہ ہو۔ چین ہی چین اور سکون ہی سکون ہو۔ سکون کی تلاش میں میں نے کئی ملکوں کا سفر کر کے بیسوں شہر چھان مارے لیکن مایوسی اور نا امیدی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا اور آخر تنگ آ کر اس جنگل کی راہ لے لی۔ کچھ دیر سنجیدگی سے سوچنے کے بعد میرے دل و دماغ میں یہ خیال گھر کر گیا کہ شاید اوپر والے نے میری دعا قبول فرمائی اور اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے یہ وسیلہ فراہم کیا۔ میرا دماغ تیز رفتار موٹر کی پہیے کی طرح گھومنے لگا اور میں بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔

''تو کیا سوچا تم نے؟''

جلد ہی وہ واپس آ کر گویا ہوئی۔

''مجھے منظور ہے، لیکن میں آپ کی بات پر یقین کیسے کروں؟''

میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

''شاباش......''۔

اس نے متبسم ہونٹوں سے کہا اور آنکھیں بند کر کے کچھ منتر پڑا جس کے ساتھ ہی ایک خوب صورت تخت میرے سامنے آ گیا۔

''آنکھیں بند کر کے اس تخت پر بیٹھ جاؤ''۔

اس نے تخت پر بیٹھتے ہوئے کہا، میں بھی تخت پر بیٹھ گیا اور تخت ہوا میں اڑنے لگا......

''اب آنکھیں کھولو''۔

کئی گھنٹوں کی اڑان کے بعد اس نے کہا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو ایک سرسبز شاداب میدان میں پایا جہاں مختلف قسم کے بہت سے چوپائے چر رہے تھے۔

''یہی وہ دنیا ہے جس کی تمہیں تلاش تھی''۔

''لیکن، یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہ میں بعد میں بتاؤں گی، فی الحال اس دنیا کی سیر کرو، جب میری ضرورت پڑے تو اسی جگہ آ کر تین بار ''جل پری شوقی'' پکارنا، میں حاضر ہو جاؤں گی''۔

اس نے بستی کی طرف جانے والا راستہ دکھاتے ہوئے کہا اور تخت سمیت غائب ہوگئی۔ کچھ دیر اردگرد کا جائیزہ لینے کے بعد میں بستی کی طرف نکل پڑا اور بہت دور جا کر ایک کچی سڑک پر پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ سڑک پر گاڑیوں کے بجائے بیل گاڑیاں دوڑ رہیں تھیں وہ بھی بہت کم۔ سڑک کے دونوں اطراف بہت سے مرد وزن کھیت کھلیانوں میں بے فکر ہو کر کام میں مصروف تھے جنھوں نے نہ ہی ماسکیں لگائیں تھیں اور نہ ہی احتیاطی دوری کا کوئی خیال رکھا تھا۔ چلتے چلتے تھک ہار کر میں بستی میں پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں، جن کے چھتوں پر گھاس پھوس تھی، کی بستی تھی۔ کسی بھی مکان کے اردگرد دیوار بندی نہیں تھی، خواتین گھروں کے صحنوں میں چکیاں پیستی اور پتھروں سے بنے اوکھلوں میں کچھ کوٹتی تھیں۔ مرد بھی مختلف کاموں میں مصروف تھے جب کہ بغیر لباس کے بچے جگہ جگہ کھیل کود میں مگن تھے۔ یہاں کے لوگ کافی صحت مند ہٹے کٹے تھے، لیکن کسی نے بھی مناسب لباس نہیں پہنا تھا سب پھٹے پرانے بوسیدہ لباسوں میں ملبوس تھے بالکل قدیم انسانوں کی طرح۔ بستی میں بیچ بیچ میں مختلف قسم کے میووں سے لدے باغات تھے جنہیں دیکھ کر میرے مُنہ میں پانی بھر گیا۔ مجھے بھوک بھی لگی تھی اور وہاں مجھے کئی کوئی دکان نظر نہیں آئی، سو میں یہ سوچ کر ایک باغ، جہاں کچھ مویشی چر رہے تھے، میں ستانے بیٹھ گیا کہ

موقعہ پا کر دو تین سیب چبا ڈالوں۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر کا صحت مند شخص آیا تو میں نے اسے پوچھا۔

''بابا......یہ باغ آپ کا ہے؟''

''ہاں پتر......میرا ہی ہے، کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟''

اس نے سرتاپا میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''بابا......میں ایک مسافر ہوں، بہت بھوک لگی ہے کچھ سیب چاہیے کھانے کے لئے''۔

میں نے پچاس روپے کا نوٹ اس کی اور بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پتر......بھوک لگی ہے تو خود توڑ کر کھائے کیوں نہیں اور یہ کیا ہے؟''

اس نے نوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''روپے ہیں بابا''۔

اس نے نوٹ ہاتھ میں لیا اور کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد شان بے نیازی سے مجھے واپس کر کے ایک درخت سے پانچ چھ لال لال سیب توڑ کر میرے سامنے رکھے اور خود بھی ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے سیب کھانے بیٹھ گیا۔سیب انتہائی لذیذ تھے میں نے دو تین سیب کھائے اور یہ سوچنے لگا کی رات کہاں گزاروں۔

''چلو پتر......گھر چلتے ہیں''۔

اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''بابا......وقت کیا ہوا ہے''۔

''بیٹا......شام کا وقت قریب ہے''۔

اس نے سورج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے وقت دیکھنے کے لئے جیب سے موبائیل فون نکالا لیکن اس میں کوئی سگنل تھی اور نہ ہی گھڑی کام کر رہی تھی۔

''بابا......آپ کے پاس موبائیل ہے ایک فون کرنا تھا''۔

''موبائیل.....پتر ہ ہ کیا ہوتا ہے؟''

اس نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کپڑے کے بنے تھیلوں سے مویشیوں کے مُنہ ایسے ڈھانپنے لگا جیسے ہم ماسک پہنتے ہیں۔

''بابا......آپ ان کے مُنہ کیوں بند کر رہے ہو''۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پتر ...... یہ بے چارے ناسمجھ ہوتے ہیں اور راستے میں ادھر اُدھر مُنہ مار کر دوسروں کا حق کھاتے ہیں اسی لئے''۔

اس نے کہا اور ہم مویشیوں کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دیئے۔اس کا گھر مٹی سے بنے چھوٹے پانچ مکانوں پر مشتمل تھا، ایک طرف دس بارہ گھوڑے اور بیسوں چوپائے بندھے ہوئے تھے۔دوسری طرف پانچ چھ خواتین چرخہ کات رہی تھیں جب کہ چار خواتین پتھر کے بڑے اوکھلوں میں کچھ کوٹ رہیں تھیں۔ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ ایک بزرگ خاتون مٹی کے بنے بڑے گلاسوں میں لسی اور ایک ٹوکری میں بڑی بڑی روٹیاں لے کر آگئی۔بھوک کے باوجود میں آدھا گلاس لسی اور آدھی روٹی ہی کھا سکا جب کہ بابا نے پانچ چھ گلاس لسی کے ساتھ اتنی ہی روٹیاں بھی کھالیں۔اس دوران بابا مجھے افراد خانہ کا تعارف بھی کراتا رہا۔اس گھر میں بابا کے باپ، دادا، پڑدادا، بیٹوں، پوتے پوتیوں، پڑپوتے پڑپوتیوں سمیت چھ پیڑیوں پر مشتمل ستر سے زیادہ لوگ اکٹھے رہ رہے تھے۔شام کے کھانے کا منظر دیدنی تھا۔وہاں چونکہ بجلی کا کوئی تصور نہیں تھا، مشعل جلا کر گھر کے صحن میں تین بزرگ خواتین مٹی کے برتنوں میں کھانا پروسنے بیٹھ گیئں۔پہلے بچوں نے کھایا، پھر مردوں نے اس کے بعد خواتین نے۔کھانا کھانے کے بعد سارے محلے کے بچے، جوان ،مرد و خواتین بے فکر ہو کر اکٹھے دیر تک چھپا چھپی اور دوسرے کھیل کھیلتے رہے، جس کے بعد میزبان گھر کے آدھے افراد گھروں کے اندر آدھے صحن میں سو کر خراٹے لینے لگے۔تھکاوٹ کے باوجود بہت دیر تک مجھے نیند نہیں آئی اور میں قدیم انسانوں جیسے اس نئے ماحول کے بارے میں سوچتا رہا اور آخر اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ کوئی بچھڑا ہوا دیہی علاقہ ہے۔ان کے پیار

اور سادگی سے متاثر ہونے کے باوجود میں نے شہر کا رخ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ابھی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ لوگوں کے چلنے پھرنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں میری سماعتوں سے ٹکرانے لگیں۔ میں بھی اٹھ کر گھر سے باہر نکلا۔ واش روم وغیرہ کا وہاں کوئی تصور نہیں تھا۔ کچھ دوری پر بہت سی کھلی زمین تھی اور ایک صاف وشفاف ندی بہہ رہی تھی۔ عورتیں ایک طرف اور مرد دوسری طرف حاجت بشری کے لئے جا رہے تھے اور واپس آکر ندی پر کچھ ہاتھ مُنہ دھونے اور کچھ نہانے کے بعد پاس ہی واقع ایک میدان میں میں اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اوپر والے کی عبادت کرتے تھے۔ ندی پر ہاتھ مُنہ دھو کر صبح کے پرسوز ماحول سے لطف اندوز ہونے کے لئے میں ادھر اُدھر ٹہلتا رہا اور واپس آکر ناشتے سے فارغ ہو کر بابا سے پوچھا۔

''بابا...... مجھے شہر جانا ہے، کوئی سواری ملے گی''۔

اس نے مجھے گھوڑے کی پیش کش کی لیکن میرے منع کرنے پر بتایا۔

''بونہ گام تک تمہیں پاپیادہ ہی جانا ہوگا، وہاں سے شاید کوئی بیل گاڑی مل جائے''۔

''موٹر گاڑی نہیں ملے گی؟''

''وہ کیا ہوتی ہے؟''

اس نے حیرت زدہ ہو کر لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ میں نے بھی اسے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا، اسی لمحے میرے ذہن میں پری کا خیال آیا۔ ان سے اجازت لے کر جنگل میں اسی جگہ پہنچ کر، جہاں پری نے مجھے چھوڑا تھا، میں نے تین بار ''جل پری شوق'' پکارا تو وہ حاضر ہوگئی۔ میں نے اسے شہر جانے کے ارادے سے آگاہ کیا تو اس نے منتر پڑھ کر تخت حاضر کر دیا اور ہم دونوں اس پر سوار ہو کر ہوا میں اڑنے لگے''۔

''آنکھیں کھولو''۔

گھنٹے بھر بعد پری نے کہا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک چھوٹا سا سرسبز میدان تھا جہاں بیچ بیچ میں پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ میں نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو شہر جیسی کوئی بات دکھائی نہیں دی۔

''جل پری......شہر کہاں ہے؟''

''یہی شہر ہے، گھوم پھر کے دیکھ لو، میری ضرورت پڑے تو اسی جگہ آ کر تین بار پکارنا''۔

کہہ کر وہ چلی گئی کیوں کہ وہ بہت جلدی میں تھی۔

میں نے ماسک پہنا، سینی ٹائیزر سے ہاتھ صاف کئے اور باہر کی طرف نکلا۔ ایک پرانے طرز کا چھوٹا بازار تھا، وہی دیہات جیسے مٹی سے بنے چھوٹے چھوٹے مکان جن کے چھتوں پر گھاس تھی۔ لوگ گھوڑوں، خچروں پر آتے جاتے تھے اور اکا دکا بیل گاڑیاں بھی چل رہیں تھیں، ہماری جیسی گاڑیوں جیسا نام نشان نہیں تھا۔ میرے موبائیل پر وہاں بھی سگنل نہیں تھی۔ کچھ دیر ادھر ادھر گھوم پھر کے میں ایک نانوائی کے دکان پر جا کر اسے پوچھا۔

''بھائی صاحب ایک روٹی دے دو''۔

میں نے پانچ روپے کا سکہ اسے دیتے ہوئے کہا۔ سکہ دیکھ کر اس کی آنکھیں چندیا گئیں۔

''چھوٹے نہیں ہیں بھائی صاحب ......پھر کبھی دے دینا''۔

اس نے ایک روٹی اور مٹی سے بنا بڑا لسی کا گلاس میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت ایک خاتون ایک بڑی ٹوکری لے کر آئی اور ایک چھوٹا سا کالا سکہ نانوائی کو دیا جس نے پچاس سے زیادہ روٹیاں ٹوکری میں ڈال کے اس کو دے دی۔ میں نے لسی کے ساتھ روٹی کھالی، جس دوران نانوائی سے باتیں کرتے ہوئے یہاں کی زندگی کے متعلق کافی جانکاری بھی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد میں پھر اسی میدان میں جا کر بیٹھ گیا اور اس شہر کے لوگوں کی طرز زندگی، جو اس دیہات سے زیادہ مختلف نہیں تھی، کے بارے میں سوچتا رہا۔ نہ ہماری طرح بڑے بڑے رہائشی مکانات، نہ موٹر گاڑیاں نہ ڈھنگ کا لباس نہ تعلیم نہ ترقی نہ بجلی اور نہ ہماری جیسی دوسری سہولیات پھر بھی لوگ اس قدر خوش، مطمئن، صحت مند، بیماریوں سے مبرا، سینکڑوں برس جی کر پر سکون زندگی گزار رہے ہیں، آخر راز کیا ہے؟ سب سے زیادہ میں اس بات سے متاثر ہوا کہ لوگ باگ رات کو بھی چلتے پھرتے تھے یہاں تک کہ عورتیں

اور بچے بھی، نہ کوئی خوف نہ ڈر۔ قریب آدھی رات تک سنجیدگی سے سوچنے کے بعد میں نے دل ہی دل میں اسی شہر میں رہنے کا فیصلہ کرلیا اور میدان، جہاں اب بھی مشعال جلا کر بہت لوگ بیٹھے بے فکری سے حقے کے کش لیتے ہوئے گپ شپ میں مصروف تھے اور کچھ لوگ سوئے بھی تھے، میں ہی سرور کی کیفیت ٹانگیں پھیلا کر سو گیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو نانوائی میرے سامنے موجود تھا۔

''بھائی صاحب..... چلو وہاں ہاتھ مُنہ دھو کر دکان پر آ کر روٹی کھالو''۔

اس نے اپنائیت کے انداز میں کہا۔ ہاتھ مُنہ دھو کے میں دکان پر گیا اور لسی کے ساتھ روٹی کھالی، جس دوران میں نے اسے پوچھ لیا۔

''بھائی صاحب...... یہ شہر کون سا ہے؟''

''پریگ''۔

اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''یہاں کوئی کام ملے گا؟''

''میرے پاس ہی رہو، تمہاری ساری ذمہ داری میری''۔

''مجھے کرنا کیا ہوگا؟''

''بس یہاں بیٹھنا ہوگا اور کچھ نہیں لیکن شادی کرنی پڑے گی''۔

''شادی..... لیکن......''۔

''سارا خرچہ میں کروں گا اور آپ کو رہنے کے لئے جگہ بھی دونگا''۔

اس نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا۔

''کتنا خرچہ ہوگا؟''

''دو تین ٹکے''۔

''یہ ٹکا کتنا ہوتا ہے؟''

''تمہیں نہیں معلوم...... یہ دیکھو، یہ پھوٹی کوڑی، تین پھوٹی کوڑی کی ایک کوڑی، دس کوڑی ایک دمڑی، دو دمڑی ایک پائی، ڈیڑھ پائی ایک دھیلہ، دو دھیلے ایک پیسہ، دو پیسے

ایک ٹکہ......''۔

وہ سکے دکھا کر مجھے سمجھا تا رہا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''ٹھیک ہے''۔

میں نے خوش ہو کر حامی بھر لی اور کچھ دیر تک اسے باتیں کرنے کے بعد آ کر سرور کی کیفیت میں اسی میدان میں بیٹھ کر نئے خواب بننے لگا۔ اسی لمحہ پری حاضر ہوگئی۔ میں نے اسے اپنے فیصلے کے بارے میں بتایا تو وہ اپنے عنابی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے گویا ہوئی۔

''اب میری بات پر یقین ہو گیا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اسی لمحہ تخت حاضر ہو گیا۔

''چلو پہلے اپنا واعدہ پورا کرلو''۔

میں چاہ کر بھی انکار نہ کر سکا اور بادل ناخواستہ ہی اس کے ساتھ تخت پر سوار ہو کر اسی جھیل کے پاس پہنچ گیا جہاں وہ مجھے ملی تھی۔ اس نے مجھے سنہرے کاغذ میں لپٹا ہوا پیالہ دیا، غار تک پہنچنے کا راستہ، اپنی سہیلی تک پیالہ پہنچانے کا طریقہ بتانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ وہ سخت پریشانی اور بے چینی میں ہے اور یہ پانی پیتے ہی اُسے سکون نصیب ہوگا۔ میں پیالہ، جسے بے حد عمدہ خوشبو آ رہی تھی لے کر غار کی طرف روانہ ہو گیا۔

''کیوں نہ میں سنہری کاغذ اٹھا کر دیکھ لوں کہ اس پیالے میں کیا ہے؟ جو اتنی عمدہ خوشبو آ رہی ہے''۔

''نہیں......نہیں......یہ تو خیانت ہو گی''۔

میں کشمکش میں مبتلا ہو گیا کہ کیا کروں، آخر اچانک ایک جگہ بیٹھ کر میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور پیالے سے سنہری کاغذ ہٹایا تو یہ دیکھ کر میری آنکھیں چندیا گئیں کہ پیالہ خالص سونے کا تھا اور اسے نکلی ہوئی خوشبو چاروں اور پھیل گئی۔

''ارے نادان......کہاں بھٹکتے رہو گے، پانی پھینک دو اور پیالہ لے کر واپس اپنے گھر جاؤ ساری زندگی عیش و آرام سے گزرے گی''۔

میرے اندر سویا ہوا لالچ کا بے لگام گھوڑا بیدار ہو کر ہنہنانے لگا، کچھ لمحے سوچنے کے بعد میں نے عجلت میں پیالے کا ڈھکن اٹھا کر جوں ہی پانی گرانا چاہا تو ایک جھٹکے سے کسی نے پیالہ میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو سامنے جل پری تھی۔

''کمینے آدم زاد...... آخر دکھائی نا اپنی اوقات''۔

پری نے مجھے خشم ناک نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''جل پری...... مجھے معاف کردو، مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ مجھے ایک اور موقعہ دو، میں واپس جا کر ''پریگ'' شہر میں رہنا چاہتا ہوں''۔

میں خفت اور خجالت کی وجہ سے سر جھکائے ہوئے ہاتھ باندھ کر منتیں کرنے لگا۔

''پریگ میں رہو گے...... ''کل یگ'' کے نادان انسان، ابھی تم نے ''دعا پریگ'' کی سیر کر کے وہاں کے پیار اور سادگی کی ایک جھلک ہی دیکھی ہے اور یہ تمہارا امتحان تھا۔ اس پیالے میں چشمہ سکون کا پانی ہے، جو تمہارے لئے ہی تھا اور جس سے پی کر تم ''ترتیا یگ'' کے خلوص کی چاشنی اور ''ست یگ'' کی سچائی کی مٹھاس بھی دیکھتے اور تمہیں سکون ہی سکون اور چین ہی چین نصیب ہوتا، لیکن نابیناؤں کو روشنی دکھانا ہی بے کار ہے۔ اس بے قیمت پیالے کے جھانسے میں آ کر تم نے اپنے آپ کو اس انمول دولت سے محروم کر دیا، کیوں کہ تمہارا اندرون لالچ اور حرص کی کالک سے لتھڑا ہوا ہے اور اپنے کالے کرتوتوں کے سبب بے سکونی پریشانی اور خوف وڈر کی زندگانی ہی تمہارا مقدر ہے''۔

جل پری نے اپنے لہجے میں برف کی سی خنکی ڈال کر کہا اور سونے کا پیالہ لے کر غائب ہوگئی۔ میں پشیمان ہو کر پریشانی کے عالم میں اپنا ریزہ ریزہ وجود لئے بوجھل قدموں سے واپس گھر کی طرف چلنے لگا۔

☆☆☆

پریم نگر

''بابا...... جاگ گئے آپ، چائے پیو گے''۔

جب میں نے دیکھا کہ بابا نیند سے بیدار ہو گیا تو میں نے فٹ سے پوچھ لیا کیوں کہ میں کافی دیر سے بابا کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا جو خلاف معمول آج کافی دیر تک سویا رہا۔

''پلاؤ''۔

اس نے آنکھیں ملتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ کر دھیمے لہجے میں کہا تو میں نزدیک ہی موجود ڈابے پر گیا اور چائے اور سموسے لے کر آ گیا۔ بابا نے چائے پی لی اور آنکھیں بند کر کے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھ گیا، میں بھی وہی ٹھہر گیا کیوں کہ آج میں بابا سے باتیں کرنا چاہتا تھا، اسے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ بابا، جس کا نہ حلیہ درست اور نہ لباس مناسب تھا، مستی کی حالت میں پچھلے ایک مہینے سے قبرستان کے پاس ایک چنار کے نیچے بیٹھا تھا، وہ نہ زیادہ باتیں کرتا تھا، نہ کسی سے کچھ مانگتا تھا اور نہ ہی کئی جاتا تھا۔ دن رات وہیں بیٹھا رہتا تھا صرف کبھی کبھی قبرستان کا چکر لگایا کرتا تھا۔ کچھ کھانے کو ملتا تو کھا لیتا، نہیں بھی ملتا تو اسے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ آتے جاتے اکثر راہ گیر اس کے پاس آ کر اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے اور نذرانے پیش کرتے تھے، لیکن وہ ان نذرانوں کو پائے حقارت سے ٹھکراتا تھا اور کسی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا تھا، نہ ہی کوئی اس کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنے کی ہمت کرتا تھا۔ لیکن میں دن میں کئی بار اس کے پاس جاتا تھا، اس کی خدمت کرتا

تھا سو اس کے ساتھ ایک شناسائی سی بن گئی تھی اس لئے میں بلا خوف اس کے پاس بیٹھ کر اسے باتیں بھی کرتا تھا، لیکن یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور یہاں کیوں ٹھہرا ہے جب کہ وہ زیادہ تر اشاروں، کنایوں اور استعاروں میں ہی اپنی باتیں کہتا تھا جو میرے پلے نہیں پڑتی تھیں۔ بابا کا مزاج بھی پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتا تھا، کبھی کبھی تپش میں آ کر وہ مجھے ٹوکتا بھی تھا لیکن میں برا نہیں مانتا تھا۔ بہر حال کچھ دیر بعد ہوا کا ایک لطیف جھونکا آیا تو بابا نے آنکھیں کھولی۔

''بابا..... آج آپ اتنی دیر کیوں سوئے رہے، آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا.....؟''

میں نے بابا سے بات شروع کرنے کی غرض سے پوچھ لیا۔

بابا نے زبان سے کچھ نہیں کہا صرف ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ سجا کر اثبات میں سر ہلایا۔

''بابا..... آپ کا گھر کہاں ہے.....؟''

''پریم محل''۔

میرے سوال پر بابا کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

''پریم محل.....؟''

میں دھیرے سے خود سے بڑبڑایا کیوں کہ مجھے یہ نام کچھ عجیب سا لگا۔

''ہاں پتر..... پریم محل''۔

''بابا..... یہ پریم محل کہاں ہے؟''

''پتر..... یہ ایک الگ ہی شہر پریم نگر میں ہے جسے بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں''۔

''بابا..... وہ تو ٹھیک ہے پر ہے کہاں؟''

میرے اس سوال پر بابا سر نیچے کی طرف کر کے دھیرے سے مسکرایا اور خود سے نہ جانے کیا بڑبڑاتا رہا۔ بابا آج خوشگوار موڑ میں تھا اس لئے میں بھی سوال پہ سوال پوچھنے کی ہمت کر رہا تھا۔

''اچھا بابا..... یہ تو بتاؤ کہ تمہارا پریم نگر کیسا ہے؟ اور وہاں کس کی سرکار چلتی ہے''۔

سرکار کا لفظ میں نے اس لئے جوڑ لیا تا کہ یہ جان سکوں کہ کون سا علاقہ ہے۔

''میرا پریم محل تو بے مثال اور عالی شان ہے جہاں محل کے حقیقی بادشاہ کی حکومت چلتی ہے۔اس سے زیادہ میں اپنے محل کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا، لیکن اتنا ضرور بتاؤں گا کہ ہر پریم محل کے نو خوبصورت دروازے ہوتے ہیں جو اپنی اپنی ضرورت کے وقت کھلتے اور بند ہو جاتے ہیں، دو نگران ہر وقت آنے جانے والوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ پریم محل میں ایک نہایت ہی پر کشش ولا جواب محل خانہ ہوتا ہے جو پا کیزہ ہونے کی صورت میں ہر وقت قسم بہ قسم کی روشنیوں سے چمکتا رہتا ہے اور جہاں شہنشاہ عالی مقام کے لئے ایک نہایت ہی بیش قمیت تخت بچھا ہوتا ہے۔اس کے علاوہ پانچ محافظ چوکیاں اور مختلف رنگوں کے چار مینار بھی ہوتے ہیں جب کہ چھ اعلیٰ پائے کے شاہین بھی ہوتے ہیں ہیں، جن میں سے دو پریم محل کے حاکم چنے جاسکتے ہیں''۔

''وہ کون سے دو ہیں......؟''

میں نے پوچھ لیا۔

''ان دو میں سے ایک عادل اور دوسرا نہایت ہی ظالم ہوتا ہے جو ہر وقت اپنی مقروہ چالیں چلتا ہے۔اگر ظالم کو پریم محل کا حاکم چنا گیا تو وہ اپنے ظلم ستم سے محل کو غلاظتوں سے بھر دیتا ہے ظلم و ستم سے محل کو تحس نحس کر کے اندھیروں کے حوالے کر کے محل کے مکینوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے جب کہ عادل حاکم کی صورت میں پا کیزہ ہو کر محل کا گوشہ گوشہ محبت اور عدل وانصاف کی نورانی قندیلوں سے جگمگا تا رہتا ہے، لطافتوں سے مہکتا ہے اور محل کے مکین سدا شاداں وفرحاں اور کامیاب و کامران رہتے ہیں''۔

کہتے ہوئے بابا کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک عود آئی اور وہ سرور کی کیفیت میں آسمان کی اور دیکھتے ہوئے نہ جانے خود سے ہی کیا باتیں کرنے لگا۔

''بابا...... پریم محل کے بارے میں اور کچھ بتاؤ؟''

کچھ دیر بعد میں نے بابا سے پوچھ لیا۔

''پتر...... پریم محل کی داستان کافی طویل ہے لیکن مختصراً یہ سمجھو کہ ہر پریم محل کا

نظام چلانے کے لئے چوبیس ہزار کارندے دن رات متحرک رہتے ہیں جن میں سے اگر ایک بھی غافل ہو جائے تو فوت ہو کر ضایع جاتا ہے''۔

''بابا......میں بھی پریم محل دیکھنا چاہتا ہوں، مجھے اس کا پتہ اور راستہ بتاؤ''۔

''پتر...... پریم نگر کے گہرے دریا کا سفر طئے کئے بغیر پریم محل کو دیکھنا یا اس کے راز و نیاز کو سمجھنا دشوار ہے جب کہ پریم نگر کے دریا کا سفر اتنا آسان نہیں ہے، راستہ انتہائی کٹھن اور اس کا اصل پتا ایک گہرا راز ہے، جسے حاصل کرنے کے لئے تحقیق کرنی پڑتی ہے اور مرنے سے پہلے مرنا پڑتا ہے۔اس دریا کا کٹھن سفر طئے کرنے والے اپنی منزل یعنی پریم محل جیسی نعمت غیر مترکبہ حاصل کرنے کے بعد آب حیات پی لینے والوں کے مانند امر ہو جاتے ہیں''۔

''مرنے سے پہلے مرنا پڑتا ہے......امر ہو جاتے ہیں''۔

بابا کی یہ عجیب باتیں سن کر میں حیرت زدہ ہو گیا اور پریم محل دیکھنے کی خواہش نے مجھے سختی سے اپنے شکنجے میں کسا۔

''بابا......میں کچھ سمجھا نہیں''۔

''پتر...... پریم نگر کے گہرے دریا میں غوطہ زن ہوئے بغیر کچھ سمجھو گے بھی نہیں''۔

''لیکن میں......''

''اب کوئی اور سوال نہیں، چلے جاؤ یہاں سے''۔

بابا نے جھنجھلا کر میری بات کاٹتے ہوئے زناٹے دار لہجے میں کہا اور آنکھیں بند کر کے اپنی دنیا میں کھو گیا جب کہ میں سخت بے چین ہو کر سوچوں کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

فریب

وہ صبح سے ہی دیوار پر آویزاں گھڑی کی طرف بار بار دیکھ رہی تھی ،لیکن وقت دیکھنے میں ناکام رہی۔ آخر سورج کی کرنیں کمرے میں بکھرتے ہی اس کو وقت کا اندازہ ہوگیا ، وہ اٹھ کر دھیرے دھیرے دیوار کے سہارے چل کر راجیو کے کمرے میں پہنچی اور انتہائی عاجزانہ لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی۔

''بیٹا......آج مجھے ہاسپٹل جانا ہےاور وہ آپریشن کے لئے پیسے......''۔

''ارے ماں.....راجیو کا خون حاضر ہے تمہارے لئے ،بس کچھ اور دن صبر کرلو ابھی ہاتھ ذرا تنگ ہے''۔

راجیو، جو فیکٹری جانے کے لئے تیار تھا، نے سگریٹ کو سلگاتے ہوئے میٹھے لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور چلا گیا۔

آنکھوں کے عارضہ میں مبتلا مس لولی کی آنکھوں کی بینائی اتنی متاثر ہو چکی تھی کہ اب اس کو چلنے پھرنے میں بھی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ آپریشن کی صلاح تو ڈاکٹر نے بہت پہلے دی تھی ،لیکن مہینہ بھر قبل تاکید کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر جلدی سے آپریشن نہیں ہوا تو وہ آنکھوں کی بینائی سے مکمل طور محروم ہونگی۔

راجیو کا کے الفاظ نشتر بن کر اس کے سینے میں پیوست ہو گئے اور درد کی ایک شدید لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ وہ بے بسی ولاچاری کی حالت میں کچھ دیر وہیں کھڑی رہیں پھر واپس اپنے کمرے میں جاکر مایوسی کے عالم میں اپنے تقدیر کو کوسنے لگی۔ کمرے

میں موجود مصنوعی پھولوں کا گل دستہ، جس کا رنگ اب پھیکا پڑھ چکا تھا، کو دیکھتے دیکھتے اُس خاص دن کے واقعات فلم کی سینوں طرح اس کے ذہن کے پردوں پر چلنے لگے......

اُس دن لولی نے اپنے بنگلے کو دلہن کی طرح سجایا تھا اور پارٹی کی دیگر تیاریاں مکمل کرنے کے بعد خود بھی خوب سج دھج کر آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر خود کو تسلی، جس میں یقین کم اور اندیشے زیادہ تھے، دے کر دوپہر ڈھلتے ہی باغیچے میں آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر مہمانوں کا انتظار کرنے لگی۔ اس خاص دن کے موقعے پر لولی کے گھر میں اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی...... صبح سے ہی اس کا فون بجنا شروع ہوتا تھا...... مبارک بادیاں ملتی تھیں...... ناچ گانے کی محفلیں سجتی تھیں...... جام سے جام ٹکراتے تھے اور تحفے تحائف کے ڈھیر لگتے تھے...... لیکن پچھلے چند برسوں سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے چاہنے والوں اور دوستوں کی تعداد اور ان کے پیار میں زمین و آسمان کا فرق آیا ہے، قریبی دوست اور خاص چاہنے والے بھی اس کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

آزاد خیال اور رنگین مزاج مس لولی جس نے زندگی کے شب و روز نہایت ہی عیش و عشرت کے ساتھ گزارے تھے، کو قدرت نے حسن و شباب کی دولت سے نوازنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا...... دھلا دھلا تازہ گلاب چہرہ جس پر سونے اور چاندی کے ورق ہی ورق بکھرے ہوئے تھے...... بڑی بڑی مخمور آنکھیں...... لمبے سنہرے ریشمی بال جو کمر کے نیچے تک آ رہے تھے...... جلد زیتون کی تیل کی طرح تازہ اور شفاف۔ وہ اپنے وقت کی مشہور ٹیلیویزن آرٹسٹ اور جانی پہچانی شخصیت تھی جس کے دنیا کے مختلف ممالک میں ہزاروں مداح تھے۔ اس کے پاس شہرت، عزت، دولت غرض ہر چیز تھی۔ وقت کے بڑے بڑے رئیس اور منصب دار اس کے جادوئی حسن اور دلکش اداؤں کے دیوانے بن کر بھنوروں کی طرح اس کے ارد گرد منڈلاتے رہتے تھے اور اس کے ایک اشارے پر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اس کو نہ صرف اپنے بے پناہ حسن اور جوانی پر ناز تھا بلکہ اس بات پر بھی سخت اتراتی تھی کہ اس کی جادوئی اداؤں کے بل پر دنیا اس کی مٹھی میں ہے۔ پیار محبت اور رشتے ناطوں کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کسی مرد کے پلو بندھ کر گھر

بسانے کو وہ دقیانوسی و فرسودہ سوچ اور عورت کی آزادی کو پنجرے میں قید ہونے کے مترادف سمجھتی تھی۔ یوں اپنی آزاد اور رنگین زندگی کے مزے لوٹتے لوٹتے اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وقت کیسے دبے پاؤں گزر گیا اور اس کی رنگین جوانی کی بہار پر خزاں نے ڈیرے ڈالنے شروع کر دیئے۔ پر کشش جوانی جوں جوں اپنا تاثیر کھونے لگی تو اس کے دوستوں اور چاہنے والوں نے بھی بے رخی برتنا شروع کر دی۔ دھیرے دھیرے اس کے سب چاہنے والوں یہاں تک کہ خاص مہربانوں نے بھی دوری اختیار کر کے اس کو فراموش کر دیا۔ کل تک جو اس کی ایک جھلک پانے کے لئے اس کے در پر سوالی بن کر آتے تھے اب وہی نظریں پھیر کر جاتے تھے...... اپنے چاہنے والوں کی اس بے رخی کے سبب آہستہ آہستہ وہ بالکل یک و تنہا ہو کر رہ گئی۔ اس کے پاس عالی شان بنگلہ..... قیمتی آرام دہ گاڑی......نوکر چاکر، غرض عیش و آرام کی ہر سہولیت اب بھی موجود تھی لیکن اگر کسی چیز کی کمی تھی تو بس پیار اور اپنائیت کی..... شب و روز کی تنہائی اس کو زہریلے سانپوں کی طرح ڈس رہی تھی ......وہ پیار کے ایک میٹھے بول کے لئے ترس رہی تھی......یہ دولت عیش و آرام سب کچھ اس کو بالکل بے معنی سا لگ رہا تھا۔

کافی دیر اپنے رنگین ماضی و بے رنگ حال کی یادوں میں کھو کر آنے والے مہمانوں کی راہ تکتے تکتے دفعتاً اس کی نظریں مغرب کی جانب ڈوبتے سورج کی طرف اٹھ گئیں۔ ہلکی پڑتی گلابی دھوپ، جو دیواروں اور درختوں سے وداعی لے رہی تھی، دیکھ کر اس کے چہرے پر افسردگی اور مردنی کی برف جم گئی۔ وہ یاس و نا امیدی کی حالت میں اٹھ کر اندر چلی گئی اور قد آدم آئینے کے سامنے بیٹھ کر گہرائی سے دیر تک اپنے چہرے کے خد و خال اور سراپے کا جائزہ لیتی رہی، جس دوران اس پر اذیت ناک کیفیت طاری ہو گئی۔ چہرے پر کلیوں کی سی شادابی کے بدلے موجود ان گنت جھریاں، آنکھوں کے نیچے پڑے کالے دائیرے اور پھولتا ہوا بے ڈھول سا جسم گویا اس کے حسن اور دلکشی کے ڈوبتے سورج کی چغلی کھا رہے تھے، جب کہ انتہائی شوق سے منگوایا گیا برتھ ڈے کیک بھی اس کا مُنھ چڑا رہا تھا۔ اس کو پورا یقین ہو گیا کہ حسن و جوانی کی رنگینیاں اس کو فریب دے کر نکل چکی ہیں۔ اپنی

تنہا زندگی کے ویران گلشن کی بربادی پر سوچتے سوچتے بے چین ہو کر اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور شکستہ دلی و نا امیدی کی حالت میں اس نے پلکوں کے پٹ کھول کر اندر کے طلاطم کو سیلاب کی صورت میں بہانا شروع کر دیا...... شام کا سرمئی اندھیرا پھیلنے کے ساتھ ہی دفعتاً ایک گاڑی صحن میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ خوش ہو کر باہر آئی اور متجسس نگاہوں سے دیکھنے لگی...... گاڑی سے ایک کڑیل نوجوان اترا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پاس پہنچ کر مٹھاس بھرے لہجے میں بولا۔

''ہپی برتھ ڈے ٹو یو......''۔

لولی نے نم آنکھوں سے شکریہ کرتے ہوئے اس کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

''ماں جی...... اس شبھ موقعے پر آپ کی آنکھوں میں آنسوں''۔

لڑکے کی زبان سے لفظ ماں جی سن کر اس کی آنکھوں کی طغیانی میں تیزی پیدا ہو گئی۔

''بیٹا...... یہ خوشی کے آنسوں ہیں''۔

اس نے رومال سے آنسوں صاف کرتے ہوئے کہا اور نوکر کو آواز دی جو قسم بہ قسم کی مٹھائیاں اور مشروبات لے کر آیا۔

راجیو ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا، لولی نے کئی دفعہ لمبے سفر پر جانے کے لئے اس کی ٹیکسی کرائے پر لی تھی۔ یوں اس کی لولی سے شناسائی ہوئی تھی، گو کہ اس نے پہلے بھی کئی بار لولی کے جنم دن کی تقریبوں میں شرکت کی تھی لیکن قریبی دوستوں اور ہم نشینوں کی بھیڑ میں لولی نے کبھی اس کی طرف رتی بھر توجہ بھی نہیں دی تھی۔

''اچھا ماں جی...... اب میں چلتا ہوں...... میری طرف سے چھوٹا سا تحفہ''۔

کچھ دیر بعد راجیو نے ایک خوب صورت گل دستہ اس کی اور بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا...... تم جا رہے ہو، اتنی جلدی......''۔

گل دستہ لیتے ہوئے اس کے بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگیں اور آنکھوں کے تالاب بھر گئے۔

''ماں جی...... آپ روئیں نہیں پلیز''۔

''بیٹا...... اپنی نامراد زندگی پر روؤں نہیں تو کیا کروں...... جنم دن کے موقعے پر آج تمہارے سوا کسی نے وش بھی نہیں کیا...... میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے بیٹا، کوئی نہیں......''۔

اس نے جھرجھری لیتے ہوئے اکھڑے سانس کو قابو میں لاتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا۔

''آپ دل چھوٹا نہ کریں ماں جی، میں ہوں نا...... میں ساری عمر بیٹا بن کر تمہاری خدمت کروں گا''۔

راجیو کا اتنا کہنا تھا کہ لولی نے اس کو گلے لگایا اور بے اختیار اس کا ماتھا چومنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک عود آئی جیسے اس کو سارے سنسار کی خوشیاں مل گئی ہوں۔

کیک کاٹنے کے بعد لولی راجیو کو دل سے بیٹا مان کر دیر تک اس کے ساتھ باتوں میں مصروف رہی...... اس طرح راجیو، جس کا اپنا کوئی نہیں تھا اور جو ایک معمولی کٹیا میں رہتا تھا، بیٹا بن کر ٹھاٹھ سے لولی کے عالی شان بنگلے میں رہنے لگا اور ہر لحاظ سے ماں کی طرح ہی لولی کا خیال رکھنے لگا۔ راجیو کا ساتھ پا کر لولی کے جیسے بخت جاگ اٹھے۔ اس کے نفسیاتی زیر بم میں عجیب سرور چھا گیا۔ اس نے راجیو کے ناز اٹھاتے ہوئے اُسے لاڈ پیار اور چاندی میں پالنا شروع کیا۔ ٹیکسی ڈرائیوری کے پیشے سے اٹھا کر ایک فیکٹری خرید کر دی اور اس کے شادی کے خواب سجانے لگی۔ جب کہ زبانی زبانی یہ بھی کہہ ڈالا میرے مرنے کے بعد میری تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کا مالک راجیو اور صرف راجیو ہوگا۔ اس نے گھر کی ساری ذمہ داریاں راجیو کو سونپیں اور جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی ساری جمع پونجی بھی اس کے قدموں میں ڈال دی۔ جمع پونجی قبضے میں لے کر سال ڈیڑھ سال بعد ہی راجیو نے غیر محسوس طریقے سے کھوٹا دکھانا شروع کر دیا جسے لولی نے جلد ہی محسوس کر لیا لیکن مصلحت کی چادر اوڑھ کر خاموشی سے برداشت کرتی رہی۔ اب جو کمپنی کی طرف سے تھوڑی بہت پنشن ملتی تھی اسے وہ اپنے علاج اور دیگر اخراجات کا گزارہ چلاتی تھی۔ وہ کئی مہینوں سے لگاتار آنکھوں کے آپریشن کے لئے درکار ایک لاکھ روپے راجیو سے مانگ رہی تھی لیکن وہ ہر بار فنکاری سے ٹال مٹول کر کے ٹرخاتا تھا۔

کافی دیر تک سوچوں کے تانوں بانوں میں اُلجھے رہنے کے بعد اس کے دل میں یہ بات پوری طرح گھر کر گئی کہ راجیو سے روپے مانگنا پتھر سے دودھ مانگنے کے مترادف ہے اور آپریشن میں مزید تاخیر نقصان دہ ہوگی۔اس کے سوچ کے ظلمت کدے میں ایک نیا روشن دان کھل گیا۔اس نے گھر کی ملازمہ کو بلایا اور تیار ہوکر اس کے ہمراہ سیٹھ دھنی رام کے پاس پہنچ کر اسے اپنے بنگلے کے متصل چند مرلے زمین خریدنے کی پیش کش کی۔سیٹھ نے زمین خریدنے کی حامی بھرتے ہوئے کاغذات مانگے جنہیں حاصل کرنے کے لئے وہ عرضی لے کر محکمہ مال کے دفتر پہنچی۔

''یہاں مس لولی کے نام اب کوئی پراپرٹی درج نہیں ہے۔مرحوم مس لولی کی وصیت کے مطابق اس کی ساری منقولہ وغیر منقولہ جائیداد مسٹر راجیو کے نام منتقل ہو چکی ہے''۔

دفتری بابو نے کچھ دیر کاغذات الٹنے کے بعد اس کو وصیت نامہ اور اس کی موت کی سند دکھاتے ہوئے کہا''۔

☆☆☆

باباسائیں

سارے دروازوں سے ناامید ہوکر شاکر نے ساری رات پریشانی کی حالت میں کانٹوں پر گزاری کیوں کہ وقت تیزی سے نکل رہا تھا اور کوئی اس کی مدد کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو رہا تھا، اپنے پرائے سب مُنہ موڑ رہے تھے۔ اپنی پریشانی لے کر وہ صبح صبح ہی بڑی امیدوں کے ساتھ باباسائیں کے گھر پہنچ گیا تو دیکھا کہ بابا گھر کے اندر سے پانی کی بالٹی لے کر نکل رہا تھا، شاکر کے نزدیک پہنچتے ہی رک گیا تو شاکر نے بڑے ادب سے سلام کی، وعلیکم السلام کہہ کر اس نے شاکر کو آنگن میں ہی بچھی چٹائی پر بیٹھنے کو کہا اور خود بالٹی اٹھا کر پاس ہی رکھے ایک مٹی کے بڑے برتن میں پانی ڈال دیا۔ بالٹی لے کر پھر اندر گیا اور کچھ لمحوں بعد پھر سے پانی کی بالٹی لے کر آ گیا اور اس میں سے آدھا پانی اسی برتن میں ڈال دیا جب وہ بھر گیا تو آدھا پانی کچھ دوری پر رکھے مٹی کے ہی ایک چھوٹے برتن میں ڈال دیا۔ شاکر جو یہ منظر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا حیران رہ گیا کہ اتنی گرمی اور پانی کی شدید قلعت کے باوجود بابا ان برتنوں میں پانی کیوں ڈال رہا ہے؟

''کہو بیٹا......کہاں سے اور کس مقصد سے آئے ہو؟''

شاکر ابھی سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ بابا کی مٹھاس بھری آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''بابا......میں دوسرے محلے میں رہنے والے کبیر پٹھان کا بیٹا ہوں اور آپ سے ملاقات کی غرض سے آیا ہوں''۔

''سلامت رہو بیٹا......آباد رہو''۔

شاکر کو دعائیں دیتے ہوئے بابا وہاں موجود ناشپاتی کے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا جب کہ شاکر سوچنے لگا کہ آخر کس طرح وہ بابا سے اپنے مُقصد کی بات کہے۔

''تیرا کرم ہے میرے مولا.....''۔

دفعتاً بابا مسکراتے ہوئے مٹی کے برتنوں کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔شاکر نے دیکھا تو سات آٹھ کتے ہانپتے ہوئے آئے اور پانی پینے لگے جب کہ دوسرے برتن میں رکھے پانی سے درجنوں پرندے اپنی پیاس بجھانے لگے،شاکر کو بھی اپنے سوال کا جواب مل گیا۔اسی لمحے گھر کے اندر سے ایک بزرگ باپردہ خاتون نکلی اور پرندوں کو دانہ ڈالنے لگی۔

''تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے مولا''۔

آسمان کی طرف نظریں اٹھائے کہہ کر وہ پھر سے شاکر کی طرف متوجہ ہوا۔

''معاف کرنا بیٹا......میرا دھیان اس طرف گیا۔اب بتاؤ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''بتاؤں گا بابا،ابھی جلدی کیا ہے؟''

بابا کا مانوس سا رویہ دیکھ کر شاکر نے بھی بے تکلفی سے کہا تو بابا نے اس کے گھر والوں کی خیر و عافیت دریافت کی اور دعائیں دینے لگا۔اسی وقت بابا کی عمر رسیدہ شریک حیات کشمیری سماوار میں نمکین چائے لے کر آئی اور بابا اور وہ باتوں کے ساتھ ساتھ چائے پینے میں مصروف ہوگئے۔بابا کے دو بیٹے بھی تھے جو اعلیٰ عہدوں پر فائیز تھے لیکن اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شہر کی ایک پاش کالونی میں اپنے اپنے بنگلوں میں رہتے تھے،جب کہ بابا اور اس کی شریک حیات اپنے ہی چھوٹے سے آبائی گھر میں رہائیش پزیر تھے۔

بابا سائیں کا اصل نام قدرت اللہ تھا لیکن سارے لوگ اُسے بابا سائیں کے نام سے ہی پکارتے تھے۔وہ شہر کا ایک سادہ مزاج عزت دار عمر رسیدہ بزرگ تھا لیکن بالکل صحت مند اور چاک وچوبند۔نورانی چہرے پر برف جیسی لمبی سفید داڑھی،لمبے سفید بال اور پرانا سا لمبا پیرہن زیب تن کیئے ہوئے وہ انتہائی باوقار لگ رہا تھا۔وہ اپنے زمانے کا نامور

فٹ بال کھلاڑی بھی رہ چکا تھا اور کئی تمغوں اور اعزازات سے نوازا جا چکا تھا۔ ہر ایک کے دکھ سکھ میں شامل ہوتا تھا اور ہر ایک کی مدد کے لئے پیش پیش رہتا تھا، شاکر نے یہاں تک سنا تھا کہ بابا کسی بھی محتاج اور حاجت مند انسان کو ناامید نہیں کرتا ہے۔ شاکر بھی بڑی مشکل میں پھنسا تھا اور ہر دروازے سے ناامید لوٹ کر بابا کے پاس مدد حاصل کرنے کی غرض سے آیا تھا۔

شاکر اب اس سوچ میں پڑا تھا کہ بابا سے اپنے مطلب کی بات کیسے کہے تو دفعتاً بابا کے چھوٹے سے مکان کے پاس ہی بنے بنگلے کی کھڑکی سے کسی نے دھڑام سے ایک بھرا ہوا بڑا تھیلہ بابا کے آنگن میں پھینک دیا۔

''اللہ تجھے سلامت رکھے......''۔

بابا کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے تھیلہ پھینکنے والے کو دعائیں دینے لگا۔

''بابا یہ آدمی کون ہے؟''

''یہ اس گھر کا ملازم ہے......''۔

''اللہ کے نام پر کچھ دے دو بابا......''۔

اسے پہلے کہ شاکر بابا سے تھیلے کے بارے میں پوچھتا ایک سائل نے آکر آواز دی۔

شاکر نے جھٹ سے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر سائل کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''بیٹھ جا اللہ کے بندے''۔

بابا نے بڑے پیار سے کہہ کر اسے بٹھایا اور اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے گویا ہوا۔

''اب بولو کیا پریشانی ہے آپ کو؟''

''بابا...... میں بھکاری نہیں ہوں بلکہ ایک مجبور باپ ہوں، میری بیٹی کچھ دنوں سے بیمار ہے اور اس کے علاج کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے''۔

اس کی بات سن کر بابا نظریں آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے بے چین ہو کر سوچ میں پڑ گیا...... چند لمحوں بعد ہی ایک لڑکا ہاتھ میں لوٹا لئے آیا اور اسلام علیکم کہہ کر کچھ رقم بابا کو دیتے ہوئے بولا۔

''باباسائیں...... پورے مہینہ کی رقم ہے''۔

''شکریہ بیٹا...... خوش رہو''۔

رقم لیتے ہوئے بابا کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی اور وہ آسمان کی طرف نظریں اٹھائے خود سے بڑبڑانے لگا۔

''تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے مولا...... بے شک تو بڑا کارساز ہے......''۔

وہ لڑکا اندر گیا اور دودھ لے کر واپس چلا گیا۔

''آپ اپنی بیٹی کا ٹھیک سے علاج کراؤ، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک میرے پاس آجانا''۔

بابا نے لڑکے سے لی ہوئی ساری رقم سائل کو تھماتے ہوئے انتہائی شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

''شکریہ بابا...... آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا''۔

''ارے بیٹا احسان کیسا......؟ احسان تو مجھ پر میرے پروردگار کا ہے جس نے عین وقت پر دستگیری کر کے مجھے آپ کی مدد کا موقع عطا فرمایا''۔

''اچھا بابا اب میں چلتا ہوں''۔

بابا کے حالات سے واقف ہو کر شاکر کے چہرے پر افسردگی چھا گئی اور کچھ دیر بعد وہ بھی اپنے آنے کا مقصد بیان کئے بغیر ہی جانے کے لئے اٹھا۔

''بیٹا...... تم نے بتایا نہیں کس مقصد سے آئے ہو؟''

''بابا...... میں بس یوں ہی......''۔

''یوں ہی نہیں بیٹا، بلا جھجک بتاؤ کس مقصد سے آئے ہو''۔

اس نے شاکر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''بابا......وہ کیا ہے کہ....''۔

شاکر کی زبان ہکلانے لگی۔

''شرماؤ مت بیٹا......بولو کیا بات ہے''۔

''بابا......دراصل میری بہن کی شادی ہے اور مجھے کچھ رقم کی اشد ضرورت ہے''۔

''بہن کی شادی اور رقم، تیرے کرم ہے میرے مولا''۔

''بابا کے چہرے پر عجیب قسم کی طمانیت پھیل گئی''۔

''بیٹا......کتنی رقم اور کب چاہیے''۔

''پچیس ہزار''۔

سن کر بابا سر کھجاتے ہوئے کچھ دیر کے لئے سوچوں میں پڑ گیا۔

''ٹھیک ہے بیٹا......آپ چند دن بعد آجانا رقم آپ کو مل جائے گی لیکن ایک شرط پر''۔

''وہ کیا بابا؟''

''تم اس بات کا ذکر کبھی بھی کسی سے نہیں کرو گے''۔

''ٹھیک ہے بابا''۔

کہہ کر شاکر وہاں سے نکلنے لگا، بابا بھی کھڑکی سے پھینکا ہوا تھیلہ کاندھے پر اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔

''بابا......اس تھیلے میں کیا ہے؟ مجھے دیدو میں اٹھاتا ہوں''۔

''نہیں بیٹا......میں یہ کام خود ہی کرتا ہوں''۔

بابا نے وہ تھیلہ گھر سے کچھ دوری پر موجود رکھے کوڑے دان میں پھینک دیا تو شاکر کو اس نوکر پر سخت غصہ آ گیا۔ چند دن بعد شاکر پھر بابا کے گھر پہنچ گیا، اسے بابا سے رقم ملنے کی ذرا بھی امید نہیں تھی۔ لیکن بابا نے بغیر کسی تاخیر کے دعائیں دیتے اور مسکراتے ہوئے مطلوبہ رقم اس کو تھما دی جس دوران اس کے نفسیاتی زیروبم میں عجیب سا سرور چھا گیا۔ شاکر بابا کا شکریہ ادا کر کے رقم لے کر خوشی خوشی یہ سوچتے ہوئے کر گھر کی طرف جانے لگا کہ

آخر بابا نے رقم کا انتظام کیسے کیا......؟ راستے میں شاکر کچھ خریداری کی غرض سے ایک شاپنگ مال میں داخل ہو گیا۔

''چالیس ہزار......چالیس ہزار پانچ سو......''۔

وہاں ایک بڑے شوروم میں بہت بھیڑ تھی اور کسی چیز کی نیلامی ہو رہی تھی، شاکر بھی دیکھنے کے لئے شوروم میں داخل ہو گیا......

''چالیس ہزار پانچ سو......باپ رے......''۔

''ارے بھائی ......اپنے وقت کے مشہور زمانہ فٹبال کھلاڑی قدرت اللہ کا سونے کا مڈل ہے جو اس نے کل ہی اس شوروم کے مالک کو بہت کم قیمت میں بیچا ہے''۔

''مگر اس نے بیچا کیوں......؟''

کچھ نوجوان آپس میں گفتگو کر رہے تھے جسے سنتے ہی شاکر کے وجود میں ہل چل مچ گئی، درد کی ایک تیز ٹیس اس کے پورۓ وجود میں دوڑ گئی۔

''پچاس ہزار......اکاون ہزار......پچپن ہزار......''۔

نیلامی کی رقم ہر لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی اور شاکر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے نکل گیا۔ اسے لگا کہ جیسے موت کا ایک سرد جھونکا اسے چھو کر گزر رہا ہو۔

☆☆☆

قربانی

عیدقربان کی آمد آمد تھی، بازار میں کافی گھما گھمی تھی اورلوگ باگ عید کی خریداریوں میں مصروف تھے جب کہ قربانی کی جانوروں کی اونچے داموں خرید فروخت بھی عروج پر تھی۔احسان چودھری جوروزے سے تھا،عصر کی نمازادا کر کے گھر آیا تواس کی گھروالی پھٹ سے بول پڑی۔

''اجی سنتے ہو،عید میں اب چند ہی دن باقی رہ گئے ہیں اورآپ نے ابھی تک قربانی کے لئے کوئی جانورنہیں لایا''۔

''یہ کونسی بڑی بات ہے،میں کل ہی جاکےقربانی کے لئے جانورخریدلاؤں گا''۔

اس نے مسکراتے ہوئے مختصر سا جواب دیااوردنیائے مافیا سے بےخبر تلاوت قران پاک میں مصروف ہوگیا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی،اسنے اٹھ کر دروازہ کھولاتو سامنےفوزیہ کھڑی تھی،جسے دیکھ کراس کی خوشی کی انتہانہ رہی۔

رسمی علیک سلیک کے بعدوہ اندرداخل ہوگئے۔

''فوزیہ بیٹی......آج کیسے ادھر کا راستہ بھول گئی''۔

اسی لمحے احسان کی گھروالی نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہاجس کے ساتھ ہی فوزیہ کے آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارنکل پڑی۔

''کیابات ہے بٹیا......گھر میں سب ٹھیک تو ہے نا،بھابی جان ٹھیک تو ہے؟''

اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھاتوفوزیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر کیا بات ہے؟''

احسان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

''انکل......شہر سے الیاس انکل نے خطرناک پیغام بھیجا ہے، جس پر اگر اس نے عمل کیا تو پتا نہیں کتنا خون بہے گا......''۔

فوزیہ نے نم آنکھوں سے کہنا شروع کیا۔

دراصل چودھری خاندان میں کئی سالوں سے اراضی کا تنازعہ چل رہا تھا اور آج الیاس چودھری نے پیغام بھیجا تھا کہ اتوار کو وہ آکر اپنے بھائی اعجاز چودھری سے زبردستی اپنے حصے کی زمین چھین لے گا۔ اس تنازعے کے سبب اعجاز کی بیٹی فوزیہ، جو الیاس کی بہو تھی، کی زندگی اجیرن بن چکی تھی اور وہ دو برسوں سے بچوں سمیت میکے میں پڑی تھی۔

''غم نہ کرو بیٹی، اللہ خیر کرے گا انشاء اللہ، یہ بتاؤ کہ اعجاز اس وقت کہاں ہے؟''

احسان نے فوزیہ کو دلاسہ دیتے ہوئے پوچھا۔

''انکل...... پاپا جانی بہت غصے میں تھے، وہ فارم ہاوس میں قربانی کے لئے جانور دیکھنے گئے ہیں۔ خدا کے لئے کچھ کرو انکل ورنہ عید کے اس مقدس تہوار پر نہ جانے کیا ہوگا؟''

فوزیہ سے سارے معاملے کی تفصیلات جاننے کے بعد احسان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی، فکرمندی اور پریشانی کے عالم میں کچھ دیر تک سوچوں میں گم رہنے کے بعد وہ مغرب کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد شریف کی طرف نکلا تو کئی دوستوں نے اسے بتایا کہ گاؤں کے لوگ اس مسلئے پر طرح طرح کی چمہ گوئیاں کر رہے ہیں، جس کے سبب اس کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔

چودھری اکرام الدین گاؤں کا بڑا زمیندار اور نہایت ہی عزت والا انسان تھا۔ جس کے پاس سینکڑوں کنال اراضی کے علاوہ کئی میوہ باغات بھی تھے جب کہ شہر میں بھی کئی ایکڑ زمین اور فیکٹریاں تھیں۔ چودھری کے تین بیٹے تھے جو ایک ہی حویلی میں خوشی خوشی رہ رہے تھے، یہاں تک کہ باپ کی خواہش کے مطابق اس کے بیٹے الیاس چودھری نے اپنے بیٹے کی شادی اپنے بھائی اعجاز چودھری کی بیٹی سے انجام دی، لیکن چودھری کے انتقال کے

کچھ مہینوں بعد ہی نہ جانے کس کی نظر بد لگی کہ ان میں ان بن ہونا شروع ہوگئی، خلوص ناپید ہوگیا اور محبت اور اپنائیت کے درمیان خود غرضی کی دیواریں حائل ہوگئیں۔ جس کے نتیجے میں اس خاندان کا بٹوارہ عمل میں آیا۔ جائیداد کی تقسیم کے دوران چودھری کے دو بیٹوں اعجاز چودھری اور الیاس چودھری کے درمیان تنازع شروع ہوگیا اور کافی لے دے ہوئی، یہاں تک کہ بات کورٹ کچہری تک بھی پہنچ گئی۔ اس دوران ان کا تیسرا بھائی احسان چودھری اس تنازعے سے دور ہی رہا اور ان دونوں میں صلاح کرانے کی کوشش کرتا رہا لیکن بات نہیں بنی۔ جب تعلقات حد سے زیادہ خراب ہوگئے تو الیاس نے اپنے لئے نئی حویلی تعمیر کی اور اپنے اہل وعیال سمیت وہیں جا کر رہنے لگا۔ کچھ عرصے بعد ہی اعجاز اور احسان کے درمیان بھی ان بن ہوگئی اور احسان نے بھی ایک چھوٹا سا مکان تعمیر کیا اور حویلی چھوڑ کر اپنے بیوی بچوں اور ماں کو لے کر وہیں جا کر رہنے لگا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ کچھ عرصہ بعد جب الیاس شہر میں ایک عالی شان بنگلہ خرید کر وہیں جا کر رہائش پزیر ہوگیا تو اعجاز نے اس کے ایک ایکڑ پر مشتمل میوہ باغ پر یہ کہہ کر قبضہ جمایا کہ اس نے شہر میں چل رہے کارخانوں کی آمدنی میں لاکھوں روپے کا ہیر پھیر کیا ہے۔ اس طرح ان کے تعلقات دن بہ دن کشیدہ ہوتے گئے اور یہ دونوں نہ صرف ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے بلکہ فوزیہ، جو دو بچوں کی ماں بن چکی تھی، کا رشتہ بھی خطرے میں پڑھ گیا بلکہ کئی بار طلاق تک بھی نوبت پہنچی لیکن احسان کی کوششوں سے ہی ابھی تک یہ رشتہ بنا ہوا تھا۔ چودھری خاندان کے دوستوں اور گاؤں کے معززین نے بھی معاملہ سلجھانے کی کافی کوششیں کی لیکن بے سود، جب کہ احسان، جو اپنے بھائیوں کے اس تنازعے سے کافی پریشان تھا، نے بھی کافی ہاتھ پیر مارے لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ حالانکہ جائیداد کے معاملے میں اس کے ساتھ بے حد ناانصافی ہوئی تھی یہاں تک کہ اسے حویلی بھی چھوڑنا پڑی اور باقی جائیداد میں سے بھی پورا حصہ نہیں ملا لیکن وہ صبر اور شکر کے ساتھ اطمینان سے زندگی گزارتا رہا۔

نماز ادا کرنے کے بعد احسان سیدھے اعجاز کی حویلی پر پہنچ گیا، جہاں اعجاز اپنے کچھ دوستوں اور وفادار نوکروں سے اسی معاملے پر صلاح مشورے میں مشغول تھا۔ گھنٹے بھر

کے بعد جب وہ فارغ ہوا تو احسان نے اسے بڑی عاجزی کے انداز میں کہا۔

''اعجاز...... بھائی جان سے کوئی سمجھوتہ کرلے، آخر وہ ہمارا بڑا بھائی ہے''۔

''ہرگز نہیں، میں اس کمینے کو سبق سکھاؤں گا اور ایک انچ زمین بھی نہیں دونگا''۔

''مگر کیوں؟''

''کیوں کہ اس نے شہر میں ہماری زمین ہڑپ لی ہے''۔

''کون سی زمین؟ سب کو برابر حصہ ملا ہے''۔

''بائی پاس والی دس کنال زمین ہم سب کی ہے''۔

''کیسی باتیں کرتے ہو، وہ زمین تو بھائی جان نے بٹوارے کے بعد خریدی ہے''۔

''تو تو بھی اس کمینے سے ملا ہوا ہے، دفا ہو جاؤ میرے گھر سے''۔

اعجاز نے آگ بگولہ ہو کر احسان کی بے عزتی کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو پھر ایسا کرتے ہیں......؟''

''بولا نا دفا ہو جاؤ یہاں سے''۔

اعجاز نے اس بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''غصہ کیوں کرتے ہو، میری پوری بات تو سنو''۔

احسان نے عاجزی کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے کچھ نہیں سننا ہے، چلے جاو یہاں سے''۔

اعجاز نے گرجدار آواز میں کہا۔

اعجاز، جو مُنہ زور قسم کا گھمنڈی انسان تھا، اس کی بات سننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوا اور احسان مایوس ہو کر گھر چلا گیا۔ یہ بات اب اچھی طرح سے اس کے دل میں گھر کر گئی کہ اس کے دونوں بھائی زمین کے تنازعے کے سبب کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں اور خون خرابے اور بدنامی کے علاوہ فوزیہ کی جوانی اور اس کے معصوم بچوں کی زندگی بھی برباد ہو کر رہ جائے گی۔ سخت پریشانی کے سبب وہ رات کو ایک پل کے لئے بھی نہیں سو سکا اور اس تنازعے کو حل کرنے کے لئے ترکیبوں پر غور کرتا رہا۔ صبح اٹھ کر اپنی ماں اور بیگم سے صلاح مشورہ کر کے

کئی باہر چلا گیا اور بعد دوپہر جب واپس آیا تو اس کے چہرے پر پریشانی کی جگہ سکون کی طمانیت تھی۔ شام کو پہلے اس نے فون پر ماں کی اعجاز سے بات کروائی پھر فون کر کے الیاس کو اس بات کے لئے راضی کر لیا کہ آپ دونوں کل میرے گھر میں بیٹھ کر بات کریں گے تاکہ مسلئے کا کوئی قابل قبول حل نکل سکے اور خاندان مزید بدنامی سے بچے۔

دوسرے دن صبح صبح ہی اعجاز نے اپنے حواریوں کو لاٹھیوں اور درانتیوں سے لیس کر کے متنازع میوہ باغ کے اردگرد بٹھایا اور خود دل و دماغ میں تکبر کے پہاڑ لئے احسان کے گھر پہنچ گیا، جب کہ الیاس بھی بیسیوں غنڈوں کے ساتھ شہر سے آ گیا اور سیدھے اپنے فارم ہاوس میں جا کر قربانی کے لئے جانور پسند کرنے گیا اور واپس آ کر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے احسان کے گھر پہنچ گیا۔ چودھری خاندان کے کچھ نزدیکی دوست اور گاؤں کے کچھ معززین بھی احسان کے گھر پہنچے جہاں احسان نے عمدہ ضیافتوں کا اہتمام کیا تھا۔

''جب تک مجھے اپنی زمین واپس نہیں مل جاتی میں پانی کا ایک قطرہ تک نہیں پیوں گا''۔

الیاس نے کچھ بھی کھانے پینے سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

''بھائی صاحب ...... یہ خیال دل سے نکال دیں، میں تمہیں زمین کی ایک انچ بھی نہیں دونگا چاہیے خون کی ندیاں کیوں نہ بہہ جائیں''۔

اعجاز نے اسے للکارتے ہوئے کہا، جس کے بعد دونوں بھائیوں کے بیچ کافی گرماگرمی ہوگئی۔

''دیکھئے اگر آپ اس طرح اپنے اپنے زد پر اڑے رہے تو مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ آپ ایک عزت دار باپ کی اولادیں ہیں، آپ کے پاس بہت سی زمینیں بھی ہیں اور زمین کے ایک ٹکڑے کے لئے لڑنا ٹھیک نہیں ہے''۔

وہاں موجود گاؤں کے ایک معزز شخص نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''زمین کی پرواہ کس کو ہے حاجی صاحب، یہ میرے عزت اور وقار کا معاملہ ہے''۔

یہ الیاس کی آواز تھی۔

''اگر یہ آپ کے وقار کا معاملہ ہے تو میں بھی آپ کا بھائی ہوں، دیکھتے ہیں آپ کیسے زمین لیتے ہیں''۔

اعجاز نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''تو چلئے پھر، قضیہ زمین برسرِ زمین کے مصداق وہاں ہی فیصلہ کریں گے''۔

الیاس گرجتے ہوئے اٹھ کر جانے لگا۔

''بھائی صاحب آپ اطمیناں سے بیٹھیں، لڑائی، جھگڑے اور خون خرابے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو اپنی زمین ملے گی اور اعجاز کا بھی کچھ نہیں جائے گا''۔

دونوں بھائیوں کے انا کے بے لگام گھوڑے جب سر چڑھ کر بولنے لگے تو احسان، جواب تک خاموش بیٹھا تھا، نے اٹھ کر الیاس کو نیچے بٹھاتے ہوئے کہا۔

''احسان......تم ہمیں دھوکہ دے رہے ہو ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

اعجاز نے احسان کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا، آپ لوگ مجھ پر بھروسہ رکھیں اور کھانا تناول فرمائیں''۔

احسان نے بڑے ہی پر اعتماد لہجے میں کہا۔

''ہم کھانا ضرور کھائیں گے، لیکن اگر آپ کے پاس اگر اس مسلئے کا کوئی حل ہے تو پہلے بتاؤ''۔

''میرے پاس اس مسلئے کا ایک ہی حل ہے کہ میرے چھوٹے بھائی اعجاز کے پاس اپنی پوری زمین رہے گی اور میرے بڑے بھائی یعنی آپ کو میرے حصے کی زمین ملے گی۔ اگر آپ کو یہ حل قابل قبول ہے تو یہ لیجئے''۔

اس نے اپنے زمین کے کاغذات الیاس چودھری کو تھماتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''لیکن میری بھی ایک شرط ہے''۔

''کیسی شرط۔''

ان دونوں نے حیرت واستعجاب میں ڈوبتے ہوئے بیک زبان پوچھا۔

''فوزیہ بٹیا آج ہی اپنے بچوں کو لے کر اپنے گھر چلی جائے گی''۔

احسان کی بات سن کر فوزیہ کے شوہر، جو اپنے باپ کے ساتھ آیا تھا، کی آنکھیں خوشی سے نم ہوئی۔

اسی لمحے الیاس کا فون بج اٹھا۔

''ہیلو......جی میں قربانی کے لئے جانور لانے گاؤں گیا ہوں، اسی لئے آپ سے نہیں مل سکا''۔

''آپ کا کام ہوگیا ہے''۔

''بہت شکریہ جناب، اب میرے لئے کیا حکم ہے''۔

''کچھ خاص نہیں بس ہمارے لئے بھی قربانی کے ایک دو تکڑے سے بھیڑ لے آنا''۔

''جی ضرور''۔

کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا اور احسان سے مخاطب ہو کر بولا۔

''مگر تم ہمارے لئے اتنی بڑی قربانی کیوں دے رہے ہو؟''

''یہی میں بھی جاننا چاہتا ہوں''۔

اعجاز بھی بے تابی سے بولا۔

''ارے بے غیر تو، تمہیں اسے کیا مطلب ہے۔ جاؤ اپنے غرور اور انا کو سنبھال کے رکھو اور دکھاوے کے لئے قربانی کے نام پر بے زبان جانوروں کو کاٹ کر خوشیاں مناؤ''۔

ان کی ماں جو ایک کونے خاموشی سے بیٹھی سب سن رہی تھی نے اپنے دونوں بیٹوں پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے تھکے سے لہجے میں کہا اور سر سے چادر اتار کر اللہ سے گڑگڑاتے ہوئے احسان کو دعائیں دینے لگی۔ احسان کی پیشانی کھل اٹھی جب کہ اعجاز اور الیاس، جن کی کانوں کی لوئیاں سرخ ہوگئیں، کھسیانے سے ہو کر شرمندگی کی حالت میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

☆☆☆

پچھتاوا

''بے شک تندرستی ہزار نعمت ہے، انسان کی صحت ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ورنہ سب بیکار......''۔

ارشاد کلرک، جس کی صحت کئی ہفتوں سے سخت ناساز تھی، جمائی لے کر خود کلامی کرتے ہوئے بڑبڑایا اور دل ہی دل میں اللہ سے صحت وتندرستی کی دعائیں کرنے لگا۔ ارشاد کلرک کے پاس اللہ کا دیا ہوا سب کچھ تھا، دھن دولت، بنگلہ، گاڑی، زمینیں، اولادیں وغیرہ، غرض اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن صحت کی ناسازی کے سبب وہ سخت پریشان تھا اور اسے اب سب کچھ بے کار دکھائی دے رہا تھا کیوں کہ کئی مہینوں سے وہ کمرے میں قید ہو کر رہ گیا تھا، کمرے کی چار دیواری زہریلے سانپ بن کر اسے ڈس رہی تھی اور وہ باہر جا کر جی بھر کے گھومنا چاہتا تھا۔ پہلے پہلے ہمسائے اور رشتہ دار تواتر سے اس کی خبر گیری کے لئے آرہے تھے، لیکن اب اس کی خبر گیری کے لئے بھی کوئی نہیں آرہا تھا، یہاں تک کہ اس کی بیوی کے بغیر دیگر افراد خانہ بھی اس کے کمرے کا کم ہی رخ کرتے تھے، جس کا اسے سخت ملال تھا۔ سوچتے سوچتے دفعتاً اس کی نظریں دیوار پر لگی اس کی اپنی ہی بچپن کی تصویر پر پڑی۔ یہ تصویر اس دن کی تھی جب ساتویں جماعت میں کلاس میں اول آنے پر اسے انعام سے نوازا گیا تھا، وہ اس تصویر کو دیکھتے دیکھتے کھو سا گیا۔ یہی وہ دن تھا جب وہ یہ بات سمجھ گیا کہ اصل کامیابی کھلونے جمع کرنا اور کھیلنا نہیں بلکہ دل لگا کر تعلیم حاصل کرنا ہے۔ اسنے سارے کھیل تماشے چھوڑ کر جی جان سے محنت کرنا شروع کر دی اور رفتہ رفتہ تعلیمی میدان میں کامیابیاں حاصل کرتا رہا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسے روزگار کی فکر ستانے لگی اور اس کے دل

میں یہ بات گھر کر گئی کہ اچھا روزگار حاصل کرنا ہی بڑی کامیابی ہے۔ کچھ عرصہ ہاتھ پیر مارنے کے بعد اس کا یہ خواب بھی پورا ہو گیا اور وہ ایک سرکاری دفتر میں جونیر کلرک کے عہدے پر فائیز ہو گیا، جس کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ دھن کمانے کی فکر میں لگ گیا، ہر جائیز ناجائیز طریقے سے دولت کماتا رہا، رشوت خوری چاپلوسی اور جعلسازی کو اپنی چالاکی اور ذہانت سمجھتا رہا۔

''لیجئے جوس پی لیجے، صبح سے آپ نے کچھ نہیں کھایا ہے''۔

دفعتاً اس کی گھر والی عرشی مشروب بھرا گلاس اسکے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

''رکھ لیجئے، میں پی لوں گا''۔

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ ساری عمر عیش وعشرت اور لذیز کھانوں کا رسیا رہا تھا لیکن اب خرابی صحت کی وجہ سے اسے کچھ کھانے کی رغبت بھی نہیں رہی تھی۔ اس کا معدہ بڑی مشکل سے جوس اور بسکٹ ہضم کر پا رہا تھا، جس کے سبب اسے کافی نقاہت اور کمزوری بھی محسوس ہو رہی تھی اور وہ بغیر سہارے کے چل پھر بھی نہیں سکتا تھا۔

''کہاں کھو گئے ہیں آپ، ابھی تک جوس نہیں پیا''۔

عرشی کی آواز نے اس کے سوچنے کا طلسم توڑ دیا، اس نے جوس سے بھرا گلاس اٹھا کر پی لیا اور بغیر کچھ کہے واش روم کی طرف اشارہ کیا، عرشی سہارا دے کر اسے واش روم تک لے گئی۔ واپس آ کر عرشی نے اسے دوائیاں کھلائی کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر کسی کام کے سلسلے میں بازار گئی جس کے ساتھ ہی وہ دوبارہ زندگی کے لمبے سفر کو یاد کرتے ہوئے پریشان ومنتشر ذہن کی کتاب رفتہ رفتہ الٹنے لگا۔

روزگار ملنے کے بعد مالی حالت مستحکم ہونے کے ساتھ ہی گھر میں اس کی شادی کی باتیں ہونے لگیں تو وہ بھی شادی کے سنہرے خواب دیکھنے لگا، اسے یہ احساس ہو گیا کہ کسی اچھے گھرانے کی تعلیم یافتہ اور خوب صورت لڑکی سے شادی کرنا ہی اصل کامیابی ہے اور وہ اسی تگ ودو میں لگ گیا۔ کئی مہینوں تک ہاتھ پیر مارنے اور کافی سوچ بچار کے بعد آخر اسے عرشی، جو ایک سکول ٹیچر تھی، پسند آ گئی جس کے بارے میں ہر طرح کے معلومات حاصل کر کے اور پوری طرح سے اطمینان کے بعد بڑے ہی دھوم دھام سے اس سے شادی رچائی۔

عرشی، جو رعنائیوں سے بھرپور تھی، تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح اس کی زندگی میں آ گئی۔ اسے لگا جیسے اس کی زندگی میں نئی بہار آ گئی ہو اور کچھ عرصہ وہ اسی بہار کی مستی میں مست رہا۔ پھر جب بچے ہوئے تو ان کی پرورش میں لگنے کے ساتھ ساتھ دیگر چیزوں میں اس کی دلچسپی بڑھنے لگی جیسے نوکری میں ترقی، نیا بنگلہ، گاڑی وغیرہ اور وہ ان ہی چیزوں کو زندگی کی کامیابی کا اصل راز سمجھتا رہا۔ کئی سالوں کی سخت کوشش کے بعد آخر اس نے یہ ساری عیش و عشرت کی چیزیں حاصل کر لیں، تب تک اس کے بچے بھی بڑے ہو گئے تھے اور اسے ان کی اچھی تعلیم و تربیت کی فکر ستانے لگی اور وہ دن رات ایک کر کے انہیں تعلیم کے نور سے آراستہ کرتا رہا اسی دوران ترقی کے منازل طئے کرتے کرتے وہ سیکشن آفیسر کے عہدے تک پہنچ کر نوکری سے سبکدوش ہو گیا لیکن سب اپنے پرائے اسے ساری عمر ارشاد کلرک کے نام سے ہی پکارتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد ہی اس کے بڑے بیٹے کو سرکاری نوکری مل گئی تو اس نے اطمینان کی سانس لی دوسرے بیٹے نے بھی تعلیم مکمل کر لی اور اسے ان کی شادی کی فکر ستانے لگی اور وہ ان ہی کوششوں میں لگ گیا اور دونوں بچوں کی شادی بھی انجام دی گھر میں افراد خانہ کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ہی اس نے دوسرا بنگلہ بنانے کی ٹھان لی اور اسی تیاری میں جھٹ گیا لیکن اسی دوران اس کی صحت بگڑ گئی اور وہ بستر پر دراز ہو کر رہ گیا۔ کافی علاج و معالجہ کے باوجود بھی اسے کوئی خاص افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ اب وہ دنیا کی ساری آسائشوں کو بھول کر اور ساری کامیابیوں کو دھوکہ سمجھ کر اچھی صحت کو ہی بڑی نعمت اور کامیابی سمجھ رہا تھا......

''السلام علیکم.....''

وہ گہرے سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ دفعتاً اس کی سماعتوں سے آواز ٹکرائی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے اس کا دوست سجاد احمد کھڑا تھا، جسے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی کا رنگ چڑھ آیا، اس نے نحیف سی آواز میں سلام کا جواب دیا۔

''اب کیسی صحت ہے تمہاری؟''

سجاد نے اس کے سرہانے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بتاؤں میرے دوست، اچھے اچھے نامور ڈاکٹروں کے پاس علاج و معالجہ

کے باوجود دن بدن میری صحت گرتی ہی جا رہی ہے، سمجھ میں نہیں آرہا ہے کیا کروں''۔

کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''ہمت سے کام لو ارشاد، اللہ سب ٹھیک کردے گا''۔

سجاد نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔سجاد اس کا دوست تھا اور وہ دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے لیکن وہ ایک الگ ہی مزاج کا بندہ تھا دنیاوی لالچ اور ہوس سے بالکل دور۔دوست ہونے کے ناطے ارشاد کو بھی اکثر اچھی اچھی نصیحتیں کرتا تھا،لیکن ارشاد کہاں ماننے والا تھا اس پر تو کامیاب اور عیش وعشرت والی زندگی گزارنے کا بھوت بری طرح سوار تھا وہ سجاد کو کم عقل اور دقیانوسی خیالات والا انسان سمجھتا تھا اور اکثر اس کو اس کی کم عقلی پر کوستا تھا۔

''اچھا ارشاد اب میں چلتا ہوں، اللہ تم کو صحت وتندرستی سے نوازے''۔

کچھ وقت ارشاد کے پاس گزار کر سجاد نے اجازت چاہی۔

''جاؤ خدا کے حوالے، میرے لئے دعا کرنا اور آتے رہنا''۔

کہتے ہوئے ارشاد کی آنکھوں میں درد کا بیکراں سا اُمڈ آیا اور چہرے پر بے بسی اور لاچاری کی لکیریں رقص کرنے لگیں جب کہ سجاد کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں، تم تو میرے دوست ہو''۔

کہہ کر سجاد چلا گیا اور ارشاد کے ذہن کے پردوں پر سجاد کی کہی ہوئی باتیں فلم کے سینوں کی طرح چلنے لگیں.....

''ارشاد......تم کیوں مال وزر کمانے کے لئے اپنا ایمان خراب کر رہے ہو؟''

سجاد اکثر ارشاد سے کہتا تھا۔

''اس دنیا میں رہنا ہے تو شان سے رہنا چاہیے''۔

ارشاد مغرور سے لہجے میں جواب دیتا۔

''میرے بھائی، یہ دنیا ایک خوب صورت دھوکہ ہے ہم یہاں تھوڑی رہنے آئے ہیں، ہم تو یہاں سے گزر رہے ہیں، منزل کئی اور ہے''۔

سجاد عاجزی سے کہتا لیکن ارشاد، جس پر مادیت کا غلبہ سوار تھا، کا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ ابھی اتنی زندگی پڑی ہے دیکھ لیں گے۔ غرض اسنے کبھی سجاد کی کسی بات کو خاطر میں نہیں لایا نہ اپنی خرکتوں سے باز آیا۔ وہ ان ہی پریشان سوچوں کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا کہ اس کی بیوی ڈاکٹر کو لے کر آ گئی۔

''آپ بالکل پریشان نہ ہو جائیں، اللہ نے چاہا تو آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے''۔

ڈاکٹر نے اس کا تفصیلی طبعی معائینہ کرنے کے بعد روکھے سے لہجے میں کہا اور قلم اٹھا کر نسخہ لکھنے لگا۔ اسی لمحے ارشاد کو حاجت بشری کے لئے واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی جو کمرے کے ساتھ ہی منسلک تھا، بیوی نے اسے سہارا دیا اور واش روم کے دوازے تک لے گئی اور وہی کھڑی رہ کر اس کا انتظار کرنے لگی......

''مجھے افسوس سے کہنا پڑھ رہا ہے کہ درداب کافی بڑھ چکا ہے اور یہ صرف چند دنوں کے مہمان ہیں، اس لئے جی جان سے ان کی خدمت کریں.....''۔

وہ جونہی واپس نکلنے کے لئے دروازے پر پہنچا تو ڈاکٹر کے یہ الفاظ اس کی سماعتوں سے ٹکرائے جس کے ساتھ ہی اس کے عقل کے طوطے اڑ گئے۔

''یہ دنیا ایک خوب صورت دھوکہ ہے، ہم یہاں تھوڑی رہنے آئے ہیں، ہم تو یہاں سے گزر رہے ہیں، منزل کئی اور ہے''۔

سجاد کے یہ الفاظ ارشاد کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندنے لگے۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا اور وہ اوپر سے نیچے تک پسینے میں شرابور ہو گیا۔ وہ بڑی مشکل سے دروازہ کھول پایا اور اور بیوی نے اسے سہارا دیکر بستر پر بٹھایا۔

اب سمجھ گئے اصل کامیابی کیا ہے؟ زندگی کیسے غفلت کی دلفریب چادر اوڑھے ہاتھ سے سرکتے ریت کی طرح گزر گئی.....؟

اس کے اندر سے آواز آئی۔ اسنے ایک گہری سانس لی اور آنکھیں بند کر کے نہ جانے کن سوچوں میں غلطاں و پیچاں ہو گیا۔ اس کے چہرے سے پسینے کی قطروں کی طرح ٹپکتا کرب واضطراب اور پچھتاوا صاف نظر آ رہا تھا۔ ☆☆☆

میٹھا زہر

''ڈاکٹر صاحب......آج پھر دونوں بچے بیمار ہیں۔ بخار، پیٹ درد کے ساتھ ساتھ اب یہ اکثر سستی کے شکار رہتے ہیں...... پڑھائی میں بھی دل نہیں لگتا اور نہ ہی ٹھیک طرح سے کھا پی رہے ہیں''۔

وہ مسکین سے لہجے میں ڈاکٹر سے فریادی ہوئی۔

''میں نے کچھ دوائیاں لکھی ہیں یہ ان کو کھلانا ساتھ میں مقوی غذائیں جیسے تازہ پھل، سبزیاں اور دودھ وغیرہ بھی دیا کرو۔ یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے''۔

ڈاکٹر نے دونوں بچوں کا سرسری معائینہ کر کے الگ الگ نسخے لکھ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب......بچوں کے کھانے پینے کے معاملے میں میں کوئی کوتاہی نہیں......''۔

''یہاں کے اکثر بچے کمزوری کی وجہ سے ہی بیماریوں کے شکار ہو رہے ہیں......لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے''۔

ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹ کر اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا اور دوسرے بیمار بچے کا معائینہ کرنے لگا۔

''انگور لے لو انگور......تازہ میوے......رنگ دار میوے......رس دار میوے......''۔

وہ ابھی واپس گھر پہنچی ہی تھی کہ پھل بیچنے والے کی آواز اس کی سماعتوں سے

ٹکرائی۔اس نے فریج کھول کر دیکھا تو اس میں تھوڑے ہی میوے بچے تھے۔وہ جلد ہی نکلی اور گلی میں موجود ٹھیلے والے کے پاس پہنچی، میوے واقعی تازہ اور رنگ دار تھے۔آج اس نے خلاف معمول کئی قسم کے میوے جیسے انگور، تربوزے، خربوزے، کیلے وغیرہ کچھ زیادہ ہی مقدار میں خریدے اور بچوں کو جی بھر کے میوے کھلانے کے بعد ادویات کھلائی۔جس کے ساتھ ہی بچے ایسی گہری نیند میں چلے گئے جیسے انھوں نے نشیلی ادویات کھائی ہوں۔

''پتہ نہیں یہ دوائیاں اصلی ہوتی بھی ہیں کہ نہیں...... مجھے تو پورا یقین ہے کہ نقلی ہوتی ہیں، نہیں تو بچے ایک ہی بار ٹھیک ہو جاتے ہر دوسرے تیسرے دن بیمار نہیں ہو جاتے''۔

شانتی کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی...... اپنے معصوم بچوں جو بیماری سے کمزور اور نخیف ہو چکے تھے کو دیکھتے ہوئے وہ گہرے سوچوں میں کھوگئی۔حالانکہ وہ ہر طرح سے ان کا پورا خیال رکھتی تھی۔اچھی آمدنی کے سبب اچھا کھانا پینا، ہر قسم کے تازہ میوے، سبزیاں، دودھ اور گوشت سمیت اچھی غذاؤں کے ساتھ ساتھ جسمانی ورزش اور صفائی ستھرائی پر بھی خاص دھیان دیتی تھی، لیکن نہ صرف بچے ہر دوسرے تیسرے دن بیمار ہو جاتے تھے بلکہ اس کی اپنی اور شوہر کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ڈاکٹری علاج معالجہ کے ساتھ ساتھ وہ پیروں فقیروں کے دروازوں پر بھی حاضری دیتی تھی لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوتا تھا۔

''شانتی بہن......اب کیسی صحت ہے بچوں کی؟''

پریشان سوچوں کے تانوں بانوں میں گم شانتی کی سماعتوں سے دفعتاً رضیہ کی آواز ٹکرائی۔

''ابھی دوائی کھا کر سوگئے...... پتہ نہیں کس کے آنکھوں میں کیڑے پڑ گئے.....''۔

''گھبراؤ نہیں شانتی بہن اللہ شفا دے گا......میں نے یہ تھوڑا سا دودھ لایا ہے ان کو پلانا''۔

''ارے تم نے کیوں لایا......ہمارے پاس دودھ کی کوئی کمی ہے''۔

شانتی نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں بہن......تم بازار سے دودھ لاتے ہونا...... بازار کا کوئی بھی چیز اب

سادھارن نہیں ہوتا ہے''۔

کہتے ہوئے رضیہ بچوں کو دعائیں دیتے ہوئے واپس چلی گئی۔

''چڑیل کئی کی......جینا حرام کر رکھا ہے کمینی بانجھ عورت نے''۔

''شانتی دانت پیس کے رہ گئی''۔

رضیہ اس کی پڑوسن تھی، جو ایک تو سیدھی سادھی غربت کی زندگی گزار رہی تھی اور اللہ نے اس کو اولاد کی نعمت سے بھی محروم رکھا تھا۔ رضیہ کے جاتے ہی شانتی کی سہیلی نصرت آ گئی، جس کا اس نے بڑے خوشگوار انداز میں استقبال کیا اور ساتھ ہی بچوں کی بیماری کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا۔

''کیا بتاؤں شانتی......میں بھی سخت پریشاں ہوں، میرے بچوں کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی......اب ان کی یاداشت بھی کم ہو رہی ہے اور پڑھائی میں بھی دل نہیں لگتا''۔

پھر شانتی کے کان کے ساتھ مُنہ لگا کر رازدارانہ انداز میں بولی۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ یہ چڑیل بانجھ ہمارے بچوں پر جادو ٹونا کرتی ہے''۔

''یہی بات تو میں تم کو بتانے والی تھی......ابھی دودھ کا گلاس لے کر بچوں کی خبر پوچھنے آئی تھی، پتا نہیں کیا ملایا ہوگا اس میں''۔

کہتے ہوئے ناک سکیڑ کر اس نے دودھ کو باہر پھینک دیا اور باتوں کے ساتھ ساتھ نصرت کے لئے چائے بنانے میں مصروف ہوگئی۔

دوسرے دن صبح صبح ہی شانتی اور نصرت لمبی مسافت طئے کر کے جادو ٹونا نکالنے والے ماہر پیر بابا سے ملنے چھوٹی پہاڑی پر پہنچی اور پیر بابا کو تفصیل سے اپنی پریشانی بتاتے ہوئے انتہائی عاجزی سے درد کا درماں کرنے کی التماس کی۔ اپنی جنتھری کتاب کی ورق گردانی کر کے کچھ دیر مراقبے کی حالت میں رہنے کے بعد پیر بابا نے کہا۔

''کسی چڑیل نے آپ کے بچوں پر پُر خطر جادو کیا ہے، جس کو ناکارہ کرنا بہت کٹھن کام ہے......''۔

''کچھ کریجیے بابا......ہم پر ترس کھائے......''۔

شانتی نے بابا کے پیر پکڑتے ہوئے کہا اوراس کی نظر کرم حاصل کرنے کے لئے پرس سے کچھ نوٹ نکال کراس کی جولی میں ڈال دئے۔شانتی کی تقلید کرتے ہوئے نصرت نے بھی عجلت میں اپنا پرس کھول کر بابا، جواس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا، کی جولی بھردی۔بابا کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیلی،نوٹ سمیٹنے کے بعد لمبے سگریت کو شعلہ دکھا کر دھویں کو نتھنوں سے اگلتے ہوئے کچھ تعویز اور تبرک ان کو دئے اور بڑے ہی فنکارانہ انداز میں گویا ہوا۔

''زمانہ بڑا خراب ہے......جادوٹونا کرنے والے ظالم لوگ اپنی نیچ حرکتوں سے باز نہیں آتے......ایک کے بعد دوسرا حربہ استمال کرتے ہیں، خیراس وقت تم جاؤ لیکن آگے بھی مجھے حال چال بتاتے رہنا''۔

بابا سے رُخصت لے کرانہوں نے واپسی کی راہ لی۔چلچلاتی دھوپ میں چلتے چلتے نڈھال ہوکروہ سیٹھ شادی لال اور سیٹھ یوسف کے باغوں کے نزدیک ایک پیڑ کی چھاؤں میں دم سنبھالنے بیٹھیں اور باغوں کے اندر کے خوب صورت نظاروں سے محظوظ ہونے لگیں۔

''شانتی......کیوں نہ اندر جا کران باغوں کی سیر کرلیں اور کچھ میوے بھی خرید لائیں''۔

''میں بھی یہی سوچ رہی تھی لیکن پتہ نہیں یہ لوگ اندر جانے دینگے کہ نہیں''۔

''چلو دیکھتے ہیں''۔

ان کا یہ مسلہ جلد ہی حل ہوگیا کیوں کہ باغ کے پھاٹک پر موجود ملازم محمد طاہران کے پڑوس میں ہی رہتا تھا، جس کے ساتھ ان کی تھوڑی شناسائی بھی تھی۔باغ کے اندر جا کر قسم بہ قسم کے میوؤں سے لدے پھندے درخت دیکھ کران کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ایک طرف بنے لوہے کے ڈھانچوں پرلٹک رہی بے شمار انگور کی بیلیں قدرت کی کاریگری کا احساس دلارہی تھی تو دوسری طرف قسم بہ قسم کے سیب، ناشپاتی اور دوسرے ثمردار درخت دعوت نظارہ دے رہے تھے جب کہ ایک بڑے رقبے پر پھیلے خربوزوں اور تربوزوں کو دیکھ کران کی عقل دنگ رہ گئی۔باغ کے ایک حصے میں موجود ایک بہت بڑے گودام، جہاں لمبی گاڑیوں سے

میوے اتارے اور لدے جا رہے تھے، میں کیلے، سنترے، آم اور دوسرے انواع قسم کے میوے ٹنوں کے حساب سے موجود تھے...... کچھ دیر باغ کا چکر لگانے کے بعد تھک ہار کر دونوں ایک پیڑ کی چھاؤں میں ستانے بیٹھ گئیں تو محمد طاہر نے از راہ ہمسائیگی ٹھنڈا پانی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''کہیے باغ کیسا لگا؟''

''اس باغ کے کیا کہنے ...... یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا اور ہاں یہ نہیں سمجھنا کہ یہ میوے ہم چرا کر لائی ہیں، یہ ہم نے وہاں سے خریدے''۔

شانتی نے گودام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ارے شانتی بہن ...... کیسی بات کرتی ہو، لیکن ایک بات کہوں یہ میوے دو تین بار دھونے کے بعد ہی کھالینا اور ہاں بچوں کو ہرگز نہیں کھلانا''۔

''وہ کیوں؟''

نصرت نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''کیونکہ یہ میوے کھانے سے بچوں کو کئی طرح کی بیماریوں کا خطرہ ہوتا ہے''۔

''کیسی بات کرتے ہو محمد طاہر ...... اگلے وقتوں میں جب کوئی میوے خرید لاتا تھا تو پاس پڑوس والے خود ہی سمجھ جاتے تھے کہ گھر میں کوئی بیمار ہے''۔

''ہاں بہن ...... اگلے وقتوں میں بے شک میوے کھانے سے بیمار ٹھیک ہوتے تھے لیکن تب یہ بالکل سادھارن بغیر کسی ملاوٹ کے ہوتے تھے''۔

''تو کیا آپ بچوں کو بالکل بھی میوے نہیں کھلاتے''۔

''کبھی کبھی، لیکن بالکل شدھ اور صاف''۔

''وہ کیسے؟''

''یہ سیٹھ اپنے خاندانی استعمال کے لئے جو میوے رکھتے ہیں وہ ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک ہوتے ہیں، انہی میں سے''۔

''محمد طاہر ...... نقلی دوائیاں ...... دودھ، مسالے، تیل اور دیگر خوردنی اشیا کی

ملاوٹ کے بارے میں تو سنا ہے۔ لیکن میوؤں میں بھلا کیسے کوئی ملاوٹ کی جا سکتی ہے، یہ بات عجیب سی......؟''

اس کے گول مول سے جواب سے مطمئن نہ ہو کر شانتی نے استفار کیا تو محمد طاہر نے ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد اس کی بات کاٹتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

''کچھ مت پوچھو بہن ......ان میں کتنی مضر صحت ادویات ملی ہوتی ہیں، مادیت کے پجاری لوگ میوؤں کو مختلف بیماریوں سے بچانے......زیادہ پیداوار حاصل کرنے......میوؤں کا سائیز بڑھانے......وقت سے پہلے پکنے اور رنگ آنے کے لئے طرح طرح کی زہریلی کیمیکل کھادوں، ادویات اور انجکشنوں کا بے دریغ استمال کرتے ہیں، جس وجہ سے یہ سارے امرت جیسے میوے میٹھا زہر بن جاتے ہیں......میٹھا زہر......''

اس کی آواز میں سارے جہاں کا درد سمٹ آیا۔

اسی لمحے محمد طاہر کو کسی نے آواز دے کر بلایا اور وہ بات پوری ہونے سے پہلے ہی چلا گیا۔ شانتی اور نصرت جن کے عقل کے طوطے اڑ گئے تھے اور اندر باہر اتھل پتھل ہو چکے تھے، کچھ لمحے ایک دوسرے کا مُنہ تکنے کے بعد پریشان سوچوں کی بھول بھلیوں میں گم بوجھل قدموں سے گھروں کی طرف نکل گئیں۔

☆☆☆

سُلگتے ارمان

صبح کی فضا سورج کی کنواری کرنوں میں نہا رہی تھی، خوش لحن پرندوں کی سریلی آوازیں ماحول میں ترنم پیدا کر رہی تھیں۔ رشید بستر پر لیٹے اس پر کیف منظر سے محظوظ ہوتے ہوئے نہ جانے کن سوچوں میں گُم تھا کہ سرہانے رکھا اس کا موبائیل فون بج اٹھا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے فون اٹھایا۔

''ہیلو.....ہیلو.....دل افروز بات کرو.....کل پرسوں تک میں آجاؤں گا.....ہیلو ہیلو......''۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا اور فون منقطع ہو گیا۔ اس نے کئی بار واپس فون کیا، لیکن جواب ندارد۔ پہلے سے ہی پریشان رشید کو اب گھر کی یادوں نے بری طرح گھیر کر بے چین کر دیا۔ اپنی گھر والی دل افروز کا شکوہ بھرا چہرہ آنکھوں کے سامنے آگیا اور بچوں کی میٹھی توتلی آوازیں کانوں سے ٹکرانے لگیں۔

''ہائے میرے ارمان......''۔

کہتے ہوئے وہ بستر سے اٹھ کر دیوار پر آویزاں کلینڈر کو دیکھنے لگا تو اس کا جگر چھلنی ہو گیا، دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور بے قراری کے عالم میں مُنہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے۔

''نوکری چاکری پس از گداگری''۔

''شبیر.....تمہاری ڈیوٹی کا وقت ہو گیا''۔

''جناب''۔

اسی وقت آفیسر نے حکم سنایا اور وہ تیار ہو کر اپنا ریزہ ریزہ وجود لئے سوچوں کی بھول بھلیوں میں گُم کوٹھی کے صدر دروازے پر کھڑا ہو کر اپنی ڈیوٹی کرنے میں مصروف ہو گیا۔عید کی آمد میں اب صرف دو ہی دن بچے تھے اور وہ اس تہوار کے موقعے پر کسی بھی قیمت پر گھر جانا چاہتا تھا۔ کیوں کہ بیوی بچوں کی یادیں اسے زہریلے سانپ بن کر ڈس رہی تھیں۔ایک دور دراز علاقے میں تعینات ہونے کے سبب وہ لگاتار پچھلے کئی مہینوں سے گھر سے باہر تھا۔کافی تگ ودو کے بعد خدا خدا کر کے اگر چہ اس کا تبادلہ عمل میں آیا اور اپنے ہی قصبہ کے مضافات میں اس کی تعیناتی ہوگئی، لیکن آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق اسے چھٹی ملنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔اس نئی جگہ پر ڈیوٹی کرتے ہوئے ابھی اس کا تیسرا ہی دن تھا، ساتھیوں نے اس کو بتایا تھا کہ یہاں بڑے صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی بھی چھٹی پر نہیں جاسکتا اور صاحب کم سے کم ایک مہینے کی ڈیوٹی کرنے کے بعد ہی چند دن کے لئے کسی لڑکے کی چھٹی منظور کرتا ہے۔ بڑی پریشانی یہ تھی کہ صاحب اتنا کڑک اور سخت تھا کہ کوئی بھی لڑکا یہاں تک کہ ان کا انچارج آفیسر بھی اس کے سامنے جانے کی جرات نہیں کرسکتا تھا۔

شبیر دل ہی دل میں پیچ تاب کھاتے ہوئے چھٹی منظور کرانے کے لئے ترکیبوں پر غور کر رہا تھا کہ ایک نوکر کتوں کو سیر کرا کے واپس لایا اور واش روم میں لے جاکر شمپو سے ان کو نہانے لگا۔وہ اس نیت سے اس کے پاس گیا کہ شاید اس کی وساطت سے کوئی راہ نکل آئے۔

''بھائی صاحب......اعلیٰ نسل کے کتے ہیں، کہاں سے لائے ہیں''۔

''مجھے نہیں معلوم''۔

اس نے بدمزاج ساس کی طرح ناگواری کے انداز میں کہتے ہوئے واش روم کا دروازہ بند کر دیا۔شبیر دل ملول ہو کر واپس آ کر پھر سے سوچوں میں گم ہو گیا......کچھ دیر بعد ہی کتے واش روم سے باہر آ کر پارک میں نرم وملائیم سبزے پر بیٹھ کر دھوپ سینکنے بیٹھ گئے جب کہ ایک اور نوکر دودھ، بریڈ اور گوشت کے پارچے لے کر آیا اور کتے ٹھاٹھ سے کھانے

لگے۔ یہ منظر دیکھ کر اندر ہی اندر اس کو صاحب لوگوں کی زندگی پر رشک آنے لگا جب کہ اپنی محرومیاں ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگیں۔ وہ اچھا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود عارضی بنیادوں پر پولیس محکمے میں تعینات تھا اور اب کی بار کسی بڑے انتظامی افسر کی کوٹھی، جہاں دن اور رات میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا، کی محافظت پر تعینات ہوا تھا۔ وسیع عریض زمین کے ٹکڑے پر عالی شان کوٹھی.....سامنے قسم بہ قسم خوب صورت پھولوں سے مزین دلکش باغ.....اعلیٰ قسم کی قیمتی گاڑیاں.....نوکر چاکر، غرض ہر طرح کی ٹھاٹھ بھاٹھ و عیش آرام کی اعلیٰ شاہانہ طرز کی زندگی۔ ایک وہ تھا کہ معمولی سے مکان میں رہتا تھا۔ دن رات ڈیوٹی کرنے کے باوجود تنخواہ اتنی تھی کہ بڑی مشکل سے گھر کا گزارہ چلتا تھا۔ بچوں کے تعلیمی اخراجات اور دیگر گھریلو ضروریات بڑی مشکل سے پورے ہو پا رہے تھے۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مہینوں اپنے گھر اور اہل و عیال سے دور رہنا پڑتا تھا۔ اب کی بار تو حد ہی ہوگئی۔ وہ گھر جانے کے لئے بن جل کی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ وہ پریشان سوچوں کے تانوں بانوں میں اُلجھا تھا کہ ایک گاڑی آ کر صحن میں رک گئی، گاڑی کا دروازہ کھلتے ہی لذیذ پکوانوں کی خوشبو چاروں اور پھیل گئی۔ کچھ گھریلو ملازم فرتی سے آئے اور قسم بہ قسم کی ضیافتوں سے بھرے درجنوں دیگیں، مشروبات، مٹھائیاں اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں اتار کر اندر لے جانے لگے۔

''عید کی تیاریاں ہو رہی ہیں کیا؟''

اس نے ایک ملازم سے پوچھا۔

''نہیں، آج میم صاحب کا جنم دن ہے......''

اس نے مختصر سا جواب دیا اور خود سے کچھ بڑبڑاتے ہوئے جانے لگا۔ اسی لمحہ بڑا صاحب، جو چھٹی ہونے کے سبب گھر پر ہی تھا، بھی کوٹھی سے باہر آیا اور اسی ملازم پر برستے ہوئے شُشتہ انگریزی میں کئی انگلستانی گالیاں دی اور غصے کی حالت میں گاڑی میں بیٹھ کر باہر چلا گیا.....جنم دن کا سن کر اس کے سوچ کے ظلمت کدے میں ایک نیا روشن دان کھل گیا، دل میں امید کی ایک مدہم سی کرن جھلملائی اور چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ پھیل

گئی ......کچھ دیر بعد ہی مہمانوں، جن میں زیادہ تر خواتین شامل تھی کی آمد شروع ہوگئی، شام گئے تک میم صاحب کے جنم دن کی پارٹی بڑے ہی دھوم دھام اور طمطراق سے چلتی رہی۔اس دوران اس نے میم صاحب کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔وہ بھی ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائیز تھی اور ان کے بچے کسی بورڈنگ سکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔یہ جان کر وہ ایک نرم دل خاتون ہے اسے اپنی مراد پوری ہوتی نظر آنے لگی۔بڑا صاحب ابھی واپس نہیں لوٹا تھا جسے وہ اپنی خوش قسمتی سمجھ کر مہمانوں کے چلے جانے کے بعد موقعہ پاتے ہی دبے قدموں کوٹھی کے اندر داخل ہوگیا،کوٹھی اگرچہ رنگ برنگی ٹمٹماتی روشنیوں اور حنا کی عطر کی خوشبو میں نہا رہی تھی لیکن وہاں خاموشی اور ویرانی باہوں میں باہیں ڈالے اونگھ رہی تھیں۔دلہن کی طرح سجی سنوری میم صاحب، جو اسوقت اداسی کی حالت میں پلنگ پر گاؤ تکیے کے ساتھ بیٹھی ٹیلیویزن دیکھ رہی تھی، نے اسے دروازے پر کھڑا دیکھ کر پوچھ لیا۔

''کیا بات ہے''؟

''جی......جی......وہ میں نے سوچا کہ گھر میں کوئی کام ہو تو کرلوں''۔

''شکریہ بھائی......کام کے لئے تو گھر میں ملازم موجود ہیں،لیکن آپ ہو کون؟ اندر تو آجاؤ''۔

میم صاحب نے بڑے ہی مشفقانہ لہجے میں کہا جس سے حوصلہ پا کر وہ اندر داخل ہوگیا اور چھٹی کی عرضی اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''میڈم جی......میں یہاں سیکیورٹی ونگ میں تعینات ہوں''۔

''اچھا......اچھا......یہ کیا ہے''؟

''میڈم جی......یہ چھٹی کے لئے عرضی ہے......''۔

اس نے تفصیل سے اس کو اپنی پوری روئیداد سنائی۔

''قسمت کے لکھے کو ٹالا نہیں جا سکتا، فون کر کے گھر والی سے بات کیا کرو''۔

میم صاحب نے تھکے سے لہجے میں کہا۔

''میڈم جی......روز فون کر کے گھنٹوں بات کرتا تھا،لیکن اتنے دنوں سے گھر نہ

جانے کی وجہ سے اب وہ بہت ناراض ہے اور......میں سخت پریشان ہوں......''۔

''بڑی نصیب والی ہے وہ''۔

اس نے زیرلب بڑبڑاتے ہوئے ایک آہ کھینچی۔

''جی میڈم......''

''اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں آپ کے حق میں ایک مہینے کی چھٹی منظور کر لیتی''۔

اس نے معذرت طلب آواز میں کہا۔

''ایک مہینے کی نہیں میڈم......آپ بڑے صاحب کے پاس میری سفارش کر کے صرف تین دن کی چھٹی منظور کرا دیجئے، میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔صاحب آپ کی بات ہرگز نہیں ٹالے گا''۔

وہ لجاجت سے ہاتھ باندھ کر منتیں کرنے لگا......میم صاحب کا اندر باہر جیسے اتھل پتھل ہو کر رہ گیا، چہرے کے جغرافیہ میں ہلچل سی مچ گئی اور آنکھوں میں ایسے آنسوؤں کے ڈورے تیرنے لگے جیسے کسی نے اس کے برسوں پرانے زخم کو کریدا ہو۔

''آپ صرف چند مہینوں سے اپنی گھر والی سے دور ہو نا''۔

وہ کچھ توقف کے بعد رندھے سے لہجے میں گویا ہوئی۔

''جی میڈم''۔

''میں اور تمہارا صاحب پچھلے دس برسوں سے ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر بھی ندی کے دو کناروں کے مانند زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں''۔

اس نے جھرجھری لیتے ہوئے اکھڑے سانس کو قابو میں لاتے ہوئے کہا۔اس کی آواز میں سارے جہاں کا درد سمٹ آیا۔موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے یوں اس کے گالوں پر جھلملا رہے تھے جیسے نیلے آسمان پر جھلملاتے ستارے۔

☆☆☆

بے سمت قافلے

کئی ہفتوں تک برستی بارشوں، شدید ٹھنڈ اور چلچلاتی دھوپ میں ننگے پاؤں سمندروں، صحراؤں، جنگلوں اور بیابانوں کے پُرخطر اور دشوار گزار سفر کے بعد تھکے ماندے قافلے نے رات کی تاریکی میں ایک کھلی جگہ پر پڑاؤ ڈالا۔ یہاں پہلے ہی کچھ اور مہاجر لوگ قیام پزیر تھے۔ تھکاوٹ سے چور اور بھوک پیاس سے نڈھال قافلے والوں میں مرد و زن، بچے، بزرگ و جوان سبھی شامل تھے۔ تھوڑی دیر تک ستانے کے بعد بھوکے پیاسے قافلہ نے ندی کے ٹھنڈے پانی سے خود کو سیراب کر دیا اور ادھر اُدھر موجود درختوں کے نیچے ننگی گیلی زمین پر پھیل گئے کیوں کہ آسمان بادلوں کا نقاب اوڑھے ہوئے تھا اور ہلکی سی بونداباندی بھی ہو رہی تھی۔ اس بے یار و مددگار قافلے میں بہت سے لوگ بیمار تھے جب کہ کچھ زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے۔ قافلے میں شامل خوف سے سہمی ہوئی کمسن شوقی بھی ادھر اُدھر سے پتے جمع کر کے گیلی زمین پر ڈال کر ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی زخمی پنچھی کی طرح خالی خالی نظروں سے آسمان کی اور تکتے ہوئے گزرے ہوئے واقعات کو یاد کرنے لگی۔

شوقی کو ٹھیک سے یاد نہیں تھا کہ کتنے دن گزر گئے جب وہ اپنے گھر کے باہر اپنی ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھی کہ اچانک ایک شور سا بھرپا ہوا، جس کے ساتھ ہی گولیوں کی دل دہلا دینے والی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں اور کچھ گھروں سے آگ کے شعلے بلند ہو گئے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر بدحواسی کے عالم میں روتے چیختے بھاگنے لگے۔ ان قیامت خیز حالات میں معصوم بچے، عمر رسیدہ مرد و خواتین کچلی جا رہے تھے۔

بہت سے ہتھیار بند لوگ، جن کے خونخوار چہرے غیض وغضب سے تمتما رہے تھے، بھوکے شیروں کی طرح بے رحمی سے نہتے لوگوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ درجنوں لوگ زخموں سے چور، زمین پر پڑے کراہتے ہوئے ان سے زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے، لیکن ان ظالموں کے دل رحم سے بالکل خالی تھے اور وہ اپنا خونین رقص جاری رکھنے پر بضد تھے۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ دس سال کی شوقی، جواب لوگوں کی بھیڑ کے ساتھ بھاگتی جارہی تھی، نے دور سے ہی دوسرے گھروں کے ساتھ ساتھ اپنے گھر سے بھی آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھے تھے۔ وہ بہت روئی، تڑپی، مچلی لیکن چاہ کر بھی کچھ نہ کرسکی اور جان بچانے کی خاطر اپنا ریزہ ریزہ وجود لئے بھاگتی ہی چلی گئی۔ بھیڑ جس طرف بھی بھاگتی گئی وہ بھی برابر اس کا حصہ رہی۔ اس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اچانک اپنے ہی وطن میں ان پر یہ قیامت کیوں کر ٹوٹ پڑی اور نہ وہ یہ جانتی تھی کہ وہ کہاں جارہے ہیں؟ ان کی منزل کیا ہے؟ سمندروں، جنگلوں اور بیابانوں سے چلتے چلتے ہفتے گزر گئے۔ نہ ان کے سونے کا کوئی وقت متعین تھا نہ جاگنے کا۔ قافلے کے دوسرے لوگوں کی طرح شوقی کو کھانے کو بھی کچھ خاص نہیں ملتا تھا۔ کبھی کسی بستی سے گزرتے ہوئے چھوٹی بچی سمجھ کر کوئی روٹی کا ایک آدھ ٹکڑا دیتا تھا، جب کہ اکثر درختوں کے پتوں جنگلی پھلوں اور ناصاف پانی پر ہی گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ اس سفر میں بھوک کی شدت، سردی، بخار اور دوسری بیماریوں کی وجہ سے درجنوں لوگوں نے جنگلوں اور بیابانوں میں تڑپ تڑپ کر اپنی جانیں گنوائی تھیں۔

''شوقی بٹیا...... میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں، کہاں چلی گئی تھی تم؟''

''اماں ں ں......''۔

دفعتاً اپنی ماں کو دیکھ کر شوقی بے ساختہ اس سے لپٹ کر زاروقطار رونے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ ماں سے کچھ بات کرتی اس کی آنکھ کھل گئی اور محض چند ساعتیں نیند کی آغوش میں رہ کر وہ خوابوں کے جزیرے سے واپس اپنی دنیا میں لوٹ کر پھر سے سوچوں میں کھو گئی۔ ماں، بابا اور اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کی یادیں اس سے کبھی جدا ہوتی ہی نہیں تھیں۔ وہ اکثر ان کو خوابوں میں دیکھتی، ان سے باتیں کرتی۔ کبھی دیکھتی کہ ماں اس کے بال سنوارتی ہے،

کبھی اس کو نئی چوڑیاں پہناتی ہے، اس کے چھوٹے بھائی کو لوری سناتی ہے وغیرہ۔ عالم خواب میں اسے لگتا تھا کہ کچھ ہوا ہی نہیں ہے، لیکن جیسے ہی اس کی آنکھ کھل جاتی تو اس کے معصوم دل پر چھریاں چل جاتی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی لگ جاتی۔ رات بھر پریشان سوچوں کے تانے بانے میں اُلجھتی رہیں شوقی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ سورج کی کنواری کرنیں کب زمین کو چُھو گئیں اور خوش گلو پرندوں کی سریلی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔ وہ اٹھ کر آس پاس کے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ یہ پہاڑوں سے گھری خوب صورت جگہ تھی جہاں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ کچھ دوری پر بہت سے اونچے اونچے مکان دکھائی دے رہے تھے جنہیں دیکھ کر اس کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی شہر کے نزدیک ہیں۔ چند منٹ تک ہی اردگرد کا جائیزہ لے کر اس نے ندی پر پانی کے چند گھونٹ پیئے اور واپس جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی کیوں کہ بھوک سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ قافلے میں شامل دوسرے لوگوں کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ لحہ بہ لحہ سورج کی گرمی میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان بارش میں بھیگے لوگوں کو سردی سے کسی حد تک راحت محسوس ہونے لگی۔ ان کے گیلے کپڑے سوکھنے لگے لیکن بھوک سے ان کا برا حال تھا...... سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد ان لوگوں کی خوشیوں کا تب کوئی ٹھکانہ نہیں رہا جب پاس کی بستی کے باشندے، جن میں ہر مذہب کے ماننے والے تھے' کھانے پینے کا سامان، کپڑے اور ادویات لے کر آئے اور ان میں بانٹ دیئے۔ ان کے ساتھ کچھ وقت گزار کر ان کا درد بانٹا اور انہیں ہر طرح کی مدد کا یقین دلایا۔ لوگوں کے اس بھائی چارے اور مخلصانہ انسانی ہمدردیوں کو دیکھ کر قافلے کے بزرگوں نے اب اسی جگہ مستقل قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ ان کے واپس اپنے گھروں کو جانے کے امکانات بالکل معدوم تھے اور یہاں کے راجاؤں کو بھی ان کے یہاں قیام کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ کئی دنوں سے بھوکی شوقی پیٹ بھر روٹی کھاتے ہی نیند کی میٹھی وادی میں چلی گئی...... نیند کے دوران اس کو اپنی پیشانی پر کسی کے شفقت بھرے ہاتھوں کے لمس کی گرمی کا احساس ہوا تو آنکھ کھل گئی۔ سامنے اپنے چاچا کو دیکھ کر یہ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں کہ شاید وہ خواب دیکھ رہی ہے۔ کچھ پل بعد جب اس کو یقین ہو گیا کہ وہ سچ مچ بیدار ہو چکی

ہے تو آنکھیں کھول دیں۔ سامنے چاچا کو موجود پاکر اس کے چہرے پر خوشی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات نمودار ہو گئے، کیونکہ آج وہ ہفتوں بعد کسی اپنے کو دیکھ رہی تھی ورنہ اذیت ہی اس کی ساتھی...... آنسوں اس کے رفیق...... بھوک اس کی پڑوسن...... چیخ و پکار اس کے غمگسار...... کراہیں اس کی ہمراز اور ننگی زمین اس کا بستر تھی۔

''طالب چچا......''۔

وہ ایک دم اٹھ کر اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ طالب، جو ایک دوسرے قافلے کا حصہ تھا اور اس قافلے میں اپنوں کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کی نظر شوقی پر پڑی تھی، اس کو دلاسہ دیتا رہا۔

''طالب چچا...... میری اُمی ابو اور......؟''

''بیٹی...... تمہاری اُمی، چھوٹا بھائی اور بہن یہاں سے کچھ دوری پر ایک خیمے میں ٹھہرے ہیں، لیکن تمہارے ابو اور میرے بیوی بچوں کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں، زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ چلو بیٹی، اپنی ماں کے پاس''۔

کہتے ہوئے طالب، بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں میں پوشیدہ طغیانی کو روک پایا، نے اس کا ہاتھ تھاما اور وہ وہاں سے نکل گئے۔

''طالب چچا...... ہمیں اپنے وطن سے کیوں نکالا گیا؟ وہ لوگ کون تھے؟ ہم نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟؟؟''

چلتے چلتے معصوم شوقی نے چچا سے کئی چبھتے سوال پوچھے اور وہ جواب دیتا رہا۔

دراصل وہ اپنے ہی وطن میں طاقت کے نشے میں چُور انسانیت اور محبت کے خلاف برسرِ جنگ مخصوص جنونی دنگائی ذہنیت رکھنے والی درندہ صفت وحشی قوتوں کی قہرمانیوں کا نشانہ بنے تھے اور سینکڑوں انسان بشمول چھوٹے چھوٹے بچے خون میں نہلائے گئے تھے، جب کہ بہت سے گھر اُجاڑ دیے گئے تھے۔ ظلم کی چکی میں پس رہے وہ بے سروسامان کمزور و مفلس لوگ انصاف کی دہائی دیتے رہے...... ان کی چیخ و پکار فضاؤں میں گونجتی رہی...... فلک نے آنسوں بہائے...... دھرتی سوگوار ہوئی، لیکن طاقت کے نشے میں چور مفادات

کے اسیر دھرتی کے سنگ دل منصف نہ پگھلے ،جنھوں نے ان کی پُر درد صداؤں کو ہواؤں کا شور سمجھ کر نہ صرف یکسر نظر انداز کر دیا بلکہ انسانیت کی دعویدار کئی سلطنتوں نے کسی مدد کے بجائے ان پر مختلف الزامات لگا کر انہیں پناہ دینے سے انکار کرتے ہوئے ان پر اپنی سرحدیں بند کر دیں تھیں ۔ کچھ وقت بعد شوقی اپنی ماں ، بھائی اور بہن کے پاس پہنچی تو اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ان کے معمولی خیمے میں جیسے نئی بہار آ گئی ، کچھ دیر ماں کے ساتھ لپٹ کر اشک بہانے کے بعد وہ اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کو پیار کرنے لگی اور ماں بچوں کے لئے روٹی کا انتظام کرنے کے لئے خیمے سے باہر گئی۔

شام کو ماں کی ہاتھ سے روٹی کھا کر شوقی کو بے پناہ تسکین ملی اور وہ سرور کی کیفیت میں ماں کی گود میں سر رکھ کر سکون کی نیند سو گئی ۔اس کا چھوٹا بھائی اور بہن بھی نیند کی دیوی سے گلے مل گئے جب کہ ان کی پریشان ماں اور چاچا گہرے سوچوں میں ڈوب گئے ......

کچھ دیر بعد اچانک شور وغل سنائی دینے لگا اور چاچا صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

''بہن اٹھو، جلدی سے چلنے کی تیاری کرو''۔

وہ الٹے پاؤں اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے واپس آ کر گویا ہوا۔

''بھائی صاحب.....آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''بہن.....ان لوگوں کو ہمارا یہاں رہنا بھی منظور نہیں ہے''۔

''کن لوگوں.....؟''

''اے چلو.....چلو.....جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ، ورنہ سب کو کاٹ کر رکھ دینگے.....دہشت گرد سالے''۔

ہتھیار بند جنونیوں کی گرجدار آواز سے شوقی اور اس کا چھوٹا بھائی اور بہن جاگ کر سہم گئے۔ان کی ماں لوگوں سے مانگ مانگ کر معمولی سا سامان گھٹری میں باندھنے لگی لیکن چند لمحوں بعد ہی ان غنڈوں نے خوفناک انداز میں چلاتے ہوئے توڑ پھوڑ اور ان مہاجروں کی بے رحمی سے پٹائی شروع کر کے دہشت مچا دی۔

''بہن......اگر جان پیاری ہے تو جلدی سے نکل جاؤ''۔

''آخر یہ لوگ ہیں کون؟؟؟ یہاں کے تمام مذاہب سے وابستہ لوگ تو ہمارے مددگار تھے''۔

اس نے گھبراہٹ کے عالم میں گٹھری ایک طرف پھینکی اور کمسن بیٹے کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''وہی جنہوں نے ہمارے گھروں کو تخت و تاراج کیا، انسانیت کے دشمن ان بیمار ذہنیت والے خونی جنونیوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے''۔

طالب نے روتے ہوئے کہا اور اسی وقت یہ بے آسرا مہاجرین یہ جگہ چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں روتے بلکتے قافلوں کی صورت میں نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے۔

☆☆☆

شہ رگ

موسم کے تیور کچھ اچھے نہیں تھے، آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارشیں بھی ہو رہی تھیں۔ جہاز سے اتر کر وسیم نے ایک لمبی انگڑائی لی اور کچھ دیر طیران گاہ کی نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے بعد ٹیکسی لے کر فرط نشاط وانبساط میں جھومتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ دوران سفر وہ اپنی دھرتی کے بدلے بدلے مناظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سڑک کے دونوں اطراف میں اونچے اونچے خوب صورت بنگلے، تجارتی کمپلکس، شوروم اور دیگر نئی کنکریٹ تعمیرات کی بھرمار اور بیچ بیچ میں خالی اراضی کے ٹکڑے بالکل بنجر اور ویران حالت میں......

''بھائی صاحب.....آج ہماری دھرتی کا منظر ہی بدل گیا ہے؟''

اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''ہاں صاحب.....اب وہ پرانا زمانہ نہیں رہا بہت ترقی ہوئی ہے یہاں۔ دیکھئے تو کیسی نئی نئی کالونیاں اور دیگر عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں''۔

اس نے فخریہ لہجے میں شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن صاحب.....خراب موسم نے بہت پریشان کیا ہے''۔

اس نے کچھ توقف کے بعد آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا، وسیم نے اس بات میں سر ہلایا اور نظارے دیکھتے ہوئے سوچوں میں گم ہو گیا۔ وسیم اچھا تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ کافی ذہین، باہمت اور محنتی لڑکا تھا جو آنکھوں میں خوشحال

زندگی کے خواب سجائے ہوئے روزگار کمانے کے لئے بیرون ملک گیا ہوا تھا اور آج کئی برسوں بعد واپس اپنے وطن لوٹا تھا۔ جب وہ گیا تھا تو سچ مچ اتنی ترقی نہیں تھی۔ نئی نئی کالونیاں اور اونچے اونچے تجارتی کمپلکس نہیں تھے۔ اتنی زیادہ گاڑیاں بھی نہیں تھیں۔ سڑک کے دونوں اطراف دور دور تک ہرے بھرے میوہ باغات اور لہلہاتے کھیت ہوا کرتے تھے جنہیں دیکھ کر انسان کے روح کو تراوت ملتی تھی۔ اراضی کا ایک بھی ٹکڑا اس طرح بے کار نہیں ہوتا تھا۔ وسیم کی وادی کو اوپر والے نے بے پناہ حسن و جمال کے ساتھ ساتھ بہت ساری نعمتوں سے نوازا تھا۔ گھنے جنگلات ...... برف سے ڈھکے فلک بوس پہاڑ...... اچھلتی کودتی ندیاں...... خوب صورت جھیل اور جھرنے ...... معتدل آب وہوا...... یہاں کی جفاکش آبادی کا زیادہ حصہ زراعت کے پیشے سے وابستہ تھا اور لوگ باگ اول بہار ہی کھیت کھلیانوں میں ڈیرا ڈال کر قسم بہ قسم کی زرعی اشیا وافر مقدار میں حاصل کر کے خود بھی استعمال کرتے تھے اور دوسرے ضرورت مندوں کے لئے بازار میں بھی دستیاب دکھتے تھے...... سوچتے سوچتے وسیم کو اپنی وادی کے لوگوں کی تقدیر پر دل ہی دل میں فخر ہو رہا تھا جب کہ سونے پہ سہاگہ کے مانند تعمیر ترقی اور خوشحالی کی نئی جیتی جاگتی نشانیوں کو دیکھتے ہوئے اس کا دل باغ باغ ہو رہا تھا......

''صاحب...... کس طرف جانا ہے''؟

سوچوں کی بھول بھلیوں میں گم وسیم کی سماعتوں سی دفعتاً ڈرائیور کی آواز ٹکرائی۔

''ہاں...... اس طرف''۔

خیالات کے خول سے باہر آ کر اس نے توجہ سے باہر جھانک کر ایک گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد ہی وسیم اپنے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ ان کا گھر اب وہ چھوٹا مکان نہیں تھا جس میں وہ کبھی رہتا تھا بلکہ رنگ وروغن سے سجا ایک خوب صورت تین منزلہ بنگلہ اور صحن میں ایک قیمتی گاڑی بھی تھی۔ جس کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں نہ صرف بہت زیادہ خوش ہو گیا بلکہ اس کو اپنے بڑے بھائی پر سخت فخر محسوس ہونے لگا۔ جس نے اس کی غیر حاضری میں ہی ترقی کے وہ منازل طئے کئے تھے جن کے خواب سجائے وہ بیروں ملک چلا گیا تھا۔

واقعی ہمارے یہاں بہت ترقی ہوئی ہے۔

بڑبڑاتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گیا تو پورا گھر خوشیوں سے جھوم اٹھا۔ گھر والوں کی طرف سے خوب خاطر داری اور دیر رات تک ان کے ساتھ باتوں میں مصروف رہنے کے بعد گھر کے حالات سے مطمئن ہو کر وسیم سرور کی کیفیت میں بستر پر لیٹ کر اپنے مستقبل کے خوابوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ دیر رات تک سنجیدگی سے سوچ بچار کے بعد آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی تجارت شروع کرنے کے ساتھ ساتھ جدید خطوط پر استوار کر کے اپنے آبائی پیشے سے جڑا رہنا مناسب رہے گا۔ کیوں کہ ان کے پاس ایک ایکڑ میوہ باغ اور اس سے کچھ زیادہ زرعی کھیت تھا۔ جس پر وہ خوب محنت کر کے اچھی آمدنی کے ساتھ ساتھ سال بھر کے لئے اناج، سبزی، دالیں وغیرہ حاصل کرتے تھے۔ وسیم جس نے بیرون ملک خون پسینہ بہا کے اچھی کمائی کی تھی، نے اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے کچھ اور اراضی خریدنے کا بھی من بنا لیا۔

''اگر آپ آج بھی بازار سے خریداری نہیں کر پائے تو بہت پریشانی ہو جائے گی''۔

صبح وہ ابھی ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ وسیم کی بھابھی سرگوشی کے انداز میں اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر بولی۔

''نہیں نہیں......راجہ ابھی شہر جا کر ساری چیزیں لائے گا''۔

اس نے مختصر سا جواب دیا اور ایک فہرست اپنے بیٹے کو سونپ کر شہر روانہ کر دیا۔

''بھیا......میں تھوڑا باغ میں گھوم کے آتا ہوں''۔

کچھ دیر بعد وسیم بھی جانے کے لئے اٹھا۔

''ہاں ہاں شوق سے جاؤ......وہاں ہمارا نیا مکان زیر تعمیر ہے اور شاپنگ کمپلکس کے لئے میں نے میٹیریل بھی ڈلوایا ہے''۔

اس نے فخریہ لہجے میں وسیم کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ کئی برسوں بعد تازہ سیب اور ناشپاتی کھانے کی چاہت میں وسیم جب خوشی خوشی باغ میں پہنچا تو اس کا دماغ چکرانے لگا کیوں کہ ہرا بھرا میوہ باغ، جسے اس کے باپ نے اپنے ہاتھوں سے لگا کر ساری عمر اپنے خون پسینے سے سینچا تھا، بانجھ عورت کی کوکھ کی طرح ویران ہو چکا تھا۔ زیر تعمیر مکان اور

شاپنگ کمپلکس کی تعمیر کی آڑ میں ثمر دار درختوں کو بڑی بے رحمی سے کاٹ دیا گیا تھا۔ خستہ حالت میں کھڑے کچھ بچے کھچے پیڑوں، جن کے اوپر ایک دانہ بھی میوہ نہ تھا، کو دیکھ کر اس کے دل پر چھریاں چلنے لگیں۔ جگہ جگہ خارزاد جھاڑیاں اور بھنگ کے پودے اُگ آئے تھے، جب کہ اردگرد کے دوسرے ثمر دار باغات بھی تعمیرات کی زد میں آکر خود اپنی بربادی کی داستان بیاں کر رہے تھے۔ کچھ وقت اداسی کی حالت میں وہاں گزار کر اس نے دل ہی دل میں اولین فرصت میں باغ کو نئے سرے سے آباد کرنے کی ٹھان لی اور افسردگی کی حالت میں واپس نکل آیا۔ چلتے چلتے بازار میں اس نے ایک بند دکان کے سامنے لمبی قطار میں سینکڑوں مردوزن کو کھڑا دیکھا اور دوسرے لوگ بھی تیزی سے آکر قطار میں شامل ہو رہے تھے لیکن جلدی میں ہونے کے سبب وہ لوگوں کے اس ہجوم کو نظر انداز کر کے چلا گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے دبے الفاظ میں باغ کی ویرانی پر اپنی ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے بھائی کو اپنے ارادوں سے بھی باخبر کر دیا اور پھاوڑا لے کر اُلٹے پاؤں واپس جانے لگا۔

''اب کہاں جا رہا ہے؟''

''میں اپنی کھیت پر سے گھوم کے آتا ہوں''۔

''کھیت......کونسا کھیت.....؟''

''ارے بائی پاس پر اپنا جو ایک ایکڑ سے زیادہ زرعی کھیت ہے وہی''۔

''وسیم......میں تو آپ کو بتانا بھول ہی گیا تھا کہ وہاں اب ہمارا کوئی کھیت نہیں ہے......ترقی کے اس دور میں کھیتی باڑی کا ٹینشن کون لیتا ہے......؟''

''کیوں؟؟؟''

''دیکھو وسیم......برادری کے دوسرے لوگوں کے ساتھ برابری کرتے ہوئے اتنا اچھا مکان بنایا میں نے......گاڑی خریدی......دوسرے مکان پر کام چل رہا ہے اور شاپنگ کمپلکس کے لئے ساز و سامان بھی خریدا...... یہاں سب نے ایسا ہی کیا اور میں......''۔

''اور دیکھا دیکھی میں آپ نے بھی اپنے پیروں پر کلہاڑی ماردی''۔

وسیم، جس کے کانوں میں جیسے پگھلتا ہوا سیسہ اتر گیا، نے انگلی دانتوں تلے دباتے

ہوئے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔اسی لمحہ راجہ شہر سے واپس لوٹا اور فہرست اپنے باپ کے حوالے کرتے ہوئے گویا ہوا۔

''پاپا......شہر کے بازار میں بھی قحط جیسی صورت حال ہے اور ہاہا کار مچی ہوئی ہے۔چاول، سبزی، دودھ، گوشت سمیت کوئی بھی چیز دستیاب نہیں ہے اور لوگ پریشانی کی حالت میں در بدر بٹک رہے ہیں۔سرکاری راشن سٹور پر بھی چاول کا ایک دانہ بھی دستیاب نہیں ہے''۔

''چند دن سڑک کیا بند ہوگئی کہ قحط پڑ گیا......کیسی زندگی ہے یہ؟؟؟''

وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے ہارے ہوئے جواری کے مانند اپنا سر پیٹنے لگا۔

''بھیا......اپنی شہہ رگ کاٹ کر ترقی کے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کا بھیانک انجام ہے یہ''۔

کہہ کر وسیم ایک نئے عزم کے ساتھ پھاوڑا لے کر باغ کی طرف چل پڑا جب کہ اس کا بھائی بند راشن سٹور کے سامنے لوگوں کی لمبی قطار میں شامل ہوگیا۔

☆☆☆

خواب حقیقت

''کیا واقعی تم سچ بول رہے ہو؟''

میری بات سن کر خالہ کو یقین نہیں آیا اور اسنے حیران کن لہجے میں پوچھا۔

''ہاں خالہ......جھوٹ کیوں بولوں، میں بالکل سچ کہتا ہوں''۔

''لیکن......؟ خیر میں شام کو آرہی ہوں، وہیں فرست سے بات کریں گے''۔

کچھ لمحے حیرت واستعجاب سے مجھے دیکھتے ہوئے خالہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے خالہ، لیکن ضرور آجانا''۔

میں نے خالہ سے کہا اور کچھ وقت باغ میں بیٹھ کر بچپن کی خوشگوار یادوں کو تازہ کر کے واپس گھر کی طرف چلا گیا۔ دراصل آج چھٹی تھی، موسم بھی خوشگوار تھا اور میں صبح صبح ہی باغ کی طرف چلا گیا، خالہ بھی اپنے باغ میں تھی، میں اس کے پاس گیا اور علیک سلیک کے بعد وہیں باتیں بتا دیں جو میں کئی دنوں سے اُسے بتانا چاہتا تھا۔ گھر پہنچ کر میں چند ہفتے پہلے پیش آئے واقع کو لے کر گہرے سوچوں میں ڈوب گیا۔

اس دن میں دفتر سے جلد ہی واپس آیا اور حسب معمول سیدھے بڑی اماں کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بستر پر تکئے سے ٹیک لگائے بشاش انداز میں بیٹھی تھی۔ میں نے بلند آواز میں السلام علیکم کہا تو مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دینے کے بعد وہ گویا ہوئی۔

''آ گئے پتر.....''۔

''جی اماں.....آ گیا، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

"خدا کا شکر ہے، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔تو جلدی سے کپڑے بدل کر آجاؤ اور چائے پی لے، دیکھ بھوک سے تمہاری آنکھیں مرجھا گئیں ہیں"۔

یہ اس کا معمول تھا، اگر میں دعوت کھا کے بھی گھر آجاتا تو وہ کہتی تھی کہ جلدی سے کچھ کھا پی لے، بھوک سے تمہاری آنکھیں مرجھا گئیں ہیں اور جب تک اس کی آنکھوں کے سامنے میں کچھ کھا نہ لیتا اس کو قرار نہیں آتا تھا۔میں اپنے کمرے سے کپڑے بدل کر آیا اور اس کے بغل میں بیٹھ کر چائے پینے لگا۔اس نے ہاتھ بڑھا کر تکئے کے نیچے سے تین چار اخروٹ نکالے اور روشنی، جو چائے لے کر آئی تھی، کو دیتے ہوئے کہا۔

"روشنی بٹیا......جلدی سے ان کی گریاں نکال کر لے آؤ"۔

وہ ہر روز تکئے کے نیچے یا پیرہن کے جیب میں کچھ نہ کچھ جیسے سیب، اخروٹ، انار، کیلے وغیرہ چھپا کر رکھتی تھی اور جب میں گھر آتا تھا تو چپ کے سے مجھے تھما دیتی تھی، اب مجھے یاد بھی نہیں ہے کہ یہ سلسلہ کب سے چلا آرہا تھا۔اماں پچھلے دو تین دن سے بیمار تھی لیکن یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ وہ اب بالکل ٹھیک ہو چکی تھی۔کوئی دس گیارہ سال پہلے اماں اسی سردی کے موسم میں اتنی سخت بیمار ہوئی تھی کہ ہم نے اس کے بچنے کی امید ہی چھوڑ دی تھی۔اس دوران ایک صبح تیز بارش ہو رہی تھی اور میں اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ دفعتاً اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں گرنے لگے۔

"اماں......کیا بات ہے، آپ کیوں رونے لگی......؟"

"پتر......مجھے تمہاری فکر کھائی جا رہی ہے"۔

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کیوں اماں؟"

"اگر مجھے اللہ کا بلاوا آگیا تو تم کیا کرو گے......بارش کی وجہ سے تم کو......"۔

"کیسی باتیں کرتی ہو اماں۔تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی"۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔چند دنوں تک سخت علیل رہنے کے بعد وہ واقعی بالکل ٹھیک ہوگئی اور آج تک کبھی بھی اتنی شدید بیمار نہیں ہوئی، البتہ سردیوں کے موسم

میں کمزوری اور کبھی کبھی معمولی بیمار ہوتی تھی لیکن مجھے ہمیشہ ڈر رہتا تھا کہ کئی اماں اُس دن کی طرح زیادہ علیل نہ ہو جائے لیکن اللہ کی مہربانی سے ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ بالکل صحت مند زندگی جیتی رہی۔

وہ میری ماں نہیں تھی لیکن میں نے جب ہوش سنبھالا تھا تو اپنے آپ کو اسی کی آغوش محبت میں پایا تھا۔ وہ صبح اذان سے پہلے کھڑی ہو جاتی تھی اور دیر رات تک گھر کے کاموں میں اُلجھی رہتی تھی۔ شام کو تھک ہار کر بیٹھ کے مجھے اچھی اچھی نصیحت آموز کہانیاں سناتی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتی تھی جیسے پانی لانے کے لئے چشمے پر، گاؤ خانے میں، باغ، باغیچے یا کھیتوں میں، کسی دعوت میں یا کسی تعزیت پر میں بھی اس کا دامن پکڑے اس کے ساتھ ساتھ ہوتا تھا، میں ایک پل کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ میں سکول جانے کی عمر کو پہنچ گیا۔ میں تو اُسے چھوڑ کر ایک پل کے لئے بھی کئی جانے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا لیکن اسنے بڑے ہی پیار سے سمجھا بجھا کر مجھے سکول جانے کے لئے راضی کر دیا اور گھر کے نزدیک ہی ایک نجی سکول میں میرا داخلہ کرایا۔ وہ صبح سیب، اخروٹ، انار یا کوئی کھانے کی چیز دے کر مجھے خود سکول تک چھوڑتی تھی اور دن میں ایک دو بار مجھے دیکھنے ضرور سکول آتی تھی۔ دوپہر کے وقفے کے وقت میں دوڑتے دوڑتے کھانا کھانے کے لئے آتا تھا تو وہ گھر کے باہری دروازے پر میری منتظر ہوتی تھی اور مجھے گود میں اٹھا کر اندر لے جا کر بڑے ہی پیار سے کھانا کھلاتی تھی۔ اس کی ایک عادت بالکل منفرد تھی وہ جب بھی کھانا پروستی تھی جب تک کھانے والا، وہ جو بھی ہوتا، فارغ نہ ہوتا وہیں رہتی تھی اور کھانے والے سے پیار اور خوش گفتاری سے بار بار پوچھتی اور کچھ مت چاہئے، اور چاول لے لو، سالن ہے وغیرہ۔ مجھے تو وہ بڑے ہی نرالے انداز میں کھلاتی تھی اور واپس سکول چھوڑتے وقت ایک روپیہ اور کبھی کبھی دو روپے دیتی تھی اور چھٹی کے وقت دروازے پر میرا انتظار کرتی تھی۔ گھر میں کچھ وقت میرے ساتھ گزار کر مجھے ہوم ورک کرنے کے لئے کہتی اور خود بھی کام میں مصروف ہو جاتی یہاں تک کہ میرا داخلہ پہلے مڈل پھر ہائی سکول میں ہو گیا اور میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگا لیکن یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا اور اماں کے پیار، برتاؤ اور میرے ناز

اٹھانے میں ذرا بھی فرق نہیں آیا، سوائے اس کے کہ وہ مجھے زندگی کے انمول اسباق، جیسے صحیح اور غلط میں فرق کرنا، استادوں اور بزرگوں کا احترام، اللہ پر بھروسہ اور ہمیشہ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرنا وغیرہ سے روشناس کراتی تھی اور میری ناپسندیدہ حرکات پر مجھے ٹوکتی بھی تھی لیکن مجھ پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھاتی تھی۔

میں نے جب سے شعور کی آنکھ کھولی تو اس کے بارے میں ایک چیز میں نے ہمیشہ محسوس کی کہ وہ ہمیشہ سادہ زندگی گزارنا پسند کرتی تھی۔ اس کے پاس جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ اسی پر مطمئن اور خوش رہتی تھی اور ہر حال میں اللہ کا شکر بجالاتی تھی۔ وہ کبھی بھی اپنے شریک سفر سے اپنے لئے کسی بھی چیز کی فرمائش نہیں کرتی تھی اور نہ کبھی اس کی کسی بات کو ٹالتی تھی۔ اسے اللہ نے بیٹیوں سے نواز کر بیٹے کی نعمت سے محروم رکھا تھا لیکن میں نے اس کی زبان پر کبھی حرف شکایت نہیں دیکھا۔ میں نے پوری زندگی اس کو بغیر پیرہن کے نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی اس کے سر سے چادر کو کبھی گرتے دیکھا ہے۔ اس کا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہتا تھا، وہ کبھی کسی سائیل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتی تھی، وہ ہمیشہ دوسروں کو دیتی تھی لیکن کبھی کسی سے کچھ مانگتی نہیں تھی۔

”پتر...... تجھے بھوک لگی ہوگی“۔

میں اماں کے پاس بیٹھے اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دفعتاً اس کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

”ہاں اماں...... کھانا کھانے کا وقت ہوگیا“۔

میں نے کہا تو اس نے روشنی کو آواز دی۔

”روشنی... اے روشنی... ذرا جلدی سے کھانا لاؤ......“۔

”آئی اماں جی......“۔

کچھ لمحوں بعد ہی روشنی کھانا لے کر آگئی۔

”اماں جی...... آپ بھی کھانا کھائیں“۔

روشنی نے پانی اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”نہ بٹیا...... مجھے بھوک نہیں ہے“۔

''اماں......آپ نے مرغے کا سوپ بنانے کو کہا تھا، میں نے بالکل تمہاری پسند کا بنایا ہے''۔

''اچھا میں بعد میں سوپ کے ساتھ روٹی کھاؤں گی''۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور روشنی کو دعائیں دینے لگی۔

کھانا کھانے کے بعد میں دیر تک اس کے ساتھ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ موبائیل پر نیٹ بھی چلاتا رہا۔ ماں اور خالہ، جو بہت دنوں بعد ملی تھیں، بھی ایک طرف بیٹھ کر باتوں میں مصروف تھیں۔

''چل پتر اب سو جا......تمہیں نیند آ رہی ہے''۔

''اماں......پہلے آپ کچھ کھاؤ''۔

''ہاں......کھاؤں گی''۔

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو میں نے روشنی کو آواز دی جو سوپ اور روٹی لے کر آ گئی۔ اماں نے تھوڑے سے سوپ کے ساتھ روٹی کا ایک ٹکڑا کھایا اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''اب خوش ہو پتر......جا اب سو جاؤ''۔

میں سونے کے لئے اٹھا تو حسب معمول وہ مجھے دعائیں دینے لگی جس دوران نہ جانے اس کی آنکھیں کیوں نم ہو گئیں۔ میں اس بات پر بہت مسرور تھا کہ اماں کی طبیعت ٹھیک ہو گئی، لیکن ساتھ ہی اس بات کی فکر بھی ہو رہی تھی کہ اماں بہت کمزور ہو گئی ہے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ کل ہی ڈاکٹر سے اماں کی کمزوری کے بارے میں بات کروں گا تا کہ اس کی کمزوری کا علاج ہو سکے اور وہ آرام سے چل پھر سکے، کیوں کہ اماں کی آرزو تھی اور وہ اللہ سے ہمیشہ یہ دعا بھی مانگتی تھی۔

''میرے مولا......مرتے دم تک ہوش و حواس، آنکھوں کی روشنی اور جسم کی تندرستی برقرار رکھنا، چلنے پھرنے سے کبھی معذور نہیں کرنا اور موت کی سختی سے بچانا''۔

اماں کے بارے میں سوچتے سوچتے ہی میں نہ جانے کب نیند کی میٹھی آغوش میں

چلا گیا......

دفعتاً میں نے اماں کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو میں جٹ سے کمرے سے نکل گیا، اماں واش روم کی طرف جا رہی تھی۔

''اماں.....کہاں جا رہی ہو......؟''

''پتر......وضو بنانے جا رہی ہوں''۔

''اچھا......''۔

میں نے کہا اور اماں کے کمرے میں داخل ہو گیا اور اس کی بیٹی یعنی خالہ، جو اس رات اتفاق سے ہمارے گھر آئی تھی اور اماں کے پاس ہی سوئی تھی، سے پوچھا۔

''خالہ.....اماں ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں......بالکل ٹھیک ہے، رات کو ایک دوبار اٹھی، خود ہی پانی پیا اور سو گئی''۔

''اچھا.....''۔

میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر بعد اماں واش روم سے واپس آ گئی اور بستر میں تکئے سے ٹیک لگا کر بیٹھی، اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نظر آ رہیں تھیں''۔

''اماں کیا بات ہے، آپ ٹھیک تو ہو نا؟''

''پتر......میرا دل تیز تیز دھڑک رہا ہے، شاید......''۔

''کچھ نہیں ہوگا اماں......آپ ٹھیک ہو''۔

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں پتر، میرا آخری وقت آ گیا، اب کیا کروں؟''

''ماں.....تم کلمہ پڑھو''۔

خالہ نے اسے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹی، تم میرا تکیہ اس طرف پھیرو''۔

اماں نے تھکے سے لہجے میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس طرف آخری وقت پر انسان کا تکیہ رکھا جاتا ہے۔

"اماں......اب میں کروں؟"

جب میں سمجھ گیا کہ اماں ہمیں چھوڑ کر جانے والی ہے تو میں نے روتے ہوئے کہا۔

"روتے نہیں پتر......میں تمہیں کہتی تھی نا کہ دنیا ایک ناپائیدار چیز ہے......
میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گیں"۔

اماں نے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان بکھیرتے ہوئے نخیف سے لہجے میں کہا اور آنکھیں بند کر کے تکئے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، چند لمحوں تک اس کی زبان ہلتی رہی پھر وہ بستر پر لیٹ گئی اسی لمحہ اس کے سرہانے بیٹھی خالہ نے نم آنکھوں سے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہوئے چادر اس کے چہرے پر ڈال دی......

"اٹھو......جلدی اٹھو"۔

میری بیوی روشنی نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تو میں ہڑبڑاتے ہوئے خوابوں کے دنیا سے باہر آگیا۔

"کیوں، کیا بات ہے؟"

"اماں......اماں....."۔

روشنی نے روتے ہوئے کہا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن درد کی ایک تیز ٹیس میرے پورے وجود میں دوڑ گئی اور میں انتہائی عجلت میں اماں کے کمرے میں پہنچا تو اماں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو چکی تھی۔ میری ماں، جس نے اپنی ساری زندگی بڑی اماں جو اس کی ماں تھی، پر نچھاور کر دی تھی، سخت صدمے میں تھی اور خالہ نم آنکھوں سے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

آج جب میں نے خالہ کو اپنا خواب سنایا تو اس کو یقین نہیں آیا۔ شام کو خالہ آئی ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد میرے پوچھنے پر اس نے بتایا......

"کیا بتاؤں، صبح تم نے جو کہا......میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ خواب ہے یا حقیقت؟"

☆☆☆

لمحہ گُریزاں

بھیانک کالی رات اور اسپتال کے خوف زدہ کرنے والے ماحول میں فکر و اضطراب میں ڈوبی خدیجہ ایمر جنسی وارڈ میں چار پائی پر بے ہوش پڑے اپنے شوہر کے سرہانے بیٹھی حالت ندامت میں اللہ سے بخشش طلب کرتے ہوئے اس کی صحت یابی کے لئے دُعا کر رہی تھی۔شوہر کی اچانک اس طرح حالت بگڑنے پر وہ انگشت بدنداں تھی جب کہ گھر میں موجود بیٹی، جس کا پاؤں بھاری تھا، کی فکر بھی اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔

اس کا شوہر حفیظ دن بھر کی کٹھن دوڑ دھوپ سے فارغ ہو کر شام کو جب گھر پہنچا تو اس کا انگ انگ درد کی شدت میں ڈوبا ہوا تھا، رنج والم کی بے شمار لکیریں اس کے ماتھے پر رقص کر رہیں تھیں۔وہ بغیر کچھ کھائے پئے گُم سم کمرے میں دبک کے بیٹھ گیا.....دیر رات اس کے سر میں درد کی شدید لہریں اٹھنے لگیں اور وہ سخت بے قراری کی حالت میں اپنا سر پیٹنے لگا۔کچھ دیر بعد ہی اس کے نتھنوں سے خون ٹپکنے لگا۔خدیجہ نے اس سر پر ٹھنڈا پانی ڈالا اور کئی دوسری تدابیر آزمائی لیکن بے سود۔جب نتھنوں سے خون کے پھوارے پھوٹنے لگے تو خدیجہ نے چند پڑوسیوں کی مدد سے اس کو اسپتال پہنچایا۔

''خدیجہ......وہ...وہ بے چا......''۔

قریب آدھی رات کو بے ہوشی کی حالت میں اس کے ہونٹ دیرے سے بڑبڑائے۔خدیجہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی لیکن وہ بدستور کوما جیسی حالت میں ہی تھا۔خدیجہ کے بار بار پکارنے پر بھی اس نے لب کھولے نہ آنکھیں...خدیجہ کے چہرے پر

افسردگی کی برف جم گئی، وہ اس کے چہرے، جسے جیسے سارا خون نچوڑ لیا گیا تھا، کو تکتے ہوئے گہرے سوچوں میں ڈوب گئی......

حفیظ صبح حسب معمول خوش وخرم بازار کی طرف نکلا تھا۔ چوراہے پر پہنچ کر اس کا سامنا بستی کے آسودہ حال کھڑپینچ مقبول خان سے ہوا جس کے ہاتھ میں دس اور پانچ روپے کے کچھ نوٹ تھے۔ اسے کچھ بات کرنے سے پہلے ہی اس کا دھیان علی احمد کی بیوہ زونی کی طرف گیا جو بس سٹاپ کے نزدیک ایک دکان کے تھڑے پر درد سے تڑپ رہی تھی جب کہ اس کی جوان بیٹی بے بسی کی حالت میں اس کے پاس بیٹھی تھی اور ارد گرد کئی تماش بین گپ شپ میں مصروف تھے۔ حفیظ لپک کے وہاں گیا اور زونی کا حال دریافت کرنے لگا۔

زونی دوران شب ہی بیمار ہوئی تھی۔ صبح جب بیٹی نے اس کو مقامی اسپتال پہنچایا تو وہاں ایک خاکروب کے سوا کوئی بھی موجود نہیں تھا، لیکن اسپتال کے بغل میں موجود دوا فروش نے اس کا طبعی معائینہ کرکے اس کی خراب طبعی حالت کے پیش نظر اسے فلفور علاج کے لئے شہر کے اسپتال میں لے جانے کا مشورہ دیا۔ مشورہ سن کر بے چاری لڑکی، جس کے ہاتھ بالکل خالی تھے، کے پاؤں تلے زمین کھسکنے لگی اور وہ گھبرا کر خوف زدہ ہرنی کی طرح مدد کے لئے ہاتھ پیر مارنے لگی۔ اسی لمحے مقبول خان کا گزر وہاں سے ہوا اور زونی کے حالات جان کر اس کی غیرت جاگی، اس نے بڑے ہی چاؤ سے دس روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کردی.....

لڑکی روتے ہوئے حفیظ کو اپنی روداد سنا رہی تھی تو مقبول خان بھی آدھمکا اور ہاتھ میں موجود رقم لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے مغرور لہجے میں بولا۔

''پورے بازار میں گھوم پھر کے میں نے تین سو روپے جمع کئے ہیں، یہ لے اور جلدی سے زونی کو شہر لے جا''۔

لڑکی نے روپے لئے اور مایوس نگاہوں سے ماں کی اور تکنے لگی کیوں کہ تین سو روپے میں علاج تو کیا شہر پہنچنا بھی ممکن نہیں تھا۔ زونی کی حالت دیکھ کر حفیظ ماہی بے آب کی طرح تڑپ اٹھا، اس کے دل میں کانٹے سے چبھنے لگے۔

''حوصلہ رکھو بیٹی ...... اللہ سب ٹھیک کر دے گا، جب تک میں واپس نا آؤں تم یہی رکنا''۔

اس نے مقبول خان کی طرف نفرت اور غصے سے بھرپور نظر ڈالتے ہوئے لڑکی کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے شفقت بھرے لہجے میں کہا اور الٹے پاؤں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے واپس گھر پہنچ گیا۔

''خدیجہ...... وہ تمہارے پاس کچھ روپے ہیں وہ مجھے دے دو...... جلدی''۔

''وہ جو لیلیٰ کے لئے ......''۔

''ہاں...... وہی، ذرا جلدی کرو...... میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے''۔

اس نے خدیجہ کی بات کاٹتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔

خدیجہ نے اس کی تشویش کو بھانپتے ہوئے جلدی سے رقم نکال کر اس کے حوالے کر دی۔

''میں شہر جا رہا ہوں ......''۔

کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے واپس نکلا۔ حفیظ جو مالی لحاظ سے زیادہ خوشحال نہیں تھا نے یہ دو ہزار روپے اپنی بیٹی، جس کا پاؤں بھاری تھا، کے لئے سنبھال کے رکھے تھے تاکہ ضرورت پڑنے پر کام آسکیں۔ اس کے جاتے ہی خدیجہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے کیوں کہ بیٹی کی زچگی کا وقت قریب تھا اور گھر میں اب ایک پھوٹی کوڑی بھی موجود نہیں تھی۔

حفیظ گھر سے نکل کر سیدھے خواجہ رحیم کی دکان پر پہنچ گیا اور اسے کچھ رقم ادھار مانگی جو اس نے بغیر کسی پس و پیش کے دے دی کیوں کہ حفیظ پوری بستی میں نہ صرف اپنی سچائی اور ایمانداری کے لئے مشہور تھا بلکہ صحیح معنوں میں درد دل رکھنے والا اس چنار کے مانند تھا جو خود تپتی دھوپ میں جلتا ہے لیکن تھکے ماندے مسافروں کو ٹھنڈی چھاؤں فراہم کرتا ہے۔ خواجہ رحیم سے رقم لے کر وہ دوڑتے ہانپتے بس سٹاپ پر پہنچا۔ اس پر نظر پڑتے ہی زونی کی بیٹی، جو عالم یاس و اضطراب میں بے چینی سے اس کی راہ تک رہی تھی، کی نم آنکھوں

میں امیدوں کے جگنو چمکنے لگے۔ حفیظ نے وقت ضایع کئے بغیر عجلت میں زونی کو ایک سومو گاڑی میں سوار کیا اور خود بھی اسی کے ساتھ شہر کی طرف روانہ ہوا۔ زونی کی نازک حالت کے پیش نظر اس نے ڈرائیور سے گاڑی تیز چلانے کی عاجزانہ گزارش کی جس سے متاثر ہو کر ڈرائیور نے سڑک کی خستہ حالی کے باوجود گاڑی کی رفتار بڑھادی، تب جا کے حفیظ کو کچھ اطمینان سا ہوا۔ اب اس کی ایک نظر زونی کے چہرے پر تھی تو دوسری نظر یہ دیکھتی تھی کہ سفر کتنا طئے ہو گیا۔ آدھے سے زیادہ سفر طئے کرنے کے بعد گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ آگے سڑک پر رکی ہوئی گاڑیوں کی لمبی قطار دیکھ کر وہ تذبذب میں مبتلا ہو کر ہاتھ ملنے لگا۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ ضروری سہولیات کی عدم دستیابی کے سبب لوگ سرکار کے خلاف بطور احتجاج سڑک پر دھرنا مار کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ حواس باختگی کے عالم میں دھرنے کی جگہ پر پہنچ گیا جہاں درجنوں مرد و زن بیچ سڑک پر بیٹھ کے سرکار کے خلاف جم کر نعرے بازی کر رہے تھے۔ جب کہ کچھ کھڑ پیچ اندھوں میں کانے راجے بنے ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ حفیظ نے انتہائی عاجزی سے غم زدہ لہجے میں اس یقین کے ساتھ انہیں پوری روئیداد سنادی کہ مریضہ کی نازک حالت اور اس کی بزرگی کا پاس لحاظ کرتے ہوئے وہ انہیں جانے کی اجازت دیں گے۔ لیکن ان کانے راجوں پر اس کی فریاد کا کچھ اثر نہ ہوا۔ انہوں نے اس کی ایک نہیں سنی اور متکبرانہ انداز میں ٹوکتے ہوئے کہا۔

''جب تک نہ حکام بذات خود یہاں آ کر ہمارے مسائل حل کریں گے ہم کسی بھی گاڑی کو جانے کی ہرگز اجازے نہیں دیں گے''۔

اگر چہ احتجاج کرنے والوں میں شامل چند لوگوں نے بیماروں کو جانے دینے کی فہمائیش بھی کی لیکن کھڑ پینچوں کی ہڑ دھرمی کی وجہ سے بات نہیں بنی۔ زندگی اور موت کے درمیان تڑپ رہے ایک انسانی جان کے تئیں اس قدر غیر انسانی روئے پر حفیظ کے وجود میں ہل چل مچ گئی۔ تاسف اور تمیش کے ملے جلے جذبات سے اس کا چہرہ خشم ناک ہو گیا لیکن حالات کی نزاکت کے پیش نظر اس کے پاس خاموش رہ کر زہر کا گھونٹ پینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ بے بس ہو کر واپس آیا۔ زونی کی حالت لمحہ بہ لمحہ نازک ہوتی جا رہی تھی

جب کہ ماں کی بگڑتی حالت دیکھ کر بیٹی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔ یہ تکلیف دہ صورت حال حفیظ کے لئے کسی بڑے عذاب سے کم نہیں تھی۔ اس کا پریشان دماغ موٹر کے پہیے کی طرح گھومنے لگا اور جلد ہی اس کے دماغ میں ایک نئی ترکیب سوجھی۔ اس نے ڈرائیور کو واپس جا کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کو کہا جو اگرچہ کافی طویل تھا لیکن اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ڈرائیور نے آنا کانی کرنی چاہی تو حفیظ نے سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''ہم یہاں بیٹھے بیٹھے ایک انسانی جان کے ساتھ کھلواڑ نہیں کر سکتے۔ تمہیں جتنے روپے چاہیں مجھ سے لے لو لیکن ہمیں جلدی سے اسپتال پہنچادو''۔

روپیوں کی بات سن کر ڈرائیور بھیگی بلی بن گیا اور بغیر کسی چوں چرا کے گاڑی واپس موڑ کر نئے راستے سے تیز رفتاری سے سفر شروع کیا۔

قریب ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد شہر میں داخل ہوتے ہی وہ پھر سے بری طرح سے پھنس گئے۔ چھوٹی بڑی گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں وقفے وقفے سے چند قدم رینگ کر رک جاتی تھیں اگرچہ ڈیوٹی پر موجود پولیس اہلکار صورت حال کو سنبھالنے اور ٹریفک کی روانی کو بحال کرنے کی کوششیں کر رہے تھے، لیکن گاڑیوں کے سیلاب کے آگے ان کی یہ کوششیں رائیگاں ثابت ہو رہی تھیں۔ زونی، جس نے اب تڑپنا اور کراہنا بھی چھوڑ دیا تھا، کی حالت بہت زیادہ بگڑ چکی تھی، اس کی سانسیں اگرچہ اب بھی چل رہی تھیں لیکن اس کی آنکھیں پژمردہ اور چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا، وہ ایک بے جان لاش کی طرح گاڑی میں پڑی تھی۔ حفیظ، جو اس کی حالت پر بن جل کے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا سخت بے چینی کی حالت میں گاڑی سے نیچے اترا اور پولیس اہلکاروں کی منت سماجت کرنے لگا۔

''چاچا...... ہم کیا کر سکتے ہیں...... یہاں کے لوگ قاعدے قانوں کو کسی خاطر میں ہی نہیں لاتے ہیں...... اپنی ہی من مانیوں اور غلط ڈرائیونگ کی وجہ سے خود بھی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہمارے لئے بھی مسائیل کھڑے کر دیتے ہیں......''۔

ڈیوٹی پر موجود ایک پولیس آفیسر نے فنکارانہ انداز میں اپنا پلو جھاڑتے ہوئے

کہا۔ وہ ناامید ہوکر واپس آیا اور زونی کی بیٹی جو گاڑی میں زار وقطار رو رہی تھی کو دلاسہ دینے لگا۔قریب آدھا گھنٹہ اسی حالت میں رہنے کے بعد اچانک چمتکار ہوگیا۔ایک زوردار سائیرن بجنے کے ساتھ ہی ڈیوٹی پر موجود پولیس اہلکار ایک دم متحرک ہوگئے اور لال بتیوں والے موٹروں کے قافلے کا گزر بغیر کسی رکاوٹ کے ممکن بنانے کے لئے بڑی مستعدی سے جارحانہ انداز میں اپنا فرض نبھانے لگے،جس کے نتیجے میں چند منٹوں میں ہی ٹریفک کی روانی بحال ہوگئی اور ان کی گاڑی بھی اسپتال کی طرف چل پڑی۔

''او مائی گاڑ......بہت دیر ہوچکی ہے''۔

امرجنسی وارڈ میں داخل کرکے اس کا معائینہ کرنے والے ڈاکٹر نے انگلی دانتوں تلے دباتے ہوئے کہا اور بڑی مستعدی سے اس کا علاج شروع کیا لیکن بے سود۔علاج شروع ہونے کے کچھ دیر بعد ہی زونی نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور اپنی بیٹی پر ایک بھرپور حسرت بھری نگاہ ڈالنے کے بعد حفیظ کی طرف دیکھتے ہوئے تھکے سے لہجے میں گویا ہوئی۔

''میں اپنی اس یتیم اور بے کس بچی کو تمہیں سونپتی ہوں.....اس کا خیال رکھ....''۔

بات پوری ہونے سے پہلے ہی زونی کا دم گھٹ کر گلے میں پھنس گیا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں،جس کے ساتھ ہی اس کی جوان بیٹی اپنے بال نوچنے لگی جب کہ حفیظ،جس کے پورے وجود میں درد کی ایک ٹیس بجلی کی سی رفتار میں دوڑ گئی،ہکا بکا ہوکر رہ گیا۔اسے لگا کہ اس کے پیروں تلے زمین شک ہو رہی ہے۔

''خدیجہ......خدیجہ......''۔

صبح کی پو پھٹتے ہی پریشان سوچوں کی بھول بھلیوں میں کھوئی خدیجہ،جس پر اب غنودگی سی چھا گئی تھی،کی سماعت سے دفعتاً حفیظ کی آواز ٹکرائی۔

''ہاں ہاں بولو......میں یہیں ہوں''۔

اس نے محبت اور مٹھاس بھرے لہجے میں کہا۔حفیظ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ڈاکٹر وارڈ میں داخل ہوکر حفیظ کا طبعی معائینہ کرنے لگا۔

''ڈاکٹر صاحب......اب کیسی حالت ہے ان کی''۔

خدیجہ نے پوچھا۔

''یہ اب بالکل ٹھیک ہیں، تھوڑی کمزوری ہے جو چند دن کے آرام سے ٹھیک ہو جائے گی۔اب آپ گھر جا سکتے ہو''۔

ڈاکٹر نے نسخے پر کچھ لکھتے ہوئے کہا اور چلا گیا جس کے ساتھ ہی حفیظ، جس کی آنکھوں میں درد کا بیکراں سا پنہاں تھا، خدیجہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''خدیجہ......وہ......وہ بے چاری بے کس زونی بے موت مر گئی، اگر وقت پر اسپتال پہنچ گئی ہوتی تو شاید......''۔

کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار نکل کر رخساروں پر بہنے لگی جب کہ خدیجہ جس کی آنکھوں کی نمی پہلے ہی بغاوت پر آمادہ تھی، کی آنکھوں سے بھی موٹے موٹے آنسو ایسے گرنے لگے جیسے موم کے گرم گرم قطرے قطار در قطار ٹپکتے ہیں ۔

☆☆☆

بے اعتنائی

"زبیر...... تم پڑھائی پر بالکل دھیان نہیں دے رہے ہو، اگر تم نے اپنا رویہ نہیں بدلا تو ہم تمہیں امتحان میں ہرگز بیٹھنے نہیں دیں گے"۔

پرنسپل نے کلاس کے معائینے کے دوران تحقیر آمیز لہجے میں زبیر کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ کلاس میں طلباء و طالبات کے سامنے پرنسپل کے اس تذلیل آمیز رویے سے زبیر کے چہرے کے جغرافیہ میں ہل چل مچ گئی اور آنکھوں کے تالاب بھر گئے۔ پرنسپل کے جانے کے بعد استاد نے بھی اسے ڈانٹا اور بچوں کو پڑھانے لگا، لیکن زبیر، جس کے حساس دل میں کانٹے سے چبھنے لگے، پڑھتا کیا، سخت اُداسی کی حالت میں سوچوں میں غلطاں و پیچاں ہو گیا......۔

"زبیر بیٹا...... تیرا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟"

زبیر جب اپنا ریزہ ریزہ وجود لئے سکول سے واپس گھر پہنچا تو اس کے چہرے کی کتاب پڑھ کر اس کی دادی نے پوچھا۔

"دادی ...... ٹیچر مجھے روز ڈانٹتے ہیں۔ گھر میں مجھے کوئی پڑھاتا نہیں ہے اور سبق ....."۔

کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں گرنے لگے۔

"روتے نہیں بیٹا...... بھیا سے کہہ دو وہ تمہیں پڑھائے گا اور تمہاری ممی بھی تو پڑھی لکھی ہے"۔

"دادی......ممی اور بھیا میری بات ہی نہیں سنتے ہیں......"۔

اس نے جھنجھلا کر رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اچھا بیٹا......تو کھانا کھالے، میں ان سے کہہ دوں گی''۔

دادی نے کھانا اس کے سامنے رکھتے ہوئے پیار سے کہا۔ دسویں میں زیرِ تعلیم زبیر اگرچہ پڑھائی میں کمزور تھا لیکن من لگا کر پڑھائی کرتا تھا۔ دادی کئی دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ زبیر کھویا کھویا سا رہتا ہے اور ٹھیک سے کھا پی بھی نہیں رہا ہے، لیکن اب وہ زبیر کی اُلجھن کو اچھی طرح سمجھ گئی۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر دادی زبیر کے بارے میں بات کرنے کے لئے اس کی ماں کے کمرے میں گئی تو وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔

''بہو تم ٹھیک تو ہو نا......؟''

''ماں جی......میرا سر دکھ رہا ہے اور کمر میں بھی درد ہے''۔

''اچھا تم آرام کرو......دفتر سے تھک ہار کر آنے کے بعد اس بے چاری کو گھر کا سارا کام بھی کرنا پڑتا ہے''۔

خود کلامی کرتے ہوئے وہ وہاں سے واپس نکلی اور زبیر کے بڑے بھائی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن کئی بار دروازہ کھٹکھٹانے اور آوازیں دینے کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

''پتہ نہیں آج کے بچوں کو یہ کیا لت پڑی ہے کہ اندر سے دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں''۔

بڑبڑاتے ہوئے وہ زبیر کی بہن کے کمرے کی طرف گئی لیکن کچھ سوچتے ہوئے اسے کچھ کہے بغیر ہی واپس مڑ کر کچن میں چلی گئی اور مایوسی کی حالت میں سوچوں میں گم ہو گئی۔

زبیر کا باپ ایک تجارت پیشہ شخص تھا اور صبح نکل کر دیر گئے گھر واپس آتا تھا، اس کی ماں سرکاری ملازم تھی جسے گھر کا سارا کام بھی خود ہی کرنا پڑتا تھا جب کہ اس کا بڑا بھائی یونیورسٹی اور بہن کالج میں زیرِ تعلیم تھی، لیکن وہ دونوں گھر آکر اپنے اپنے کمروں میں دروازے بند کر کے بیٹھتے تھے، صرف کھانے کے وقت کچن میں آتے تھے اور اسی وقت گھر کے دوسرے لوگوں کو ان کے درشن نصیب ہوتے تھے۔

''دادی......جلدی سے کھانا دے دو بہت بھوک لگی ہے''۔

یہ بلال کی آواز تھی، جس کے ساتھ ہی گھر کے دوسرے افراد بھی کچن میں آ گئے اور کھانا کھانے بیٹھ گئے۔

''بلال......میں نے تمہیں کتنی بار کہا کہ تھوڑا وقت نکال کر زبیر کو پڑھایا کرو۔ گھر میں سبھی پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اسے کوئی پڑھاتا نہیں اور یہ بے چارہ پریشان رہتا ہے''۔

دادی نے بلال، جو ایک ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے موبائل فون چلا رہا تھا، سے مخاطب ہو کر کہا لیکن اسنے ایسے نظر انداز کیا جیسے سنا ہی نہیں۔

''آگ لگے ان موبائل فونوں کو... بلال میں تم سے کچھ کہتی ہوں''۔

دادی نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔ جس کے ساتھ ہی ماں نے بھی بلال سے زبیر کو پڑھانے کی تاکید کی۔

''کوئی بات نہیں دادی، میں دیکھ لوں گا۔ ویسے اسے پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے اتنے اچھے سکول میں جو پڑھ رہا ہے''۔

بلال نے سرد لہجے میں کہا اور فون پر کسی سے باتیں کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دادی نے زبیر کی بہن کو بھی اسے پڑھانے اور گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹانے کے لئے کہا لیکن موبائل فون سے مگن ہونے کے سبب اس نے کوئی توجہ نہیں دی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''یہ کیسی زندگی ہے، افرادِ خانہ کو بھی ایک دوسرے کی خبر نہیں ہے، سب اپنے آپ میں ہی مگن رہتے ہیں۔ ایک ہمارا زمانہ تھا کہ شام کو گھر کے سارے لوگ مل بیٹھ کر میٹھی محبت بھری باتیں کیا کرتے تھے، خوشیاں بانٹتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھوں اور پریشانیوں کو جاننے اور مداوا کرنے کی حت الامکان کوشش کرتے تھے۔ ماں اور دادی سے دیر رات تک اچھی اچھی کہانیاں سنتے تھے۔ بزرگوں کا احترام کرتے تھے اور ان کی نصیحتوں کو انمول سمجھ کر پلے باندھ کر رکھتے تھے، لیکن آج کل کے بچوں کا خون سفید ہو گیا ہے جو بڑوں کو خاطر میں ہی نہیں لاتے ہیں اور اپنے اپنے کمروں میں دروازے بند کر کے بیٹھ جاتے

ہیں‘‘۔

کچھ دیر کچن میں اکیلی سوچوں کی بھول بھلیوں میں گم رہنے کے بعد دادی بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دادی نے کئی بار زبیر کے والدین کو بھی زبیر کی حالت سے آگاہ کیا لیکن انہوں نے بھی کوئی توجہ نہیں دی اور بات آئی گئی۔ زبیر، جس کے امتحانات قریب آرہے تھے، تیاری میں جٹ تو گیا لیکن ہر وقت عالم یاس واضطراب میں گم سم اور پریشان رہنے لگا، اس کے چہرے پر ہر وقت افسردگی اور مرونی چھائی رہتی تھی۔ جوں توں کر کے اس نے امتحان دیا اور چین کی سانس لی۔ کچھ وقت کے بعد جب امتحانات کے نتائج سامنے آئے تو زبیر کے والدین پر بجلی سی گری کیوں کہ زبیر معمولی نمبرات سے پاس ہوا تھا۔ پھر کیا تھا اس کے والدین کے ساتھ ساتھ اس بڑا بھائی اور بہن بھی اسے ہر وقت پانی پی پی کر کوسنے لگے۔ جب کہ دادی ہر وقت یہ کہہ کر اس کی طرف داری کرتی تھی کہ گھر میں اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ کم نمبرات کے سبب زبیر کو بڑی مشکل سے گیارویں جماعت میں داخلہ مل گیا اور ساتھ ہی اس نے ایک کوچنگ مرکز میں بھی داخلہ لیا، جس کے بعد اس کی زندگی میں تبدیلیاں وقوع پزیر ہونے لگیں۔ اس نے والدین سے موبائل فون کا تکازا کیا جو اب تک اس کے پاس نہیں تھا۔ اب وہ دادی سے کبھی کوئی فریاد نہیں کرتا تھا بلکہ ہر وقت خوش اور مست رہتا تھا۔ دادی اس کی یہ تبدیلی دیکھ کر خوش تو ہور ہی تھی یہ غم بھی اسے کھائے جارہا تھا کہ اب وہ پڑھائی پر زیادہ دھیان نہیں دیتا تھا، شام کو دیر تک گھر سے باہر رہتا تھا اور کافی وقت فون کے ساتھ گزارتا تھا جب کہ والدین اور دادی سے خلاف معمول بار بار پیسوں کا تکازا بھی کرتا تھا جو اسے آسانی سے مل جاتے تھے کیوں کہ اس کے والدین کو پیسوں کی کوئی قلعت نہیں تھی لیکن ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس کی حرکات وسکنات پر نظر رکھتے ،اس طرح وہ اپنے ڈھنگ سے اپنی زندگی جینے لگا۔ کچھ مہینوں بعد اس کی صحت بھی گرنے لگی۔ اس کی حالت دیکھ کر دادی نے اس کے والدین کو کئی بار بتایا کہ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لیا جائے، لیکن انہوں نے ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھا یا عدیم الفرست ہونے کے سبب ایسا نہیں کر سکے۔

ایک دن زبیر سکول سے واپس آیا اور گھر سے کھانا کھا کر کوچنگ مرکز کے لئے گیا اور رات دیر تک واپس نہیں لوٹا۔ دادی جو سخت پریشان ہوگئی نے اس کی ماں کو بتایا۔

''ماں جی...... تم خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو، زبیر تھوڑی ہی چھوٹا بچہ ہے۔ دوستوں کے ساتھ کئی گیا ہوگا، کچھ دیر بعد آ جائے گا''۔

زبیر کی ماں نے دادی کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''بہو میرا دل بہت گھبرا رہا ہے، کئی وہ معصوم غلط صحبتوں کا شکار نہ ہو جائے''۔

دادی نے کہا اور نماز پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ فارغ ہونے کے بعد وہ زبیر کے انتظار میں بے قراری کی حالت میں دروازے کی طرف آنکھیں بچھائے بیٹھی رہی..... لیکن وہ نہیں آیا، اب اس کے والدین بھی پریشانی کی حالت میں ادھر اُدھر کرنے لگے زبیر کا فون لگاتار بند آرہا تھا، انہوں نے فون کر کے اپنے رشتہ داروں اور زبیر کے دوستوں سے معلوم کیا لیکن زبیر کا کوئی پتہ نہیں ملا جب کہ زبیر کے دوستوں نے بتایا کہ وہ آج کوچنگ مرکز آیا ہی نہیں تھا۔ رات کے گیارہ بجے زبیر کے والد کا فون بجا، اس نے ہیلو کیا تو دوسری طرف سے ایک بارعوب آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''آپ زبیر نامی لڑکے والد ہو؟''

''جی، کیا ہوا زبیر کو''۔

اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں پولیس سٹیشن سے بول رہا ہوں اور آپ کے نابالغ بیٹے کو پولیس نے نشے کی حالت میں ڈرگس کے ساتھ گرفتار کر لیا ہے''۔

یہ الفاظ پگھلے ہوئے سیسے بن کر اس کے کانوں میں اتر گئے، تناؤ کی گہری لکیریں اس کے چہرے پر رقص کرنے لگیں اور ہاتھوں سے موبائیل فون چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

☆☆☆

رخصتی

رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد سرلا دیوی صبح پو پھٹنے سے پہلے ہی بستر چھوڑ کر اٹھی اور مُنہ ہاتھ دھونے کے بعد پوجا والے کمرے میں جا کر بھگوان سے پراتھنا کرتے ہوئے گڑگڑانے لگی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوں گر کر اس کے پلو میں جذب ہونے لگے۔ پوجا سے فارغ ہو کر وہ جوں ہی کچن میں آئی تو اسی لمحے احسان احمد بھی اندر داخل ہو گیا۔ خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد احسان احمد نے لکشمی کی شادی کی تیاریوں کے بارے میں بات چھیڑی تو سرلا دیوی کی آنکھیں بھر آئی جب کہ لکشمی لاج کے مارے دوسرے کمرے میں جا کر سوچ و فکر کے اتھاہ سمندر میں کھو گئی۔ سرلا دیوی نے احسان احمد کو تفصیل سے ساری داستان سنائی تو اس کے دل میں درد کی ایک تیز ٹیس اٹھ گئی۔ وہ ہاتھ ملتے ہوئے سخت اُداسی کی حالت میں وہاں سے نکلا اور کچھ سوچ کر پڑوسی بٹو سنگھ کے گھر کی طرف گیا۔

سرلا دیوی کا گھرانہ پچھلے کئی ہفتوں سے انتہائی پریشانی اور اضطرابی کیفیت سے گزر رہا تھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی پریشانیوں میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا کیوں کہ ڈھائی مہینے پہلے مقرر کردہ تاریخ کے مطابق سرلا دیوی کی بیٹی لکشمی کی شادی کی تاریخ میں اب صرف دو دن بچے تھے جب کہ تمام انتظامات کرنے ابھی باقی تھے یہاں تک کہ دلہن کے لئے چند جوڑے بھی میسر نہیں تھے اور نہ میسر ہونے کی کوئی امید تھی۔ کیوں کہ شہر و دیہات میں پچھلے دو مہینوں سے زیادہ وقفے سے چل رہی غیر یقینی صورت حال جیسے احتجاج، ہڑتال،

کرفیو، بندشیں، سنگبازی، گرفتاریاں، فائرنگ اور ٹیر گیس و پیلٹ شلنگ جس سے درجنوں افراد جاں بحق اور وردی پوش اہلکاروں سمیت ہزاروں افراد مضروب ہو کر اسپتالوں کی زینت بن کر درد سے کراہ رہے تھے، سینکڑوں افراد آنکھوں کی بصارت سے محروم ہو چکے تھے، میں سدھار یا تبدیلی کے آثار دور دور تک دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کاروباری ادارے، بینک، ٹرانسپوٹ اور دیگر شعبے بالکل بند تھے۔ مواصلاتی سہولیات بھی دستیاب نہیں تھیں۔ غرض زندگی کی نبضیں ہی رک گئی تھی اور ہر طرف دہشت و وحشت کا ماحول تھا۔ ایسی گھنگور گھٹا میں شادی کے لئے درکار ضروری ساز و سامان حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ دو مہینے قبل جب حالات نے بھیانک کروٹ لی تو سرلا دیوی کو یہ گمان تھا کہ کچھ دنوں بعد حالات میں سدھار آئے گا اور وہ آسانی سے تمام تیاریاں مکمل کر لے گی لیکن ای خیال است محال است جنوں۔

سرلا دیوی کا کوئی رشتہ دار یا اپنے فرقے کا کوئی بھی فرد یہاں رہائش پذیر نہیں تھا۔ نامساعد حالات کے چلتے انہوں نے برسوں پہلے دوسرے شہر منتقل ہو کر وہیں سکونت اختیار کر لی تھی جب کہ سرلا کے پریوار نے اپنے ہی آبائی وطن میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا شوہر چند سال قبل فوت ہوا تھا، اب وہ لکشمی اور اپنے بیٹے راکیش جس کی شادی ہو چکی تھی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ ان کے پڑوس میں دوسرے فرقوں کے لوگ آباد تھے، جو ان کی غمی خوشی میں ہر وقت بڑھ چڑھ کر شریک تو ہوتے تھے لیکن آج اس سوگوار اور ماتم زدہ ماحول کے چلتے ان کے پڑوس میں ہونے والی کئی شادیاں یا تو ملتوی کر دی گئی تھی یا انتہائی سادگی سے نکاح خوانی انجام دی گئی تھی۔ اس لئے سرلا نے اس باران سے بھی کوئی امید وابستہ نہیں کر لی جب کہ وہ ہرگز لکشمی کی شادی ملتوی کرنے کے حق میں نہیں تھی وہ بہت جلد اپنی یہ ذمہ داری پوری کرنا چاہتی تھی۔ راکیش جس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی نے مقررہ وقت پر شادی کی تیاریوں کے لئے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن بے سود کیوں کہ گھر سے باہر قدم رکھنا بھی خطرے کو دعوت دینے کے مترادف تھا......

دیکھتے دیکھتے یہ دن بھی گزر گیا اور اگلے دن کا سورج طلوع ہو گیا۔ طئے شدہ تاریخ

کے مطابق آج ہی لکشمی کی مہندی رات کی رسم انجام پانی تھی اور اگلے روز بارات آنے والی تھی لیکن اور تو اور گھر میں دلہن کے ہاتھوں پر رچنے کے لئے مہندی بھی موجود نہیں تھی۔ سرلا دیوی اور دیگر افراد خانہ جن کی آنکھوں میں درد کے بیکراں سے پنہاں تھے، گھر میں گم صم بیٹھے اپنے نصیب کو کوس رہے تھے۔ گھر کے در و دیوار انہیں کاٹنے کو دوڑ رہے تھے......

قریب دو پہر کے وقت ایک دور دراز علاقے سے ان کے فرقے کے مدعو کچھ مہمان اور پڑوس میں رہنے والی کچھ عورتیں سرلا کے گھر میں اچانک وارد ہوگئی جنہیں دیکھ کر سرلا دیوی کی کچھ ہمت سی بندھ گئی۔

''اٹھو بیٹی...... اپنی تیاری شروع کرلو...... آج تمہاری مہندی رات ہے...... نہا دھو کر دوسرے کپڑے پہن لو''۔

سرلا نے لکشمی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تھکے سے لہجے میں کہا۔ لکشمی جس کے سارے رنگین سپنے کچے ناریل کی طرح پاش پاش ہو رہے تھے، کے چہرے پر افسردگی اور مرونی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اپنے اندر کے طلاطم کو چھپا کر وہ اٹھی اور اپنے کمرے میں جا کر پلکوں کے پٹ کھول کر اندر کے طلاطم کو سیلاب کی صورت میں بہانے لگی۔ اس کی بڑی بڑی شرمیلی آنکھوں سے تیز تیز قطار در قطار آنسوں گر کر ایسے ٹوٹنے لگے جیسے شبنم کے قطرے چوٹ کھا کھا کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ سرلا دیوی جس کے چہرے سے کرب و اضطراب پسینے کی قطروں کی طرح ٹپک رہا تھا کھڑکی کے پاس بیٹھ کر سوچوں میں غلطاں و پیچاں آسمان کی اور اس طرح تکنے لگی جیسے کوئی بے بس کسان اپنے ادھ سکھے کھیت کے کنارے کھڑا آسمان پر ابھرنے والے نم آلود بادلوں کو دیکھ رہا ہو...... سہ پہر کے قریب سامان سے لدی ایک گاڑی ان کے مین گیٹ کے باہر رک گئی۔ گاڑی سے اتر کر بٹو سنگھ نے گیٹ کھولا اور گاڑی صحن میں داخل ہوگئی، پھر بٹو سنگھ کی بیوی جوتی گاڑی سے اتری۔

''بلے بلے...... آج میری بٹیا کی شادی ہے......''۔

بٹو سنگھ نے دروازہ بند کیا اور ڈانس کرتے ہوئے گنگنانے لگا۔

سرلا دیوی بڑے غور سے یہ سب دیکھ رہی تھی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''سرلا بہن جلدی سے نیچے آجاؤ''۔

احسان احمد گاڑی سے اترتے ہی سامان اتارتے ہوئے سرلا دیوی سے مخاطب ہوا۔

قسم بہ قسم کے خوب صورت شادی کے جوڑے...... بناؤ سنگھار کا سامان ......وازہ وان میں کام آنے والی اشیا...... مشروبات اور شادی بیاہ کے لئے درکار دیگر تمام سامان دیکھ کر سرلا دیوی دنگ رہ گئی۔

''یہ کیا ہے بھائی جان''؟

''لکشمی بٹیا کی شادی کا ساز وسامان''۔

اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''سرلا بھابی......توسی شادی کی تیاریاں کرلو......جوتی تو میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو جلدی سے جاؤ اور محلے کی عورتوں کو جمع کر کے لاؤ''۔

بٹو نے جوتی کو ٹوکتے ہوئے کہا......کچھ وقفے کے بعد محلے کی عورتوں نے جمع ہو کر شادی کے گیت (کشمیری ونہ ون) گانے شروع کر دئے۔ لکشمی اپنی ہم عمر سہیلیوں کے ہمراہ شادی کے جوڑے اور دیگر ساز وسامان سنبھالنے لگی۔ اسی دوران احسان احمد اور بٹو سنگھ بھی کمرے میں داخل ہو گئے۔

''لکشمی بیٹی...... کسی چیز کی کمی ہو تو بلا جھجک بتا دینا......''۔

''ہاں بٹیا......توسی کوئی چنتا نہ کرو، جو بھی چیز ضرورت ہو اسی بول دینا''۔

بٹو سنگھ نے احسان احمد کی بات کاٹ کر جذباتی انداز میں کہا۔ لکشمی جس کے ہونٹوں پر اب اداسی کے بدلے مسرت کا ارتعاش اور چہرے پر افسردگی کی جگہ مسرت واطمینان کی خنک چاندنی بکھری ہوئی تھی کے گالوں پر حیا کی سرخی غازے کی طرح پھیل گئی۔ اس نے اٹھ کر دونوں کے پیر چھونے چاہے۔

''اوپر والا تجھے سدا سکھی رکھے بیٹی......''۔

''واہے گرو تیرا من خوشیوں سے بھر دے بٹیا......''۔

دونوں لکشمی کو دعائیں دیتے ہوئے وہاں سے نکل کر دوسری انتظامات کا جائزہ

لینے لگے۔ محلے کے نوجوان بزرگوں کی نگرانی میں زوروشور سے شادی کی تیاریوں میں جٹ گئے ......آشپاز کشمیری وازہ وان بنانے میں مصروف ہوگئے ......آنگن میں شامیانہ لگ گیا ...... پورے گھر کو بجلی کے قمقموں سے دلہن کی طرح سجایا گیا......سرلا دیوی کے گھر میں رونقیں لوٹ آئیں۔ محلے کے مردوزن وہاں جمع ہوئے اور سرلا دیوی کے گھرانے کی خوشیوں میں شریک ہوکر پوری رات روائیتی طریقے سے جاگتے ہوئے گزاری۔ رخصتی کے دن بڑے دھوم دھام وشاندار طریقے سے بارات کا استقبال اور خاطر مدارت کی، لگن منڈپ کی مذہبی تقریب انتہائی پروقار طریقے سے انجام پائی اور کافی جوش خروش، محبت اور طمطراق سے راج کماری کی طرح لکشمی کو اپنے دولہے راجا کے ساتھ وداع کر دیا۔

☆☆☆

لاڈلا

رات کے سناٹے لمحہ بہ لمحہ گہرے ہوتے جارہے تھے۔موسم انتہائی خوشگوار تھا، سسکیاں بھرتے ہوئے ہوا کے لطیف جھونکے، نیلے آسمان پر تاروں کے جگمگاتے ہوئے ہیرے جواہرات اور چاند کی نرم وسبک روشنی ماحول کو اور زیادہ دلکش بنارہے تھے۔شہر کے مکین سکون سے نیند کی میٹھی باہوں میں جھول رہے تھے،لیکن اپنے آس پاس سے بے نیاز گہری اُداسی میں ڈوبی نصرت گھر کے دالان پر بیٹھی بے قرار نظروں سے اپنے لاڈلے بیٹے اقبال کی راہ تک رہی تھی جو صبح موٹر بائیک پر سوار ہوکر کوچنگ سنٹر کے لئے روانہ ہوا تھا لیکن ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔یوں تو اس کا دیر سے گھر لوٹنا کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن آج تو حد ہی ہوگئی۔جب رات کے گیارہ بجے تک بھی وہ نہیں آیا تو نصرت کی فکر وتشویش بڑھنے لگی۔ شہر کے حالات بھی کچھ ٹھیک نہیں تھے۔آئے روز رونما ہونے والے پرتشدد واقعات سے شہر باسیوں کی زندگیاں اجیرن بن چکی تھیں۔حالات کب اور کیا رخ اختیار کرینگے کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ایک اور تشویشناک پہلو شہر میں رونما ہونے والے خوفناک خونین سڑک حادثات تھے،جن میں ہر روز پلک جھپکتے ہی کئی کئی انسانی جانیں ضایع ہوجاتی تھیں اور کئی زخم زخم ہوکر اسپتال پہنچتے تھے۔نصرت کے دل میں طرح طرح کے خوفناک وسوسے اور اندیشے جنم لے رہے تھے۔اقبال کا والد ایڈوکیٹ جہانگیر حسب معمول اپنی مصروفیات سے فارغ ہوکر سو گیا تھا، کیوں کی اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا اکلوتا بیٹا گھر نہیں لوٹا ہے، نہ نصرت اس کو بتانا چاہتی تھی۔وہ ممتا کی ماری روز کی طرح آج بھی اپنے لاڈلے کی پردہ پوشی کرنا چاہتی تھی۔

اس نے ٹیلیفون کر کے اپنے رشتہ داروں ، اقبال کے دوستوں سمیت تمام ممکنہ جگہوں پر دریافت کیا لیکن کئی سے بھی کوئی پتہ نہیں ملا جب کہ خلاف معمول اقبال کا فون بھی بند آرہا تھا۔ نصرت بہت دیر تک سخت پریشانی و مخمصے کی حالت میں اپنے نور نظر کی راہ تکتی رہی ، لیکن جب گھڑی کی سوئیاں بارہ کے ہندسے کو پار کر گئیں اور رات کی خاموشی گہرا گئی تو اس کی امیدیں بھی کچے ناریل کی طرح پاش پاش ہونے لگیں ، جسم کے پور پور سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ جھنجھلاہٹ و اضطراب کی حالت میں خواب گاہ میں داخل ہوگئی اور جہانگیر کو جگا کر گناہوں کی پوٹلی کی طرح دل میں چھپائی صورتحال سے باخبر کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ پریشان کن خبر سن کر اس کو پہلے سخت غصہ آیا لیکن جلد ہی پدرانہ شفقت غالب آ گئی ، افسردگی اور بے اطمینانی کے نقوش چہرے پر نمایاں ہونے کے باوجود وہ حوصلہ مند لہجے میں نصرت سے یوں گویا ہوا۔

''تم گھبراؤ نہیں ، اقبال اب چھوٹا بچہ نہیں ہے۔ کسی دوست کے گھر ہوگا ، صبح لوٹ کر آئے گا''۔

نصرت کے رونے کی آوازیں سن کر ان کا گھریلو ملازم رزاق چاچا بھی آیا اور اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے سونے کے لئے کہا۔ لیکن نصرت آخر ماں تھی ، اپنے لاڈلے کو کھانا کھلائے بغیر کیسے سو پاتی۔ بیٹے کی دوری کا غم کالی ناگنوں کی طرح بل کھا کھا کر اسے اپنے لپیٹ میں جکڑ رہا تھا جب کہ جہانگیر بھی سکتے میں آ کر سخت کرب و اضطراب میں مبتلا ہو گیا......

اقبال نہایت ہی ذہین ، با اخلاق اور محنتی لڑکا تھا۔ پڑھائی بھی خوب دل لگا کر کرتا تھا۔ ہر سال اچھے مارکس لے کر پاس ہوتا تھا۔ والدین اور اساتذہ کا فرمانبردار بھی تھا جو بڑے نازوں سے اس کی پرورش کرتے تھے۔ ہر سہولیت میسر رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی حرکات و سکنات پر بھی نظر رکھتے تھے۔ ان کی خوشیوں کا اسوقت کوئی ٹھکانہ نہیں رہا اور سر فخر سے اونچا ہو گیا جب اقبال نے بارہویں جماعت کا امتحان امتیازی نمبرات سے پاس کر لیا۔ رشتہ دار و احباب ڈھیر سارے تحائف لے کر ان کے گھر مبارک بادی دینے کے لئے آئے۔

بیٹے کی اس شاندار کامیابی پر فرط مسرت وانبساط میں جھومتے ہوئے نصرت نے ایک قیمتی موبائل فون سمیت کئی قیمتی تحائف خرید کر اپنے لاڈلے کو عنایت کیے اور آنکھیں بند کر کے اس کی ہر مانگ پوری کرنا شروع کر دی۔ نصرت کی یہ روش دیکھ کر رزاق چاچا نے صدق دلی سے اس کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''بی بی جی...... چھوٹا مُنہ بڑی بات...... اس عمر میں بچے کو اتنی آزادی دینا ٹھیک نہیں ہے۔ کہیں اس کی عادات بگڑ نہ جائیں''۔

''رزاق چاچا...... اقبال اب بچہ نہیں رہا...... امتحان میں شاندار کامیابی اس کی زندگی کا خوشگوار موڑ یعنی ٹرننگ پوائینٹ ہے''۔

اپنے لاڈلے کی کامیابی پر شاداں وفرحاں نصرت، جس کے جیسے بخت جاگ اٹھے تھے، نے پُر جوش لہجے میں اس کی چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ غرض اس نے بیٹے کو اور زیادہ لاڈ پیار اور چاندی میں پالنا شروع کر دیا۔

وقت تیزی سے اپنا سفر طئے کرتا رہا۔ کالج میں داخلہ حاصل کرنے کے بعد اقبال کے عادات واطوار دھیرے دھیرے بدلاؤ آنا شروع ہو گیا۔ مختصر وقفے میں جیسے اس کی زندگی کی کایا ہی پلٹ گئی۔ اس نے پڑھائی کی طرف دھیان دینا ہی چھوڑ دیا۔ زیادہ تر وقت موبائل فون، ٹیلیویزن اور دیگر خرافات میں صرف کرنے لگا۔ دن میں بھی اور رات گئے تک فون پر گفتگو کرنا، انٹرنیٹ پر وقت گزارنا اس کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ اس کے برتاؤ میں چڑ چڑاپن، من مانی اور والدین کے تیئں بے رخی پیدا ہونے لگی، لیکن انہوں نے اس کی ان عادات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا بلکہ اس کی ہر جائیز ناجائیز مانگ پوری کرتے رہے۔ والدین کے اس بے جا لاڈ پیار کا ناجائیز فائدہ اٹھا کر اقبال نے اچانک ان سے موٹر بائیک کی فرمائیش کر ڈالی۔ انہوں نے پیار سے سمجھاتے ہوئے یہ فرمائیش پوری کرنے سے منع کر دیا لیکن مرغ کی ایک ٹانگ کے مصداق اس نے اپنی خواہش پر اڑے رہتے ہوئے ان پر مختلف بے ہودہ طریقوں سے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اقبال کوئی غلط قدم نہ اٹھائے اس ڈر سے ممتا کی ماری نصرت بھی اس کی حمایت میں آگئی۔ ماں بیٹے کی ضد کے آگے جہانگیر، جس

کے پاس ایک اچھے عہدے پر فائیز ہونے کے سبب روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی، نے ہاتھ کھڑے کر کے بیٹے کی یہ ضد بھی پوری کرلی۔اب اقبال کا لائف سٹائل پوری طرح تبدیل ہو گیا۔صبح بن ٹھن کر موٹر بائیک پر کالج کے لئے نکلنا، شام کو دیر سے گھر لوٹنا۔اوپر سے اچھی خاصی رقم مختلف بہانوں سے ماں سے اینٹھنا اس کا معمول بن گیا۔کئی دفعہ اس نے ماں کی الماری میں رکھی رقم پر بھی ہاتھ صاف کر دیا جب کہ رزاق چاچا نے کئی بار اشاروں کنایوں میں اس کے والدین تک یہ بات پہنچائی کہ اقبال نے کئی لوفر لفنگوں سے یارانہ گانٹھ لیا ہے۔غرض اس کی حرکات سکنات اور چال ڈھال سے آوارگی کی بو آرہی تھی، لیکن والدین پیار کے مارے کچھ نہیں بولتے تھے۔اس کی پڑھائی کا یہ حال ہوا کہ گریجویشن کے پہلے ہی سال میں فیل ہو گیا، جس کے بعد اگرچہ کالج کے دروازے اس کے لئے بند ہو گئے لیکن کوچنگ مراکز جانے کے بہانے اس کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ من مانے طریقے سے اپنی زندگی جیتا رہا۔

وہ کہاں جاتا ہے؟...کیا کرتا ہے؟...کن لوگوں کے ساتھ وقت گزارتا ہے؟ والدین کو اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا نہ انہوں نے کبھی جاننے کی کوشش کی۔ہمیشہ اس کی غلطیوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے۔۔کچھ مہینوں سے اقبال کی صحت بھی گرنے لگی تھی۔اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑنے لگا...آنکھیں سرخ اور اندر کو دھنسی ہوئی اور جسم اتنا نحیف ہو چکا تھا جیسے اس کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔اس کی یہ حالت دیکھ کر کئی دفعہ والدین نے اس کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی صحت کی گرتی حالت سے بھی بے نیاز اپنی ہی دھن میں مست ان کی بات کو نظر انداز کرتا رہا۔والدین اب اس کی ہر دم بگڑتی صحت اور طفلانہ حرکتوں سے سخت پریشان رہنے لگے تھے، لیکن پوری طرح سے بے بس تھے......

نصرت رات بھر لاڈلے بیٹے کی دوری کے غم میں پریشان سوچوں کی بھول بھلیوں میں پھنس کر ریت پر پڑی مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر آنسوں بہاتی رہی اور صبح صادق کے وقت عالم یاس واضطراب میں اللہ کی بارگاہ میں سربسجود ہو کر بیٹے کی سلامتی کی دعائیں مانگتے

ہوئے گڑگڑانے لگی ۔اس دوران دفعتاً اس کے فون کی گھنٹی بجی ۔فون کے ڈسپلے پر نظر پڑتے ہی وہ خوشی سے اچھل پڑی جس پر اقبال کا نام رقص کررہا تھا۔

''ہیلو......بیٹا کہاں ہوتم ؟''

اس کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہیلو......آپ اقبال کی ماں ہو......''

''میرا اقبال کہاں ہے؟......کیا ہوا اس کو......؟''

دوسری طرف سے کوئی اجنبی آواز سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور اس نے چلانا شروع کردیا۔

میں ڈاکٹر شفیق بول رہا ہوں ،آپ اطمینان رکھیے ۔آپ کا بیٹا بالکل ٹھیک ہے، اُسے کچھ نہیں ہوا ہے۔آپ سٹی ہاسپٹل آکر مجھ سے ملئے۔

جب وہ اسپتال پہنچے تو اقبال ،جس کے سر اور جسم کے دوسرے حصوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں ،چار پائی پر پڑا نیم بے ہوشی کی حالت میں درد سے کراہ رہا تھا۔اس کی یہ حالت دیکھ کر نصرت ماہی بے آب کی طرح تڑپ کر اپنے بال نوچنے لگی۔

''آپ گھبرائے نہیں یہ معمولی نویت کے زخم ہیں جو چند دنوں میں ٹھیک ہو جائینگے لیکن......''۔

''لیکن کیا؟ ڈاکٹر صاحب''۔

جہانگیر نے حیرت زدہ نظروں سے ڈاکٹر کو تکتے ہوئے پوچھا۔

''دراصل آپ کا بیٹا ایک نہایت ہی پیچیدہ مرض میں مبتلا ہے ،جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے علاج سے زیادہ پرہیز، پیار اور احتیاط کی ضرورت ہے.....''۔

ڈاکٹر نے انہیں تفصیل کے ساتھ اقبال کو لاحق مرض ،ضروری احتیاط اور علاج کے بارے میں بتایا۔ یہ تکلیف دہ بات سن کر کہ اقبال جان لیوا نشیلی ادویات ،اور شراب نوشی کی لت میں مبتلا ہے اور کل شام زیادہ مقدار میں نشیلی ادویات لینے کے سبب ہی وہ بے ہوش ہو کر سڑک پر پڑا تھا ،جہاں سے چند نیک دل راہ گیروں نے اسپتال پہنچا کر اس کی جان

بچائی، ان کے عقل کے طوطے اڑ گئے اور پیروں تلے زمین کھسک گئی۔

''ڈاکٹر صاحب......کچھ بھی ہو اقبال بیٹا بالکل ٹھیک ہو جانا چاہیے''۔

رزاق چاچا نے درد میں ڈوبے لہجے میں ہاتھ جوڑ کر التجا کے انداز میں کہا۔

''لاپرواہی کے سبب اس کی صحت بہت حد تک بگڑ چکی ہے۔اب اس بُری لت سے مکمل چھٹکارا حاصل کرنا ہی اس کے لئے ٹرننگ پوائینٹ بن سکتا ہے ورنہ......''

ڈاکٹر نے نسخہ نصرت کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔وہ کچھ پل پچھتاوے والی نظروں سے رزاق چاچا کی طرف دیکھتی رہی جس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کی طغیانی تیز ہو گئی۔

☆☆☆

بکھری کہانیاں

صبح سویرے ہی میں نے یہ دلگیر خبر سُنی کہ رفیق کو دورانِ شب دل کا شدید دورہ پڑا ہے اور وہ اسپتال میں زندگی وموت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ مجھ پر اداسی چھا گئی اور دل میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ رفیق کی پُر درد کہانی فلمی مناظر کی طرح میرے ذہن کے پردے پر چلنے لگی... کل کی ہی تو بات تھی کہ میں جھیل کنارے واقع پارک کے دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا، دراصل بہت دنوں سے مجھے ایک سنسنی خیز رومان پرور کہانی کی تلاش تھی لیکن کوشش کرنے کے باوجود بھی میں نہ کسی رومانی موضوع پر اپنی توجہ مرکوز کر سکا اور نہ کسی کہانی کا تانا بانا بُن سکا۔ آخر تھک ہار کر کہانی بننے کی کوشش ترک کر کے پارک میں موجود دوسرے مرد و زن کی طرح نظاروں سے لطف اٹھانے میں محو ہو گیا۔ ٹہلتے ٹہلتے دفعتاً میری نظر رفیق پر پڑی، جو جھلستی دھوپ میں پسینے سے شرابور ہانپتا ہوا پارک کی زیر تعمیر دیوار کے لئے پتھر ڈھو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں مرجھائی ہوئی تھیں جب کہ ماتھے پہ بے بسی ولاچاری کی لکیریں رقص کر رہی تھیں۔ میں اس کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنی ہی دُھن میں مست نظارے دیکھنے میں محو ہو گیا... شکل وشباہت سے گبرو جوان جیسا دکھ رہا رفیق کوئی اور نہیں میرا پڑوسی تھا۔ جس کی زندگی بذات خود ایک دردناک کہانی تھی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ، نہایت ہی ذہین، قابل، خوددار اور جفاکش لڑکا تھا، جو چھوٹی عمر میں ہی ایک حادثے میں باپ کے ناکارہ ہو جانے کی وجہ سے گھریلو ذمہ داریوں کے سخت بوجھ تلے دب گیا تھا۔ اس کے باپ کی بھی ایک الگ سی دکھ بھری داستان تھی۔ وہ پیشے سے ڈرائیور تھا۔ اسے اپنے بچوں کو تعلیم

کے نور سے آراستہ کرنے کا بڑا شوق تھا اور وہ بچوں کو ہر سہولت میسر رکھنے کیلئے جی جان سے محنت کرتا تھا۔ بچے بھی خوب دل لگا کر پڑھائی کرتے تھے۔ حالات خراب تھے لیکن وہ اپنی مجبوریوں کے سبب حسب معمول کام پر جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ گاڑی لے کر بس اڈے میں پہنچا ہی تھا کہ وہاں موجود فوجی کیمپ پر حملہ ہوا، ایک گرینیڈ نشانہ چوک کر اس کی گاڑی سے جا ٹکرایا اور ایک سماعت شکن دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا، بعد ازاں بندوقوں کے دہانے کھل گئے اور گولیوں کی آگ برسنا شروع ہوگئی۔ اس خونین واقعہ میں کئی معصوم لوگ اپنی قیمتی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور بہت سے زخمی ہو کر خون میں لت پت ہو گئے۔ وہ بھی شدید زخمی ہو کر کئی ماہ تک اسپتال میں زیر علاج رہا۔ اس حادثے میں اگرچہ خوش قسمتی سے اُس کی جان بچ گئی لیکن ایک ٹانگ مکمل طور پر ناکارہ ہونے کی وجہ سے وہ عمر بھر کے لئے اپاہج ہو کر رہ گیا...

کم سن رفیق کے لئے یہ تکلیف دہ صورتحال کسی بڑی آزمائش سے کم نہیں تھی۔ وہ اپنا خون پسینہ ایک کر کے گھر کے اخراجات بھی چلاتا رہا اور دو بہنوں کی تعلیم کی طرف بھی دھیان دیتا رہا۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ رفیق اچانک دل کے عارضے میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی حالت پر ترس کھا کر رشتہ داروں اور یار دوستوں کی رفاقت اور مدد سے کچھ وقت تک اس کا علاج معالجہ چلتا رہا اور گھر کا چولہا بھی جلتا رہا، لیکن مادیت کے اس دور میں رشتوں میں اب خلوص ہی کتنا بچا ہے؟ آخر کب تک لوگ اس کی مدد کا جوکھم اُٹھاتے؟ دھیرے دھیرے سب نے ہاتھ کھینچ لئے۔ دوائیوں کے سہارے جی رہا بے یار و مددگار رفیق جب کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا اور افرادِ خانہ نان شبینہ کو ترسنے لگے تو اپنی ادویات اور گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے اس نے اپنی پشتنی زمین بھی بیچ ڈالی۔ بیماری کی حالت میں ہی اپنی تعلیمی اسناد کی بنیاد پر روزگار حاصل کرنے کی سر توڑ کوشش کی۔ حکام اور منسٹروں کی کوٹھیوں کے چکر کاٹتے جوتے گھسائے۔ اپنے عزت نفس کو ٹھیس پہنچا کر ان کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے اپنے قابل رحم حالات کی داستان بیان کی۔ سماجی اور فلاحی اداروں کو مدد کے لئے دہائیاں دیں، لیکن کہیں بھی اس کے درد کا کچھ مداوا نہ ہو سکا۔

ہر دروازے سے نا اُمید لوٹ کر جب اس کے من میں یہ بات اچھی طرح گھر کر

گئی کہ خود غرضی اور حرص کی اس نیلام گاہ میں انصاف مانگنا پتھر سے دودھ مانگنے کے مترادف ہے تو اپنی ادویات کا خرچہ اور گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے محنت مزدوری کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا، حالانکہ اس کی صحت بالکل اس کی اجازت نہیں دیتی تھی، جن سے ہم پڑوسی اور اس کے رشتہ دار بخوبی واقف تھے۔رفیق کی کہانی کئی دنوں تک میرے تصور میں گشت کرتی رہی۔آخر میری غیرت بھی جاگی اور میں اس کی مزاج پرسی کے لئے اسپتال پہنچ گیا۔وہ چارپائی پر ٹیک لگائے مایوسی کے عالم میں خلاؤں میں گھور رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں درد کا بیکراں سمندر سا پنہاں تھا۔ڈاکٹروں کے مطابق اگرچہ اس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی لیکن مکمل علاج و معالجہ اور سخت احتیاط کی ضرورت تھی۔اس کا علاج کر رہے ایک ڈاکٹر کو میں نے یہ کہتے ہوئے سُنا۔

''مسٹر رفیق... خوش قسمتی سے آج آپ کی جان بچ گئی لیکن اگر پھر سے دوائیاں کھانے میں لیت و لعل ہوئی یا کوئی بھی بے احتیاطی برتی تو آپ پر پھر سے دل کا دورہ پڑ سکتا ہے جو جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔''

ڈاکٹر کی یہ وارننگ سن کر میں نے اس سے پوچھا۔

''رفیق... کیا سچ مچ تم نے دوائیاں لینے میں......''

''ہاں کچھ دنوں سے میں نے دوائیاں نہیں لی تھیں۔''

اس نے میری بات کاٹ کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو میں اس پر برس پڑا۔

''تعلیم یافتہ ہو کر بھی انتہا درجے کے لاپرواہو تم... زندگی بچانے والی ادویات لینے میں لاپروائی کرنے کی کیا ضرورت تھی... شرم آنی چاہئے...''۔

میں نہ جانے کیا کیا اناپ شناپ بول رہا تھا کہ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔

''مجھے دوائی نہ لینے کا قصوروار ٹھہراتے ہوئے ہر کوئی یہی کہتا ہے... لیکن میری مجبوری کوئی نہیں سمجھتا۔''

''کیسی مجبوری... اپنی جان سے زیادہ کوئی بھی چیز قیمتی نہیں ہوتی ہے۔''

''قیمتی ہوتی ہے میرے دوست''۔

اس نے جھرجھری لیتے ہوئے اکھڑتی سانس کو درست کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''کئی دنوں سے میرے پاس دوائیاں نہیں تھیں نہ مجھ میں کام کرنے کی ہمت اور سکت تھی۔ اس روز میں مجبوراً چکراتے ہوئے کام پر گیا تاکہ کچھ کما کر دوائیاں خرید سکوں۔ شام کو مزدوری لے کر جب واپس گھر پہنچا تو چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی موجود نہیں تھا۔ بھوک سے نڈھال، بابا، ماں اور بہنوں کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا، میں اُلٹے پاؤں بازار گیا اور وہاں سے چاول، سبزی وغیرہ خرید لائی اور یہ ارادہ کیا کہ کل کام کر کے دوائیاں خریدونگا... لیکن رات کو ہی...''۔

اس کی زبانی یہ تلخ حقیقت سُن کر کچھ دیر شرمندگی کی حالت میں بُت بنے میں اس کو دیکھتا رہا، پھر من بھاری قدم اُٹھاتے ہوئے وہاں سے نکل آیا۔ راستے میں سوچتے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے رفیق کی درد بھری آواز میرا پیچھا کرتی ہوئی کہہ رہی ہے۔

''ہا...ہا...ہا... ذہنی عیاشی، تفریح اور واہ واہ بٹورنے کے لئے جھوٹ موٹ کے گُل وبُلبل کے قصے کہانیاں گھڑنے کے عادی ہو تم... اپنے اردگرد درد کی شدت میں کرار ہے مجھ جیسے مجبور، بے بس ولاچار انسانوں کی غم ناک کہانیاں تمہاری نظروں سے اوجھل ہیں؟ یا تم انہیں درخورِ اعتناء بھی نہیں سمجھتے ہو؟''

☆☆☆

کالا قلعہ

''کیا حکم ہے میرے آقا......''۔

''فیروزی بابا کے یاد کرتے ہی اس کے غلام تاجو دیو نے حاضر ہو کر باادب سر جھکاتے ہوئے کہا''۔

''تاجو......میری طبیعت اکتا گئی ہے اور سیر کرنے کو جی چاہتا ہے''۔

''جو حکم میرے آقا''۔

''تاجو......آج مجھے کسی ایسی جگہ کی سیر کراؤ جو میں نے کبھی دیکھی نہ ہو''۔

''ضرور میرے آقا''۔

تاجو دیو نے کہا اور فیروزی بابا اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور وہ ہوا میں اڑنے لگا۔ تاجو جنگلوں، بیابانوں، سمندروں اور ویرانوں کے اوپر اڑتا رہا اور فیروزی فرط نشاط وانبساط میں جھومتے ہوئے مزے لے لے کر نظارے کرتا رہا۔ اس دوران اڑتے اڑتے وہ ایک کالے پیڑوں کے جنگل کی فضاؤں میں پہنچے، کالے پیڑوں کو دیکھ کر فیروزی نے حیران ہو کر تاجو سے پوچھا۔

''تاجو......یہ کونسی جگہ ہے......؟''

''آقا......اس جگہ کو کالا جنگل کہتے ہیں''۔

''نیچے جاؤ، یہاں تھوڑا وقت گزاریں گے''۔

''جو حکم آقا''۔

کہہ کرتاجو دیو نیچے اترا اور فیروزی اس وسیع عریض کالے جنگل کا نظارے کرنے میں محو ہو گیا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر گھومنے پھرنے کے بعد وہ ایک جگہ بیٹھ کر ستانے لگا، جس دوران اس کی نظر کچھ دوری پر واقع کالے رنگ کی ایک اونچی عمارت پر پڑھی جہاں کالی رنگت کے عجیب قسم کے چھوٹے قد کے لوگ ادھر اُدھر گھوم رہے تھے، اس نے چونک کرتاجو سے عمارت کے بارے میں پوچھا۔

''آقا......اس اونچی قلعہ بند عمارت کو کالا قلعہ کہتے ہیں''۔

''کالا جنگل......کالے پیڑ......کالا قلعہ......آخر یہ معاملہ کیا ہے؟'

فیروزی گہرے سوچوں میں ڈوب گیا اور کچھ وقت بعد تاجو سے گویا ہوا۔

''تاجو......مجھے قلعے کے اندر لے جاؤ، میں اس قلعے اور وہاں موجود ان کالے لوگوں کا راز جاننا چاہتا ہوں''۔

''میرے آقا......میں نے سنا ہے یہ لوگ بہت خطرناک ہیں اور وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے''۔

''تاجو......اگر ہم وہاں نہیں جا سکتے تو پھر تمہاری شکتی کس کام کی؟''

''آقا......آپ کا حکم ہے تو میں ضرور آپ کو وہاں لے کر جاؤں گا لیکن ایک بات کا خیال رکھنا ہے کہ آپ تب تک بالکل زبان نہیں کھولیں گے جب تک نہ ہم وہاں سے واپس نکلیں''۔

''مجھے منظور ہے''۔

فیروزی نے کہا تو تاجو نے کوئی منتر پڑھ کر اسے اپنے کندھوں پر سوار کیا اور وہ قلعے کی طرف چلے گئے۔ قلعے کے صدر دروازے پر درجنوں انسانی کھوپڑیاں لٹکے دیکھ کر فیروزی سخت گھبرا گیا، درد کی ایک تیز ٹیس اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی، اس نے چیخنا چلانا چاہا لیکن تاجو کی بات پر عمل کرتے ہوئے خاموش رہا۔ وہاں ایک کالے رنگ کا بڑا سائین بورڈ بھی نصب تھا جس پر ایک طرف کالے چوہے اور دوسری طرف اُلو جیسے کسی جانور کی تصویریں تھیں، جب کہ کالے حروف سے کوئی عبارت بھی لکھی تھی جو فیروزی کے سمجھ میں

نہیں آئی۔ تاجو اندر داخل ہو کر ایک کونے میں کھڑا رہ گیا جب کہ اس کے کندھوں پر سوار فیروزی کا وجود وہاں کا خوفناک منظر دیکھ کر دہل اٹھا۔ وہاں بہت سے انسانی کھوپڑیوں کے علاوہ انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے اور کٹے ہوئے انسانی سر ہر طرف لٹکے ہوئے تھے۔ فیروزی نے چاہا کہ اپنا سر پیٹے لیکن زبان کھولنا خطرے کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ کچھ دیر بعد اپنے آپ پر قابو پانے کے بعد وہ غور سے وہاں ہو رہی سرگرمیوں کا مشاہدہ کرنے لگا۔ وہاں کافی گہما گہمی تھی، بونے قد کے کالے لوگ، جن کی گردنیں بپھرے ہوئے خنزیروں کی طرح تنی ہوئی تھی، کالے برتنوں میں انسانی سر اور انسانی خون لے کر ایک بڑے ہال کے اندر داخل ہو رہے تھے، جب کہ درجنوں لوگ خون میں ڈبوئی ہوئی کالی تلواریں لے کر فرتی سے ہر طرف گھوم رہے تھے۔ فیروزی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ کیوں کہ وہاں کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا بلکہ سب خاموشی سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے......

''آج کے جشن میں سردار بہت خوش ہونگے''۔

''اور نہیں تو کیا... دھرتی پر ہمارے دشمن انسانی خون کی ندیاں جو بہہ رہی ہیں''۔

دفعتاً فیروزی کے سامنے سے ہاتھوں میں تلواریں لئے دو لوگ باتیں کرتے ہوئے گزرے اور اس کی سماعت سے یہ جملے ٹکرائے۔ اب اس کا تجسس بڑھ گیا اور وہ توجہ سے آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا تاکہ کوئی کچھ اور بتائے، لیکن کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ کچھ دیر بعد ایک عجیب قسم کا سائیرن بج اٹھا جیسے بہت سے کتے ایک ساتھ بھونک رہے ہوں، جس کے ساتھ ہی کالے بجلی کے قمقموں سے کالی لہریں پھوٹنے لگیں جن سے قلعے میں اندھیرا چھا گیا اور ہر طرف یہ آواز گونجنے لگی۔

''کالے دنیا کے کالے بادشاہ پدھار رہے ہیں ......سب لوگ ہال کے اندر داخل ہو جائیں''۔

جب سارے لوگ اندر داخل ہو گئے تو تاجو بھی فرتی سے چل کر اندر داخل ہو گیا اور سب کے پیچھے بیٹھ گیا۔ چند منٹ تک ہال میں موت جیسی خاموشی چھائی رہی جس کے بعد اونچی آواز میں ایک مختصر ترانہ بجا اور وہاں موجود سارے لوگوں نے کھڑے ہو کر سر جھکا

لئے اور بڑے اعزاز کے ساتھ لمبے قد والا کالا سردار، جس کی کالی آنکھوں سے سفاکی ٹپک رہی تھی، سر پر کالا تاج سجائے اصیل مرغ کی طرح چھاتی پھلائے ہال میں داخل ہو گیا۔ وہاں موجود لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر اور شی شی کہتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ اس کے نشت پر براجمان ہوتے ہی سامنے رکھی کالی طشتریوں سے پردے اٹھائے گئے جن میں انسانی کھوپڑیاں اور کٹے ہوئے سر تھے۔ کالے سردار نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور وہاں موجود برہنہ مرد و خواتین رقص کرنے لگے......

''سردار خوش ہوا......''۔

دفعتاً اس نے کھڑے ہو کر انتہائی متکبرانہ لہجے میں کہا جس کے ساتھ ہی ایک بار پھر ہال زوردار تالیوں سے گونج اٹھا اور اس کے انگ انگ میں پھلجھڑیاں پھوٹنے لگیں۔ جس کے بعد اس نے پرفریب انداز میں اپنا بھاشن شروع کیا اور سارے لوگ ہمہ تن وگوش سننے لگے۔

''مجھے خوشی ہے کہ ہمارا مشن اطمینان بخش طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے لیکن منزل ابھی بہت دور ہے اس لئے ہمارے سارے چاہنے والے اپنی اپنی کمر کس لیں اور اس کالے بادشاہ کا کالا مشن انتہائی چال بازی اور چابک دستی سے دنیا کے کونے کونے میں پھیلا کر اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں''۔

کہتے ہوئے اس نے طشتری سے ایک انسانی سر اٹھا کر ہوا میں اچھالا اور ایک زوردار قہقہہ لگا کر انتہائی طنزیہ انداز میں اپنا بھاشن جاری رکھا...... بھاشن کا لب لباب یہی تھا کہ اولاد آدم کو بلا لحاظ مذہب، رنگ، نسل، عمر، جنس اس طرح اپنی مقروہ سازشوں کا شکار بناؤ تاکہ ہر طرف تباہیاں پھیل جائیں۔ غرور تکبر اور انا کی حشیش ان کی رگ رگ میں اس طرح بھر دیں کہ انہیں غلط اور صحیح کی تمیز کرنے کی صلاحیت نہ رہے۔ بے ایمانیوں، خون ریزیوں، لڑائیوں، جنگوں، کالے جادو، فحاشی، نشیلی ادویات کا چلن، جھوٹ اور فریب کو عام کر دیں۔ عہد شکنیوں، حق تلفیوں .....اور دیگر بھیانک جرائیم کو ساری دھرتی پر پھیلا کر ان کے نعرہ انسانیت اور محبت کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ ان کے سینوں میں حرص اور ہوس کی بھٹیوں کو

ایسے سلگا دو تا کہ یہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں۔اس طرح اس صدیوں پرانے دشمن سے ہمارا بدلہ پورا ہوسکتا ہے......

کالے بادشاہ کی نشتر نما باتیں فیروزی کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے بن کر اتر رہیں تھیں۔اس نے یہ اخذ کرلیا کہ یہ کالے دیوؤں کا قلعہ ہے لیکن یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ انسانیت کے یہ دشمن انسان سے کس رنجش کا بدلہ لینا چاہتے ہیں؟اس نے دل میں ٹھان لی کہ وہ معاملے کے بارے میں تاجو سے جان کاری حاصل کرے گا۔ بھاشن کے دوران اچانک قلعہ ہلنے لگا تو خوف وڈر کے مارے فیروزی کے پسینے چھوٹنے لگے،خوف وہراس نے اسے بری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ حفظ ماقدم کے طور دل ہی دل میں اوپر والے کو یاد کرتے ہوئے رحم وکرم کی دعائیں کرنے لگا،لیکن ہر لمحے کے ساتھ قلعے کی تھر تھراہٹ تیز ہونے لگی۔

''قلعے میں ہمارے دشمن داخل ہوئے ہیں،میں اپنی خاص کالی شکتی سے انہیں بے نقاب کرونگا،تم لوگ جلدی سے انہیں پکڑ واور ٹکڑے ٹکڑے کر کے میرے سامنے لاؤ''۔

وہ اپنا بھاشن روک کر بے بسی کے انداز میں چلانے لگا،اس کے کالے چہرے پر ہل چل مچ گئی اور غیض وغضب سے کالی آنکھیں لال ہوگئیں،پورے قلعے میں اتھل پتھل مچ گئی جس کے ساتھ ہی تاجو تیزی سے بھاگنے لگا اور قلعے سے باہر نکل کر پھرتی سے اڑان بھری.....

''میرے آقا......اب ہم محفوظ ہیں''۔

کچھ دیر بعد تاجو نے کہا۔

''تاجو......کسی محفوظ جگہ زمین پر اترو،مجھے سخت پیاس لگی ہے''۔

فیروزی،جسے لگ رہا تھا جیسے موت اسے چھو کر گزری ہو،نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور کچھ منٹوں بعد وہ ایک بستی کے نزدیک ایک خوبصورت باغ میں اتر گئے۔تاجو نے پاس ہی موجود بازار سے پانی اور کھانے کی کچھ چیزیں لاکر فیروزی کے سامنے رکھ دیں۔ فیروزی پانی کے چند گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر گویا ہوا۔

''تاجو......آج ہم بال بال بچ گئے''۔

''آقا.....میں اپنے بچاؤ کے لئے مکمل تدبیر کر چکا تھا''۔

''زلزلے میں تدبیریں کام نہیں آتی ہیں''۔

''آقا.....وہ زلزلہ نہیں تھا''۔

تو پھر کیا تھا.....؟

''جب وہ مردود انسانیت کو تباہ کرنے کی باتیں کر رہا تھا تو مجھ سے رہا نہیں گیا، میں دل ہی دل میں اللہ کی بڑائی بیان کرنے لگا جسے اس کالے قلعے میں ہلکا سا زلزلہ پیدا ہو گیا.....''۔

''اسی وقت تو میں نے بھی اوپر والے کو پکارنا شروع کیا''۔

''فیروزی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا''۔

''آقا.....اسی لئے تو قلعے کی تھرتھراہٹ میں اضافہ ہو گیا اور اسے پہلے کہ وہ اپنی کالی شکتی کے استعمال سے ہمیں دیکھ لیتے اور پکڑ کر ہماری بلی چڑھا دیتے میں وہاں سے بھاگ نکلا''۔

''لیکن اتنی دیر تک انہوں نے ہمیں پکڑا کیوں نہیں؟''

''کیوں کہ میں نے ایک ایسا منتر پڑھا تھا جس کے اثر سے وہ ہمیں دیکھ نہیں پا رہے تھے''۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ شیطانی طاقت والے یہ کالے دیو اتنے بھیانک اور انسانیت کے ازلی دشمن ہیں۔

''نہیں آقا.....یہ کالے دیو نہیں ہیں.....''۔

''تو پھر کون ہیں؟ اور اپنے آپ کو کالا بادشاہ کہنے والا کون تھا؟ اور یہ جشن.....؟''

''میرے آقا.....وہ اس قلعہ کا بادشاہ یعنی بڑا شیطان تھا اور وہاں موجود سب لوگ اس کے حواری۔ قلعے کے صدر دروازے پر لگے سائین بورڈ کے مطابق وہ اپنے شیطانی مشن کی لگاتار کامیابیوں کی خوشی میں جشن منا رہے تھے''۔

تاجو نے جواباً کہا۔

☆☆☆

آتما

ایک عرصہ بعد میرے دل میں مچھلی پکڑنے کے شوق نے انگڑائی لی اور پوری تیاری کر کے میں صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی خوشی میں جھومتے ہوئے دریا کنارے اپنی پسندیدہ جگہ پر پہنچ گیا۔ صبح کی صاف وشفاف ہوائیں، پرندوں کے سریلے نغمے اور دور دور تک تنہائی ہی تنہائی، ہر چیز میں اللہ کے وجود کا ظہور نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ کچھ دیر تک ادھر اُدھر کا جائزہ لینے اور اس دل موہ لینے والے پرسوز ماحول سے لطف اندوز ہونے کے بعد میں نے دریا میں کانٹا لگایا اور مچھلی پھنسنے کے انتظار میں سرور کی کیفیت میں خاموشی سے ایک قد آور چنار کے درخت کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ہی دریا کی پانیوں پر تیرتے ہوئے ایک کشتی آ گئی، جس میں ایک اکیلی باوقار خاتوں سوار تھی، میرے نزدیک پہنچ کر اس نے کشتی روکی اور کشتی سے اترتے ہوئے گویا ہوئی......

''ارے کیوں اپنا وقت ضایع کر رہے ہو؟''

''کیوں......؟''

''اس دریا میں اب مچھلیاں کہاں، اسے تو آپ لوگوں نے بانجھ بنا دیا ہے''۔

اس نے سرد لہجے میں کہا اور مجھ سے تھوڑی دوری پر بیٹھ کر اداسی کی حالت میں خلا میں گھورنے لگی۔ میں نے اس کی بات پر زیادہ توجہ نہیں دی لیکن اس کی آمد سے خوش ضرور ہوا کیوں کہ اس سنسان جگہ پر کوئی آتا جاتا بھی نہیں تھا۔

''کام کیا کر رہے ہو؟''

کچھ لمحوں بعد اس نے پوچھا۔

''کہانی کار ہوں اور کہانیاں لکھ کر کہانیوں کے بازار میں سجاتا ہوں''۔

میں نے مختصر سا جواب دیا اور توجہ سے کانٹے کی طرف دیکھنے لگا کیوں کہ کوئی شئے دیرے سے کانٹے کو کھینچنے لگی تھی۔

''ہا... ہا... ہا.....''

کچھ لمحوں بعد دفعتاً نسوانی آواز میں زور زور سے کھلکھلا کر ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔

''آ گئی بے چاری''۔

خاتون نے اداس لہجے میں کہا۔

''کون آ گئی.....؟''

''زخمی آتما''۔

''آتما.....؟''

آتما سن کر میرے پورے وجود میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی اور میں نے یہاں سے جانے کا ارادہ کر کیا۔

''ہاں..... تمہیں معلوم نہیں کہ سالہا سال سے جہلم کے کناروں پر کوئی زخمی آتما گھومتی ہے، لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ کسی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچاتی ہے''۔

میرے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں دیکھ کر اس نے کہا تو میری گھبراہٹ کسی حد تک دور ہو گئی اور میں پھر سے کانٹے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کچھ لمحوں بعد خوب صورت نسوانی آواز میں گانے کی آوازیں آنے لگیں۔

''ماں جی..... یہ گانے کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں''۔

''ارے بولا نا .....آتما.....''۔

''لیکن یہ تو حبہ خاتون کا کلام ہے''۔

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں.....جبہ خاتوں اسی دریا پر آکر اپنا دکھڑا سناتی تھی .....لل عارفہ کے واکھ یہی گنگنائے جاتے تھے......رسول میر اپنی محبوباؤں کی شکایت اسی دریا سے کرتا تھا....... مہجور اسی وتستا کی آغوش میں بیٹھ کر اپنے ہجر کی داستانیں دہراتا تھا.....آزاد اپنے پیار کے نغمے اسی دریا کی گود میں بیٹھ کر ترتیب دیتا تھا...... بہارستان شاہی بھی یہی ایک ڈونگے میں لکھی گئی تھی ۔اسی دریا کی مجلس میں بیٹھ کر رشیوں ،منیوں نے تپسیا کی ،صوفیوں نے وضائف دہرائے ،کوئیوں نے کویتائیں کہیں اور شعرا نے دل کے تاروں کو چھیڑنے والے رسیلے نغمے تخلیق کئے......بہت سے کہانی کار ،شعرا اور مصور یہاں آکر لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے خداداد فن کا مظاہرہ بھی کرتے رہے''۔

اس نے بڑے ہی پر جوش اور فلسفیانہ انداز میں کہا اور آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگی جب کہ میں گنگ ہو کر رہ گیا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ آخر یہ خاتوں ، جسے میں مچھیرن سمجھ بیٹھا تھا ،کون ہے؟ جو اس کے پاس اتنی جانکاری ہے۔کچھ وقفے کے بعد ہی تیز ہوائیں چلنے لگیں اور دریا سے پانی کی لہریں اٹھنے لگیں جس کے ساتھ ہی مجھے لگا کہ کوئی بھاری چیز میرے سر سے ٹکرائی اور میرا سر بہت بھاری ہو گیا

''ماں جی......ماں جی......''۔

میں دونوں ہاتھوں میں اپنا سر پکڑ کر خاتون کو پکارنے لگا۔

''یہ اب نہیں بولے گی بیٹا''۔

ایک شفقت بھری نسوانی آواز میرے سماعتوں سے ٹکرائی۔

''کیوں نہیں بولے گی؟''

میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا اور وہ خاتون بے سدھ پڑی تھی۔

''مجھے اب یہاں سے چلنا چاہیے ،لیکن میرا سر اتنا بھاری کیوں ہو گیا؟''

''میرے ہونٹ خشک ہو کر پھڑ پھڑانے لگے اور حفظ ماتقدم کے طور پر میں دل ہی دل میں اللہ کے پاک کلمات کا ورد کرنے لگا''۔

''گھبراؤ نہیں بیٹا، تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے یہ میں تمہارے سر پر سوار ہوں''۔

''کون ہو آپ؟ مجھے جانے دو پلیز......''۔

''شوق سے جاؤ بیٹا، لیکن میری کہانی نہیں لکھو گے؟''

اس نے درد میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

''آپ کی کہانی، لیکن......''۔

میں جان چھڑانے کے لئے سوچ میں پڑتے ہوئے سامنے دکھ رہی پہاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔

''وہاں کیا دیکھ رہے ہو؟ اس جگہ کو سلیمان ٹینگ کہتے ہیں، معلوم ہے کیوں؟''

''جی نہیں......''۔

''تو سنو، تب اس فردوس بریں پر پانڈو راج کرتے تھے، نہیں نہیں یہ راجہ نریندر کے دور کی بات ہے ''تخت سلیمانی'' اڑتے اڑتے آیا اور پورے کشمیر کا چکر لگانے کے بعد اس جگہ پر بیٹھ گیا اور راجہ نریندر خود چل کر اس تخت پر بیٹھے بزرگ سے ملنے گیا اسی لئے یہ جگہ سلیمان ٹینگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد بدھ مت کا دور آیا اور راجہ اشوک تخت پر براجمان ہو گیا۔ بدھ دور یہاں تقریباً چودہ سو سال تک رہا، یہ دور علم و ادب کے حوالے سے سنہری دور رہا ہے۔ اس دور میں یہاں دنیا بھر سے طالب علم آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے اور اس دور میں یہاں دنیا بھر کے بدھ عالموں کی علمی کانفرنس بھی منعقد ہوئی......''۔

''کہانی تو بڑی دلچسپ ہے''۔

میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

''اس کے بعد کیا ہوا؟''

میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''راجہ رام دیو کے بعد راجہ للتا دتیہ بھی بڑا راجہ گزرا ہے۔ ارے ہاں یہاں میری کئی بیٹیوں نے بھی راج پاٹھ چلایا ہے۔ رانی جشومتی، پھر دیدرانی اور پھر کوٹہ رانی یہاں کے شاہی تخت پر براجمان رہیں۔ رنچن شاہ یہاں کا راجہ بنا اور اسی دوران حضرت بلبل شاہؒ نے

بھی وارد کشمیر ہو کر دین اسلام کے بیج بونا شروع کئے اور دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ راجہ رنچن شاہ بھی ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ سلاطین شہمیری ارض وطن کے وہ خوش قسمت بادشاہ گزرے ہیں جن کے دور میں حضرت میر سید علی ہمدانیؒ (جنہیں عرف عام میں شاہ ہمدان کہتے ہیں) تبلیغ دین کی خاطر کشمیر تشریف لائے۔ سلطان شہاب الدین اور سلطان قطب الدین وہ خوش قسمت بادشاہ گزرے ہیں جنہیں شاہ ہمدانؒ سے روبرو ملنے کی سعادت ملی ہے اور حضرت کی خدمت کا موقعہ ملا ہے۔ پھر زین العابدین بڈ شاہ کا یادگار دور شروع ہوا اور ہر طرف ترقی اور خوشحالی کے مدھر گیت بجنے لگے۔ یہی وہ بڑا باشاہ گزرا ہے جو کئی بار سادات کی محفلوں میں آتا جاتا رہا اور اس کے دور میں علمدار کشمیر حضرت شیخ نور الدین نورانی رحمت اللہ کی فیض و برکات جاری و ساری رہی۔ میں حبہ خاتون اور یوسف شاہ چک کی محبت کی بھی عینی شاہد ہوں۔ مغلوں نے اس بہشت نما وادی پر قبضہ کر کے دھوکے سے یوسف شاہ چک گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا۔ اپنے محبوب کی جدائی میں حبہ خاتون کے وہ مدھر مدھر درد بھرے گیت اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ مغلوں کے طویل دور کے بعد افغانی پھر سکھ اس بے نواع قوم کے حکمران بن کر عوام کی چھاتیوں پر مونگ دلتے رہے''۔

وہ خاموش ہوگئی تو میں جیسے پھٹ پڑا۔

''پھر کیا ہوا؟''

''بیٹا یہ ہزاروں سالوں پر محیط بہت لمبی کہانی ہے میں کتنا کہوں گی اور تم کتنا سنو گے مختصر الفاظ میں یہ کہوں گی کہ مغلوں کے بعد شاطر انگریز آیا جس نے ''بیہ نامہ امرتسر'' کے تحت کشمیری عوام کو فی کس سات روپیہ کے حساب سے پچھاتھر لاکھ نانک شاہی سکوں میں ڈوگروں کو بیچ دیا۔ ڈوگرہ شاہی کے طویل دور کے بعد اگر چہ ایک نیا دور آ گیا لیکن میرا وجود پھر بھی خون کی ندیوں میں غوطہ زن رہا اور میں اب بھی بے انصافی کی تپش میں جل رہی ہوں۔ بہت نڈھال اور تکلیف میں ہوں......''۔

کہتے ہوئے اس کی سسکیاں بندھ گئی اور وہ خاموش ہوگئی۔

''آگے کیا ہوا؟''

میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہر دور میں حالات کے بے رحم تھپیڑوں نے میرے وجود کو بے شمار گہرے گھاؤ دیئے اور میرے دل اور جسم کا درد بڑھتا ہی گیا''۔

''مگر یہ گھاؤ کس نے اور کیوں دیئے؟''

میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''کچھ اپنوں کی بے اعتنائیاں اور کج ادائیاں......کچھ غیروں کے ظلم و ستم۔

''مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ تم لوگوں نے بھی مجھے نہیں بخشا۔ میری افادیت کو نظر انداز کر کے میری نا قدری کی ہے۔ اپنی عیش کوشی کے سامان کے لئے میرے پاک وصاف وجود کو غلاظت کا ڈھیر بنا دیا ہے اور اپنی خود غرضیوں کی وجہ سے میرے سینے کو چھلنی کر کے میرے انگ انگ کو داؤ پر لگا دیا ہے''۔

اس نے کہانی کا رخ موڑتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھ لیا۔

''پر آپ ہو کون؟''

''میں وتستا ہوں......جس سے تم لوگ جہلم اور ویتھ کے نام سے بھی پکارتے ہو......خدا حافظ''۔

اس نے کہا، جس کے ساتھ ہی ہوا کا ایک لطیف جھونکا مجھ سے ٹکرایا اور میرا بھاری سر بالکل ہلکا ہو گیا۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ خاتون، جو میرے سامنے بے ہوش پڑی تھی، کشتی میں جا رہی تھی۔

☆☆☆

محبت کے رنگ

''اب میں اور نہیں چل سکتا، بھوک سے میرا برا حال ہو رہا ہے''۔

شہزاد نے چلتے چلتے اچانک ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''سر...... ہم اپنی منزل پر پہنچنے ہی والے ہیں، وہ بڑا میدان جو دکھ رہا ہے وہیں ہمیں ٹھہرنا ہے''۔

گائیڈ نے تھوڑی دوری پر دکھ رہے میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو شہزاد کی ہمت بندھ گئی اور وہ اٹھ کر دھیرے دھیرے چلنے لگا۔ شہزاد سیر سپاٹے کا کافی شوقین تھا اور آج اپنے دوست کے ہمراہ دور دراز جنگلی علاقے کی سیر کے لئے نکلا تھا، ان کے ساتھ ایک مقامی گائیڈ اور دو نوکر بھی تھے۔ قریب آٹھ گھنٹے سے وہ لگاتار پاپیادہ محو سفر تھے، جو بھی پکا ہوا کھانا وغیرہ ساتھ تھا وہ ختم ہو چکا تھا اور وہ سب بھوک سے نڈھال تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے اور ایک جگہ جہاں، صاف وشفاف پانی کی ندی بہہ رہی تھی، پر پڑاؤ ڈال دیا۔ گائیڈ اور نوکر خیمہ نصب کرنے لگے جب کہ شہزاد اور اس کا دوست سلیم ندی پر مُنہ ہاتھ دھو کر صاف شفاف سبزے پر بیٹھ کر ادھر اُدھر کا جائیزہ لینے لگے۔ یہ فلک بوس پہاڑوں میں گھری ایک چھوٹی سی خوب صورت وادی تھی، جہاں ہر طرف اونچے اونچے درخت، سبزہ ہی سبزہ اور قسم بہ قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے جب کہ بہتی ندی کا شور اور پرندوں کی سریلی آوازیں ماحول کو اور زیادہ پوکشش بناتی تھی۔

''سلیم...... دیکھ یار قدرت کی کاریگری، کتنی خوب صورت جگہ ہے''۔

''ہاں شہزاد ......میں میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ اتنی پرکشش جگہ پر پانچ چھ دن گزارنے ہی چاہئے''۔

''کرچپ ...... ہمیں کل ہی واپس جانا ہے، میں امی اور ابو کو زیادہ دیر اکیلے نہیں چھوڑ سکتا''۔

''تبھی تو میں کہتا ہوں کہ شادی کرلو تاکہ تمہاری بیوی یہ ذمہ داری سنبھالے''۔

سلیم نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا لیکن وہ موضوع بدلتے ہوئے گویا ہوا۔

''سلیم ......وہ دیکھو ان درختوں میں کچھ ڈھوکے دکھ رہے ہیں، چلو دیکھتے ہیں وہاں کون لوگ رہتے ہیں''۔

کچھ دیر بعد ہی وہ ڈھوکوں کے قریب پہنچ گئے۔ایک ڈھوکے کے باہر ایک عورت چولہے پر دودھ ابال رہی تھی جب کہ ایک طرف پھٹے پرانے میلے سے کپڑوں میں ملبوس کچھ بچے بےفکری سے کھیل رہے تھے۔

''ماں جی ......بہت بھوک لگی ہے، کچھ کھانے کو دے دو''۔

احسان، جسکے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے، کی مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔احسان کی بات سن کر وہ عورت ان کو عجیب نظروں سے گھورنے لگی۔

''ماں جی ......آپ گھبرائیں نہیں، ہم یہاں سیر کے لئے آئے ہیں اور وہ ہم نے خیمہ نصب کیا ہے''۔

''اچھا پتر ......بیٹھ جاؤ، پکے چاول اور دہی کھاؤ، لیکن سالن نہیں ہے''۔

شہزاد کی بات سے مطمئن ہو کر عورت نے انہیں پرخلوص لہجے میں کہا اور وہ دونوں پاس ہی ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔

''گلابو......اے گلابو......''۔

''کیا ہے مائی......؟''

عورت کی آواز پر ڈھوکے سے، ہاتھ میں کتاب لئے ،ایک لڑکی باہر آئی جس پر نظر پڑتے ہی شہزاد کھوسا گیا۔لڑکی اگرچہ معمولی لباس میں ملبوس تھی لیکن خوب صورت مجسم

......لمبا قد...... بولتی ہوئی ساحر آنکھیں جن سے عجیب سی چمک چھلک رہی تھی...... چہرے پر شفق کھلے......ہونٹوں پر گلاب کی پتیاں بکھری اور انگ انگ سے جیسے شباب کے پھول جڑ رہے تھے۔

''شہزاد...... کہاں کھو گیا۔ کھانا کھاؤ''۔

لڑکی نے کھانا، دہی اور نمک لاکر کب ان کے سامنے رکھا شہزاد کو پتہ ہی نہیں چلا۔ سلیم کی آواز سن کر شہزاد سوچوں سے باہر آ گیا اور وہ کھانا کھانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ لڑکی ہاتھ میں ایک پیاز اور چاقو لے کر آ گئی اور خاموشی سے پیاز کاٹا اور اس پر نمک اور مرچ چھڑک کر ان کے سامنے رکھا۔

''آپ کا نام کیا ہے......؟''

جونہی وہ واپس جانے کے لئے مڑی تو شہزاد نے پوچھا۔

''گلابو......''۔

''کیا کرتی ہو......؟''

''کبھی مال مویشیوں کے پیچھے تو کبھی گھر کا کام''۔

''وہ جو آپ کے ہاتھ میں کتاب، میرا مطلب ہے کس کلاس میں پڑھتی ہو؟''

''میں نے پڑھائی چھوڑ دی، وہ ایک ناول ہے جو آتے ہوئے میں نے راستے میں خریدا تھا''۔

''پڑھائی کیوں چھوڑ دی...؟''

''ہم خانہ بدوش جو ٹھرے۔ کیسے پڑھیں؟''

''کیوں؟ سرکار نے خانہ بدوشوں کی سہولیت کے لئے کئی سکیمیں بنائی ہیں''۔

''سب کہنے سننے کی باتیں ہیں......''۔

''معاف کرنا بیٹا، گھر میں پکانے کے لئے سبزی نہیں تھی''۔

اسی لمحے گلابو کی ماں نے آ کر معذرت طلب لہجے میں کہا اور وہ اندر چلی گئی۔

''نہیں ماں جی...... اتنا مزے دار کھانا میں نے زندگی بھر نہیں کھایا ہے''۔

سلیم نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا اور کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر اس سے باتیں کرنے کے بعد وہ اپنے خیمے کی طرف چلے گئے جہاں شہزاد ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے گم صم بیٹھ گیا۔

''شہزاد کیا بات ہے؟ روبی کی یاد آ رہی ہے''۔

سلیم نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھ کر اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ اس خود غرض لڑکی کا نام میرے سامنے مت لیا کرو''۔

شہزاد نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''او کے ڈیر..... چائے نوش فرمائیں، تھکاوٹ دور ہو جائے گی''۔

شہزاد نے چائے اٹھائی تو اسے پیالی میں گلابو کا چہرہ نظر آیا اور چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ چائے پی کے سلیم ارد گرد کے نظارے دیکھنے لگا جب کہ شہزاد وہیں بیٹھ کر گہری سوچوں میں کھو گیا......

شہزاد ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، اعلیٰ تعلیم یافتہ، انتہائی ذہین، قابل اور با اخلاق لڑکا تھا۔ اس کا والد بھی ایک اچھے عہدے پر فائیز رہنے کے بعد سبکدوش ہو چکا تھا جب کہ والدہ کچھ عرصہ سے بیمار ہونے کے سبب چلنے پھرنے سے قاصر تھی۔ اس کا بڑا بھائی ڈاکٹر تھا جس نے اپنی پسند پر ایک ڈاکٹرنی سے شادی کی تھی لیکن شادی کے کچھ مہینوں کے بعد ہی بیمار ماں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا الگ گھر بسایا۔ بھائی کی اس حرکت پر شہزاد بہت دکھی ہو گیا لیکن اس کے بس میں کچھ نہیں تھا، وہ بس دل جان سے ماں باپ کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ سول سروسز امتحان کی تیاری بھی کرتا رہا۔ گھر کی حالت دیکھ کر وہ چاہتا تھا کہ وہ جلد سے جلد روبی سے شادی کر لے لیکن روبی نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ جب تک تمہیں کوئی اچھی نوکری نہیں ملتی میرے گھر والے اس شادی پر ہرگز راضی نہیں ہونگے۔

روبی اس کے پڑوس میں رہتی تھی اور کالج کے زمانے سے ہی وہ ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے اور شادی کرنے کا فیصلہ بھی کر چکے تھے۔ وقت گزرتا رہا شہزاد

نے سول سروسز کا امتحان پاس کیا اور اچھے عہدے پر فائز ہو گیا، جس کے بعد اس نے روبی پر شادی کے لئے زور ڈالنا شروع کیا لیکن وہ مختلف بہانوں سے ٹالتی رہی، آخر اس نے ایک دن روبی کو اپنے آفس میں بلایا اور بڑے ہی سنجیدہ انداز میں گویا ہوا۔

''روبی......اب ہمیں جلد سے جلد شادی کر لینی چاہئے''۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے جناب...... ویسے تم کو رہائشی کوارٹر مل گیا''۔

اس نے ایک ادا سے کہا۔

''کوارٹر تو مل گیا، لیکن فلحال ہم اپنے ہی گھر میں رہیں گے یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے''۔

''وہ تو ٹھیک ہے... پر... وہاں تمہارے امی ابو بھی رہتے ہیں''۔

''روبی تم کہنا کیا چاہتی ہو......؟''

''میں چاہتی ہوں کہ شادی کے بعد ہم کوارٹر میں شفٹ ہونگے اور امی ابو گھر میں ہی رہیں گے، تم مجھے غلط مت سمجھنا، ہم ان کے پاس آتے جاتے رہیں گے''۔

''روبی تم ہوش میں تو ہو، میری ممی بیمار ہیں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا''۔

''کیوں نہیں ہو سکتا؟ تمہارا بھائی بھی تو انہیں چھوڑ کر الگ رہ رہا ہے''۔

شہزاد نے روبی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اپنی زد پر اڑی رہی اور جاتے جاتے شہزاد سے کہہ گئی۔

''اگر تم میرے ساتھ الگ گھر میں نہیں رہ سکتے تو میرے ساتھ شادی کرنے کا خواب بھی دل سے نکال دو''۔

روبی کی باتوں سے شہزاد کے تن بدن میں کانٹے سے چبھنے لگے، لیکن وہ خاموش رہا۔ روبی کو پورا یقین تھا کہ اس کے بے پناہ پیار سے مجبور ہو کر شہزاد جلد ہی اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دے گا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور شہزاد اپنے والدین کی خوشی کے لئے جدائی کا گھونٹ پینے پر آمادہ ہو گیا۔

''شہزاد......وقت کیا ہو گیا؟''

''وقت......او مائی گارڈ، آٹھ بج چکے ہیں''۔

سلیم کی آواز سے شہزاد نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''شمیر ......کھانا تیار ہوگیا''۔

''جی صاحب......سب کچھ تیار ہے''۔

''تم ایسا کرو ایک برتن میں سالن ڈال کر ان کو دے آؤ، سلیم بھی تمہارے ساتھ جائے گا''۔

شہزاد نے گلابو کے گھر پکا ہوا گوشت سبزی وغیرہ بھیجی۔ واپس آکر وہ کھانا کھانے بیٹھ گئے تو شہزاد نے سلیم سے پوچھا۔

''کون تھا وہاں؟''

''پوری فیملی تھی، ساتھ میں بکریاں، گائیں اور بچھڑے بھی تھے''۔

سلیم نے مذاق کے انداز میں کہا۔

''اچھا......شہزاد نے سر کھجاتے ہوئے کہا''۔

''اور وہ بھی تھی.....''۔

''کون؟''

شہزاد بے تابی سے پوچھا۔

''گلابو، ناول پڑھ رہی تھی''۔

گلابو کا نام سنتے ہی شہزاد کا اداس چہرہ کھل اٹھا اور وہ کھانا کھانے لگے۔

صبح جلدی اٹھ کر شہزاد نے پاس بہہ رہی ندی پر نہایا اور کمبل اوڑھ کر خیمے کے باہر دھوپ سینکنے بیٹھا ہی تھا کہ اس کی نظر گلابو پر پڑی جو ایک برتن لئے اسی کی طرف آرہی تھی۔ گلابو کو دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہونے لگا۔

''صاحب......مائی نے چائے کے لئے دودھ بھیجا ہے''۔

اس نے شرماتے ہوئے سلام کی اور برتن اس کے سامنے رکھتے ہوئے متبسم ہونٹوں سے کہا۔

’’جی شکریہ......آپ نے تکلیف کیوں کی؟‘‘
شہزاد نے کہالیکن گلابو کچھ نہیں بولی اور واپس جانے کے لئے مڑی۔
’’سنیے، کل جو ناول آپ پڑھ رہی تھی، مجھے پڑھنے کے لئے دیں صبح واپس کروں گا‘‘۔

وہ ہرنی کی طرح دوڑتی ہوئی گئی اور ناول لے کر آ گئی، بنا کچھ کہے ناول شہزاد کو تھمایا اور واپس چلی گئی، شہزاد اس کو تب تک دیکھتا رہا جب تک نہ وہ اس کی نظروں کی اوجھل ہو گئی۔

’باغوان‘، ناول کا عنوان دیکھ کر شہزاد چونک گیا اور اسے امتابھ بچن کی فلم ’باغبان‘ یاد آ گئی۔

’’کیوں جناب......صبح صبح یہ کتاب کہاں سے آ گئی‘‘۔
شہزاد ناول پڑھنے میں مصروف تھا تو سلیم نے چائے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔
’’گلابو نے دی ہے‘‘۔
شہزاد نے خوشی بھرے لہجے میں کہا تو سلیم کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی لیکن وہ خاموش ہی رہا۔ کچھ دیر بعد سلیم گھومنے کے لئے نکلا جب کہ شہزاد ناول پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ دوپہر سے پہلے سلیم واپس آیا تو شہزاد نے ناول نیچے رکھا اور جمائی لیتے ہوئے ایک ادا سے بولا۔
’’کافی دلچسپ اور بامقصد ناول ہے‘‘۔
’’گلابو سے بھی زیادہ......؟‘‘
’’جب دیکھو....بک بک کر رہے ہو‘‘۔
شہزاد نے چڑ کر کہا۔
’’دیکھو شہزاد......تم میرے بچپن کے دوست ہو اور میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ میں کل ہی سمجھ گیا کہ پہلی ہی نظر میں تم گلابو پر فدا ہو گئے، لیکن کیا تم اس خانہ

بدوش لڑکی سے شادی کر سکتے ہو؟''

''کر تو سکتا ہوں، لیکن ......''۔

لیکن کیا......؟

''تم تو جانتے ہی ہو کہ میں شادی اسی لڑکی سے کروں گا جو امی، ابو کی دل جان سے خدمت کرے''۔

''تو پھر گلابو سے بہتر لڑکی مل ہی نہیں سکتی''۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''اسے دیکھ کر ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک باحیا اور وفادار لڑکی ہے اور یہ ناول جو تم نے پڑھا اس کا تھیم کیا ہے؟''

''یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اپنے گھر کو جنت بنانا چاہتی ہے''۔

''گلابو بھی ایک ایسے ہی جنت نما گھر کے خواب بنتی ہے''۔

''تمہیں کیسے معلوم......؟''

''میں صبح سے گلابو کے ڈھیرے پر ہی تھا، میں نے اسے تمہاری ساری کہانی سنائی اور اگر تم چاہو تو میں اس کے والدین سے بات کر کے بات آگے بھی بڑھا سکتا ہوں''۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں بھی گلابو سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔

اسی لمحے ان کے ملازم نے کھانا لگایا اور کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں گلابو کے ڈیرے پر پہنچ گئے جہاں شہزاد نے گلابو سے کچھ دیر باتیں کی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے پیار کا اظہار بھی کیا جب کہ گلابو کی آنکھوں کی وادی میں بھی اسے رضامندی کے جگنو نظر آئے۔

''ہم تو ٹھہرے غریب خانہ بدوش لوگ، ہمارا بڑے لوگوں کے ساتھ کیا مقابلہ''۔

باتوں کے دوران گلابو نے اچانک ایک ادا سے کہا اور گردن کو خم دے کر تھوڑی دوری پر واقع دوسرے ڈھوکے کی طرف جاتے ہوئے ماں کو آواز دی۔

''مائی......میں شیرو کے ڈھیرے جا کر چاچی کو دوائی کھلاؤنگی''۔

''جا پتر......انہیں چائے بھی بنا کے دینا''۔

''ماں جی......وہاں کون رہتا ہے؟''

سلیم نے گلابو کی ماں سے پوچھا۔

''پتر......اپنی ہی برادری کے لوگ ہیں، ان کا بیٹا شیرو مال مویشیوں کے ساتھ ہے، ایک حادثے میں شیرو کی ماں کی ٹانگیں بے کار ہو گئیں ہیں اور وہ چل پھر نہیں سکتی سو گلابو ہی ان کا خیال رکھتی ہے''۔

اس نے کہا اور وہ دونوں بھی اپنے خیمے میں جا کر صلاح مشورہ کرنے لگے۔ شام کو وہ دونوں گلابو کے ڈیرے پہنچے اور سلیم نے بغیر کسی تمہید کے اس کے والدین سے گلابو کا ہاتھ مانگا، جنہیں پہلے اس کی بات پر یقین نہیں آیا پھر اس کا باپ گویا ہوا۔

''ہمیں سوچنے کے لئے کچھ وقت چاہیئے''۔

''دیکھیئے اگر آپ ذرا جلدی کریں تو مہربانی ہوگی کیوں کہ ہم زیادہ دن یہاں رک نہیں سکتے''۔

سلیم نے انتہائی عاجزی سے کہا تب جا کر اس نے دوسرے دن شام کو آنے کے لئے کہا۔ دوسرے دن صبح ہی شہزاد سے کہہ کر سلیم ایک میل کی دوری پر واقع دوسری پہاڑی کی طرف، جہاں فون کے سگنل آ رہے تھے، کی طرف گیا اور فون کر کے شہزاد کے والدین کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا، جو سن کر خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ واپس آتے ہوئے سلیم کا سامنا گلابو سے ہوا۔

''گلابو......کہاں جا رہی ہوں؟''

''ایک فون کرنا ہے''۔

اس نے روکھے سے لہجے میں کہا اور چلی گئی۔ پورا دن شہزاد گلابو کے ڈیرے کی طرف کن اکھیوں سے دیکھتا رہا جہان اس کو بیچ بیچ میں گلابو کے حسن لازوال کی جھلک نصیب ہوتی رہی۔ شام کو سلیم ایک نوکر کے ہمراہ ان کے ڈیرے پہنچا جہاں گلابو کے والدین کے علاوہ ان کے برادری کے چند لوگ بھی موجود تھے۔ جنہوں نے شادی کے حوالے سے

اپنے تحفظات کا اظہار کیا لیکن سلیم نے بڑے ہی دانشمندانہ انداز میں نہ صرف ان کے تحفظات کو دور کیا بلکہ انہیں اس بات پر بھی راضی کرلیا کہ گلابو، اس کے والدین اور خاندان کے کچھ لوگ کل ہمارے ساتھ ہی شہر جائیں گے، جہاں ہم شادی کی تیاریاں کر کے کچھ دن بعد شادی انجام دیں گے۔

رات بھر خوشی کے مارے شہزاد اور سلیم سو نہ سکے اور خوش گپیوں میں مصروف رہے ،شہزاد کے نفسیاتی زیر و بم میں عجیب سا سرور چھایا رہا۔صبح بوریا بستره سمیٹ کر فرط نشاط و انبساط میں جھومتے ہوئے وہ مقررہ وقت پر گلابو کے ڈیرے پہنچے، گلابو کے والدین اور خاندان کے کچھ لوگ جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے لیکن گلابو کئی نظر نہیں آرہی تھی۔

''بابا.....سفر لمبا ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے''۔

سلیم نے گلابو کے باپ سے کہا۔

''ہم تو بالکل تیار ہیں لیکن گلابو اندر تیار ہو رہی ہے''۔

''اچھا ٹھیک ہے''۔

کہہ کر وہ نیچے بیٹھ کر گلابو کا انتظار کرنے لگے۔آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزرنے کے بعد بھی جب گلابو باہر نہیں آئی تو اس کے باپ نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کئی بار گلابو کو آواز دی، لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

''گلابو......دیکھ میں آگیا گلابو......''۔

اسی لمحے گھوڑے پر سوار ایک گھبرو جوان چلاتے ہوئے آگیا۔

گلابو بھی ایک دم دروازہ کھول کر باہر نکلی اور گھوڑ سوار کے پاس پہنچ گئی۔اس کی ساحر آنکھوں میں آنسوؤں کے ڈورے تیر رہے تھے۔

''گلابو......یہ کیا حرکت ہے؟''

اس کے باپ نے خشمناک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''بابا.....غصہ کیوں کر رہے ہو؟ گلابو میری منگیتر ہے''۔

شیرو نے نرم لہجے میں کہا۔

’’گلابو......تم پڑھائی والی کُڑی ہو اور میں تمہاری شادی ہرگز اس گوار شیرو سے نہیں کروں گا، شہر جا کر عیش و آرام سے زندگی گزارو گی‘‘۔

بابا نے شیرو کی بات پر دھیان نہ دیتے ہوئے کہا۔

’’بابا...... مجھے شادی کی پرواہ نہیں ہے، لیکن میں اپنے عیش و آرام کے لئے شیرو کی اپاہج مائی اور بوڑھے بابا کو چھوڑ کر شہر نہیں جا سکتی۔

کیوں نہیں جا سکتی......؟

’’کیوں کہ وہ بے سہارا ہو جائیں گے اور میرا دل اتنا بڑا نہیں ہے کہ اس میں اتنا بھاری بوجھ سما سکے‘‘۔

’’مجھ سے زبان لڑاتی ہے......‘‘۔

’’بس بابا...... اگر مجھے اس دل والی گلابو کا پیار نصیب ہوتا سے تو میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا، لیکن اس کے پیار کا رنگ ہی نرالا ہے اور میں اپنی خوشیوں کے لئے شیرو کے گھر کی خوشیاں چھین نہیں سکتا، چلو سلیم......‘‘۔

شہزاد نے جذباتی انداز میں ناول گلابو کو تھماتے ہوئے کہا اور وہ ہارے ہوئے جواریوں کی طرح بھاری قدموں سے وہاں سے نکل گئے۔

☆☆☆

ٹھنڈی چھاؤں

انسپکٹر راشد شام کو جب گھر پہنچا تو احسان کو گم سُم ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا دیکھ کر اس کا خون کھل اٹھا۔ اس نے بغیر کچھ پوچھے نہ صرف اس کو ڈانٹنا شروع کر دیا بلکہ اس کے معصوم گالوں پر کئی زناٹے دار چانٹے ایسے رسید کئے جیسے کسی مجرم سے پوچھ تاچھ کرتا ہو۔ مار کھاتے ہوئے احسان، جس کے گال کشمیری سیب کی طرح سرخ ہو گئے، کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوں گرنے لگے اور وہ ممی ممی پکارتا رہا لیکن ممی، جو اس کے چھوٹے بھائی کو گود میں لئے پیار سے کھانا کھلا رہی تھی، کے کانوں پر جو تک نہیں رینگی۔ احسان کی پٹائی کرنے کے بعد جب راشد اپنے کمرے میں داخل ہو گیا تو وہ بھی اس کے پیچھے داخل ہو گئی۔

''میں احسان بیٹے کے لئے سخت پریشان ہوں۔ یہ کسی کی ایک بھی نہیں سنتا ہے۔ اپنی ہی من مانی کرتا ہے اور دن بدن بگڑتا ہی جا رہا ہے......''۔

اس نے فکر مند لہجے میں راشد کا کوٹ پکڑتے ہوئے کہا۔

''احسان ابھی بچہ ہے......دھیرے دھیرے سدھر جائے گا''۔

راشد نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور صوفے پر دراز ہو کر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے گہرے سوچوں میں ڈوب گیا، جب کہ ننھا احسان کچھ دیر آنسوں بہانے کے بعد بغیر کھانا کھائے نیند کی دیوی سے بغل گیر ہو گیا۔ راشد کا غصہ بے معنی نہیں تھا۔ آج دن میں جب پرنسپل نے فون کر کے اس کو سکول آنے کے لئے کہا تھا تو اسی وقت اس کا پارہ چڑھ گیا کیوں کہ پہلے بھی پرنسپل نے اس کو سکول بلا کر احسان کی شکایت کی تھی کہ وہ دن بہ دن

پڑھائی میں کمزور ہوتا جا رہا ہے...... اکثر گم سُم اور کھویا کھویا رہتا ہے جب کہ کھیل کود اور دوسری سرگرمیوں میں بھی عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

پرنسپل نے راشد کی موجودگی میں ہی احسان کو اپنے دفتر میں بلا کر چند آسان سوالات پوچھے جن کا وہ کوئی جواب نہیں دے سکا بلکہ خوف اور انتشار کی حالت میں اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے شرمندگی کی حالت میں ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ احسان، جو ایک ہونہار اور قابل بچہ تھا، کے اس نکمے پن اور نا قابلیت پر راشد کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، حیرت اور غصے کی ملی جلی لکیریں نمودار ہو گئیں اور اس نے دانت پیستے ہوئے احسان کو ٹوکنا شروع کیا۔ پرنسپل نے اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور نہایت ہی مشفقانہ انداز میں احسان کو سمجھاتے ہوئے پڑھائی کی طرف دھیان دینے کی نصیحت کی اور چاکلیٹ دے کر جانے کے لئے کہا۔

''پرنسپل صاحب...... آپ اس کو چاکلیٹ کھلا رہے ہیں۔ یہ ایسے کیسے سدھرے گا۔ آپ اس کو عقل نما دکھا کر راس کر دیجئے......''۔

''انسپکٹر صاحب...... میں ایک استاد ہوں آپ کی طرح پولیس والا نہیں جو ہر وقت ڈنڈا ہاتھ میں لئے رعوب جماتا رہوں''۔

پرنسپل نے اس کی بات کاٹ کر پھبتی اڑاتے ہوئے کہا۔

راشد کا غصہ کچھ کم ہو گیا تو پرنسپل نے اس کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''راشد صاحب...... پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ایسے کئی کیسز دیکھے ہیں کہ بچہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا ہے، پڑھائی کی طرف دھیان نہیں دے پاتا اور نہ ہی کسی عمل کا مناسب ردعمل ظاہر کر سکتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جیسے بے جا لاڈ پیار یا بچے کو بالکل ہی نظر انداز کر دینے سے اس کی نفسیات پر کئی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور بچہ کئی پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم اسکول میں احسان کا پورا خیال رکھتے ہیں، آپ اس کی نفسیات جاننے کے لئے گھر میں بھی اس پر خاص توجہ دیں، اس کے جذبات

کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

پرنسپل نے اس کو تاکید کرتے ہوئے کہا اور وہاں موجود ایک خاتون ٹیچر سے مخاطب ہوا۔

''مس فرحت''۔

''یس سر''۔

''آج سے احسان کا خاص خیال رکھنا آپ کی ذمہ داری ہے''۔

''بہتر سر''۔

دوپہر کے وقفے میں فرحت اپنا ٹفن اٹھائے آئی اور احسان، جو لان میں بالکل تنہا بیٹھا تھا، کے پاس بیٹھ گئی۔

''احسان......ذرا دکھاؤ تو آج لنچ میں کیا پکایا ہے تمہاری ممی نے''۔

اس نے ایک پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

احسان نے بغیر کوئی جواب دیئے جھنجھلاہٹ میں ڈھکن اٹھا کر ٹفن اس کے سامنے رکھ دیا۔

''چلو احسان شروع ہو جاؤ......آج سے ہم روز اکٹھے لنچ کیا کرینگے''۔

احسان بے دلی سے مُنہ میں لقمے ڈال رہا تھا جب کہ فرحت غیر محسوس طریقے سے اس کے شب و روز کے بارے میں سوالات پوچھ رہی تھی۔ لیکن اس نے کسی بھی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دیا بلکہ سرد لہجے میں ہوں ہاں کر کے اس کو ٹالتا رہا۔ اس کے چہرے بشرے اور رویئے سے فرحت، جو سماجیات کی طالبہ رہ چکی تھی، کو یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ یہ بچہ کسی پیچیدہ داخلی اُلجھن کا شکار ہے۔ اس دن کے بعد اس کے ساتھ ہی لنچ کرنا، پیار اور شفقت بھری باتوں سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرنا فرحت کا معمول بن گیا۔ دھیرے دھیرے احسان کا معصوم دل پگھلنے لگا، اس کے رویئے میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی اور وہ فرحت کے ساتھ گھل مل کر خوب باتیں کرنے لگا۔

ایک دن فرحت نے احسان کو خوشگوار موڑ میں دیکھ کر اس سے چند سوالات پوچھے۔

احسان نے بھی اب کوئی پردہ نہیں رکھا اور اس کو اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتادیا۔

''میم...... پاپا دیر سے گھر آتے ہیں، ممی نہ مجھے پڑھاتی ہے اور نہ ہی کہانی سناتی ہے جب کہ میرے بھائی چھوٹو کو پڑھاتی بھی ہے اور کہانی بھی سناتی ہی۔ چھوٹو کو مجھ سے کھیلنے نہیں دیتی ہے اور مجھے روز باہر جا کر کھیلنے کے لئے کہتی ہے، جب کہ پاپا مجھے روز ڈانتے رہتے ہیں''۔

''وہ کیوں؟''

''اسی لئے کہ میں باہر جا کر کیوں کھیلتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنے دوستوں کو بلا کر گھر میں ہی کھیلو''۔

''پاپا کی بات ماننی چاہیے احسان''۔

''میم...... اگر میں دوستوں کو بلا کر گھر پر کھیلتا ہوں تو ممی مجھے ٹوکتی ہے۔ اب میں تھوڑی دیر کے لئے باہر جا کر کھیلتا تھا اور پاپا کے آنے سے پہلے ہی واپس آتا تھا...... پھر بھی پاپا کو نہ جانے کیسے پتہ چلتا تھا اور وہ مجھے گھر پہنچتے ہی ڈانٹنا شروع کر دیتے تھے''۔

''ممی اس کو نہیں روکتی؟''

''نہیں میم...... اس وقت وہ بالکل خاموش رہتی ہے''۔

''اب تم کہاں کھیلتے ہو...... گھر میں یا باہر''۔

''کئی پر بھی نہیں''۔

احسان نے حسرت بھرے لہجے میں کہا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبائی۔

احسان کی درد بھری داستان سن کر فرحت انگشت بدندان ہو کر رہ گئی۔ معصوم بچے کے ساتھ والدین کی اس بے حسی کو جان کر وہ حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی۔ بہر حال اب وہ اور زیادہ توجہ سے احسان کی دل بہلائی کا سامان کرنے لگی۔ اب وہ اس کو ہر روز چاکلیٹ بھی دیتی تھی، بے تکلف ہو کر ہنسی مذاق بھی کرتی تھی اور تھوڑی دیر کے لئے اس کے ساتھ کھیلتی بھی تھی۔ فرحت کے اس فرحت بخش رویئے سے احسان کے معصوم دل پر لگی چوٹوں کا مداوا ہونا شروع ہو گیا تو اس کی سوچ کی تتلیوں نے بھی اپنی نئی راہیں متعین کر لیں۔ وہ پڑھائی

اور دوسری سرگرمیوں میں دلچسپی لینے کے ساتھ ساتھ سکول میں اگر چہ اب ہر وقت خوش وخرم رہنے لگا لیکن انجان سی محرومی کے نشان اس کے ماتھے پر ہر وقت رقصاں دکھائی دیتے تھے۔

احسان، جو تیسری جماعت میں زیرِ تعلیم، کا گولڈن ٹیسٹ ختم ہونے کے بعد پرنسپل نے اس کا پراگرس رپورٹ دیکھ کر فرحت سے بھی جانکاری لی اور راشد کو فون کر کے بلایا۔

دوسرے دن احسان، جس کے دل پر باپ کے طمانچوں کی چوٹ اب بھی موجود تھی، بادِ صبح کے جھونکوں میں کتابوں کا بھاری بستہ لئے بوجھل قدموں سے سکول روانہ ہوا۔ لنچ کے وقت حسبِ معمول فرحت آ کر اس کے پاس بیٹھی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔

''احسان...... تمہارا موڈ خراب کیوں ہے، چلو ٹفن نکالو'۔

''نہیں میم...... آپ کھا لیجئے میں...... میں......''۔

اس سے آگے وہ کچھ نہیں بول سکا، اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

''اچھا تو آج تم پھر ٹفن نہیں لائے ہو...... چلو میرے ہی ٹفن سے کھائینگے دونوں''۔

فرحت نے پیار سے اس کا گال سہلاتے ہوئے مٹھاس بھرے لہجے میں کہا اور وہ کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے۔

''وہ دیکھو تمہارے پاپا آ گئے''۔

کھانے کے دوران فرحت نے احسان کو بتایا تو پاپا کا نام سنتے ہی کھانے کا لقمہ اس کے مُنہ میں اٹک گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو پاپا کو اپنے سامنے دیکھ کر خوف سے سہم گیا۔

''احسان...... تمہارا ٹفن کہاں ہے؟ بیگ میں رکھا ہے؟''

رسمی الفاظ ادا کرنے کے بعد احسان کے بغیر تمام بچوں کے سامنے ٹفن دیکھ کر اس نے احسان سے پوچھ لیا۔

''نہیں پاپا...... وہ......''۔

''احسان.....کیا ہوا، کہاں ہے تمہارا ٹفن''؟

''پاپا.....ممی نے آج ٹفن نہیں دیا تھا''۔

کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں درد کا بیکراں سمندر سا اتر آیا جبکہ راشد، جو غور سے اس کا چیرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، کے چہرے پر غصے اور تاسف کی ملی جلی لکیریں نمودار ہو گئیں۔

''جاؤ بیٹا..... کنٹین سے کچھ چپس وغیرہ خرید کر کھا لو''۔

''نہیں پاپا.....میں نے میم کے ساتھ پیٹ بھر کھانا کھا لیا''۔

''اس معاملے میں یہ بڑا کنجوس ہے سر.....کبھی ایک چاکلیٹ بھی نہیں خریدتا ہے''۔

''فرحت نے موقعے کا فائیدہ اٹھاتے ہوئے احسان کی چٹکی لیتے ہوئے کہا''۔

''کیوں بیٹا.....تم کنجوس کب سے ہو گئے، کبھی کچھ خریدتے کیوں نہیں ہو''۔

''پاپا.....میرے پاس پیسے.......''۔

اس نے ادائے معصومانہ سے اپنے جیب کی طرف دیکھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔ راشد کے کانوں میں جیسے پگھلتا ہوا سیسہ اتر گیا اور سر میں غصے کا بادل چھا گیا۔ اس نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر احسان کو تھما دیا اور بے چینی کی حالت میں پرنسپل کے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔

''آیئے راشد صاحب.....میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا، مجھے آپ کو یہ خبر سناتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اس بار احسان نے نہ صرف کلاس میں ٹاپ کیا ہے بلکہ اس کا رویہ بھی کافی حد تک ٹھیک ہو گیا ہے''۔

''شکریہ پرنسپل صاحب.....یہ آپ ہی کی محنت اور شفقت کا نتیجہ ہے''۔

راشد نے خوش ہو کر کہا۔

''یہ سارا کریڈٹ احسان کی ٹیچر فرحت کو جاتا ہے۔ جس نے اس کی پڑھائی کی طرف خاص توجہ دینے کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی ناآسودگی کی وجہ جاننے کے لئے بھی کافی محنت کی۔ فرحت نے ایک رپورٹ بھی مرتب کی ہے''۔

پرنسپل نے اس کی طرف ایک فائل بڑھاتے ہوئے کہا جس میں تفصیل سے احسان کی کیس ہسٹری درج تھی۔ راشد انہماک سے فائیل پڑھنے میں مصروف ہو گیا، اس دوران دفعتاً اس کے چہرے کے جغرافیہ میں ہل چل مچ گئی۔ اسے لگا جیسے اس کے مُنہ میں زبردستی زہریلی کڑوی گولیاں ٹھونسی جا رہی ہوں۔

''شکریہ پرنسپل صاحب......آپ نے میری آنکھیں کھول دیں''۔

''رپورٹ پڑھنے کے بعد اس نے گلوگیر لہجے میں کہا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں''۔

''راشد صاحب......آپ اتنے اپ سیٹ کیوں ہو گئے''؟

پرنسپل نے اس کے چہرے پر ابھرنے والی تناؤ کی گہری لکیروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''پرنسپل صاحب......دراصل احسان کی اس حالت کا ذمہ دار میں ہی ہوں کیوں کہ اس کے جنم کے دو سال بعد ہی یہ ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں سے محروم ہوا تھا اور میں نے دوسری......''۔

کہتے ہوئے آواز اس کے گلے میں اس طرح اٹک گئی جیسے مچھلی کا کانٹا پھنس گیا ہو اور وہ گہرے سوچوں ڈوبا بوجھل قدموں سے وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆

ممتاز

''ایک پریشانی سے چھٹکارا ملتا نہیں تو دوسری آ کر گھیر لیتی ہے۔اب میں کیا کروں؟ کیسے اتنے بڑے رقم کا انتظام کروں؟'' سوچوں میں غلطاں وپیچاں ممتاز اپنا ریزہ ریزہ وجود لئے کام کے لئے نکل گئی۔ چند مہینوں سے اس کا جینا دوبھر ہو گیا تھا اور وہ پائی پائی کی محتاج ہو گئی تھی، لیکن آج مالک مکان کی مکان خالی کرنے کی دھمکی اور غیر انسانی رویئے کے سبب اس کے تن بدن میں کانٹے چبھنے لگے حالانکہ اس سے پہلے مالک مکان نے کبھی بھی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ وہ انتہائی نرمی اور ہمدردی سے پیش آتا تھا۔

''سنیے، اب کیسی حالت ہے ببلو کی؟''

گلی کے نکڑ پر تانک میں بیٹھے جنید کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''جی آج قدرے ٹھیک ہیں''۔

ممتاز نے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو بندہ حاضر ہے''۔

اس نے شاطرانہ لہجے میں کہا لیکن ممتاز اس کی بات پر دھیان دئے بغیر آگے بڑھی۔جنید، جو اس کے پڑوس میں رہتا تھا، کا معمول تھا کہ وہ آتے جاتے اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تھا، ہمدردی جتا کے اس کے قریب آنا چاہتا تھا لیکن ممتاز اس کے کرتوتوں سے اچھی طرح واقف تھی اور کبھی اس کو ذرا سی بھی اہمیت نہیں دیتی تھی۔

ممتاز ایک پڑھی لکھی، خوب صورت، سلیقے منداور با اخلاق لڑکی تھی۔پڑھائی کے

دوران ہی اسے ببلو نامی ٹیکسی ڈرائیور سے پیار ہوگیا تھا۔ اگرچہ اس کے گھر والے اس کے پیار کے خلاف تھے اور اس کی شادی کسی امیر گھرانے میں کرنا چاہتے تھے لیکن اس نے ان کی ایک نہ سنی بلکہ ببلو سے شادی کرنے پر بضد رہی اور وفا کی قندیل کو روشن رکھتے ہوئے والدین کی مرضی کے خلاف ببلو سے شادی کرلی۔ ببلو بھی ایک سلجھا ہوا جفاکش انسان تھا اور اسے ٹوٹ کر چاہتا تھا، اس کی ہر خواہش پوری کرتا تھا، یوں ان کی زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔ اس دوران ان کی خوشیاں اس دن دوبالا ہوگئیں جب ان کے یہاں ایک پھول سی بچی نے بھی جنم لیا جس کے بعد ببلو بچی کی چاہت اور اس کی اچھی پرورش کے لئے زیادہ محنت کرنے لگا۔ لیکن ایک دن اچانک ان کی خوشیوں بھری زندگی پر غم کی اوس پڑ گئی۔ ببلو کی ٹیکسی کو حادثہ پیش آیا اور وہ شدید زخمی ہوگیا۔ خدا خدا کر کے اس کی جان تو بچ گئی لیکن اس کے علاج ومعالجہ پر زر کثیر خرچ ہونے لگا۔ گھر میں موجود جمع پونجی کے علاوہ ممتاز کے پاس جو زیورات وغیرہ تھے انہیں بھی بیچ دیا اور وہ رقم بھی ختم ہوگئی۔ ممتاز کے والدین نے مالی طور پر آسودہ ہونے کے باوجود پریشانی کی اس گھڑی میں ان کی کوئی مدد نہیں کی اور نہ ہی ممتاز نے اپنی خودداری کی وجہ سے ان کے یا کسی اور کے آگے کبھی ہاتھ پھیلایا۔ اس نے اپنے کچھ قریبی جان پہچان والوں سے قرض بھی لیا لیکن کب تک؟ آخر ممتاز پائی پائی کی محتاج ہوگئی، گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی اور ببلو کی دوائیاں خریدنا بھی دشوار ہوگیا۔ سخت لاچاری کی حالت میں ایک دن ممتاز اپنے پڑوس میں رہ رہے سمندر خان، جو لوگوں کو سود پر رقم دیتا تھا، کے گھر گئی اور اسے کچھ رقم مانگی۔ ممتاز، جس کے انگ انگ سے شباب کے پھول جھڑ رہے تھے، کو دیکھ کر سمندر خان کے جیسے ہوش اڑ گئے اور وہ ترچھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

"رقم تو میں تجھے ضرور دے دوں گا لیکن بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟"

"حضور...... ببلو کے ٹھیک ہوتے ہی میں سود سمیت آپ کی رقم لوٹا دونگی"۔

"نا...نا...تمہارا شوہر بیمار ہے، میں تم سے کوئی سود نہیں لونگا اور رقم بھی جب مرضی ہو لوٹانا۔ شام کو آ کے رقم لے جانا"۔

اس نے شک وشبہ سے لبریز لہجے میں کہا۔ ممتاز جو کافی سیانی تھی، اس کے ارادوں

کو بھانپ گئی اور نا امید ہو کر وہاں سے نکل گئی۔ مجبور ممتاز نے ادھر اُدھر ہاتھ پیر مارے اپنے کئی جاننے والوں سے قرض مانگا لیکن کسی نے اس کی مدد نہیں کی۔ آخر مجبور ہو کر گھر کا چولہا چکی چلانے اور ببلو کی ادویات خریدنے کے لئے لوگوں کے گھروں میں محنت مزدوری کرنا شروع کی۔ وہ صبح معصوم بچی کو اپنے بیمار شوہر کے پاس چھوڑ کر کام پر چلی جاتی تھی اور تھک ہار کر شام کو واپس آتی تھی، یوں ان کی زندگی چلتی رہی۔ ببلو بھی اگر چہ دھیرے دھیرے صحت یاب ہونے لگا تھا لیکن ڈاکٹروں کے مشورے پر کام پر جانے سے قاصر تھا۔ اس دوران ممتاز پر ایک اور آفت نازل ہوئی مالک مکان نے انہیں تین دنوں کے اندر کرایہ دینے یا گھر خالی کرنے کا الٹی میٹم دے دیا جس وجہ سے وہ سخت پریشان ہو گئی کیوں کہ چھ مہینے کا کرایہ ایک بڑی رقم تھی۔ ممتاز دن بھر اسی پریشانی میں مبتلا لوگوں کے گھروں میں کام کرتی رہی، شام کو گھر آ کر بچی کو دودھ پلایا اور گھر کے کاموں میں جٹ گئی۔

''ممتاز...... پرسوں مکان مالک کو پیسے دینے ہیں، میرے خیال میں کل تم جا کر جنید سے کچھ رقم ادھار مانگ لو''۔

مالک مکان کے رقم کو لے کر سخت پریشان ببلو ممتاز سے مخاطب ہوا۔ کیوں کہ جنید ایک بار اس کی خبر پرسی کے لئے آیا تھا اور اسے کسی بھی طرح کی مدد کی پیش کش کی تھی۔

''نہیں ببلو...... وہ ٹھیک انسان نہیں ہے، میں وہاں نہیں جاؤں گی''۔

ممتاز نے ڈوٹوک الفاظ میں وہاں جانے سے انکار کیا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی ممتاز نے دروازہ کھولا تو سامنے نہایت ہی عمدہ لباس میں ملبوس ہاتھ میں اخبار لئے جنید کھڑا تھا۔

''بھابھی...... ببلو کی طبیعت اب کیسی ہے''۔

''اب بہتر ہے، آپ اندر آجایئے''۔

وہ اندر آیا، ببلو کی خیر عافیت دریافت کرنے کے بعد کچھ دیر اسے باتیں کرتا رہا جس دوران حق میزبانی ادا کرتے ہوئے ممتاز نے ٹھنڈے مشروب سے اس کی خاطر داری کی۔

''اچھا بلو بھائی.....اب میں چلتا ہوں، کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟''

اس نے بلو سے بڑے ہی اپنائیت کے انداز میں کہا۔ بلو نے موقعہ غنیمت جان کر بارہ ہزار روپے ادھار دینے کی گزارش کی۔

''یہ بھی کوئی بات ہے .....کل بھابھی کو گھر پر بھیج دینا، میں رقم بھیج دونگا، جب ایک انسان انسان کے کام نہیں آئے گا تو پھر کون آئے گا؟''

اس نے سر تا پا ممتاز کا جائیزہ لیتے ہوئے کہا اور چلا گیا۔ دوسرے دن کام سے لوٹ کر ممتاز بادل ناخواستہ ہی جنید کے گھر پہنچ گئی تو جنید نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور نوکر کو کافی بنانے کو کہا۔

''اب کہیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں''۔

''جی وہ بلو نے آپ سے کچھ رقم ادھار مانگی تھی''۔

''رقم شوق سے لے لیجئے لیکن بدلے میں مجھے بھی کچھ ملنا چاہیے؟''

''کیا مطلب......؟''

''مطلب آملیٹ بنانے کے لئے انڈا توڑنا ضروری ہے، باقی تم خود سمجھدار ہو''۔

اس نے حریص نگاہوں سے ممتا کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ڈائیلاگ آپ بہت اچھے بولتے ہو''۔

ممتاز نے اس کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے مسکرا کر مذاق کے انداز میں کہا۔ کیوں کہ اندھیرا ہو چکا تھا اور وہ وہاں سے سلامت نکلنا چاہتی تھی۔

''تم کچھ بھی سمجھو لیکن میں تمہارا قدردان ہوں، کافی پی لیجئے''۔

جنید نے اس کی نظر کرم حاصل کرنے کے لئے چاپلوسی کا سہارا لیتے ہوئے شاطرانہ لہجے میں کہا۔

''شکریہ اس مہربانی کے لئے، اس وقت میں چلتی ہوں، کل فرصت سے ملیں گے''۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور خوفزدہ ہرنی کی طرح وہاں سے نکل گئی۔ اس کی مسکراہٹ کو رضامندی سمجھ کر جنید کے دل و دماغ میں خوشیوں کے رباب بجنے لگے۔ گھر پہنچ

کر ممتاز، جس کے آنکھوں میں درد کا بیکراں سا پنہاں تھا، نے اشک آلود آنکھوں سے ببلو کو ساری بات صاف صاف بتادی اور کچھ دیر اندر کے طلاطم کو آنکھوں کے راستے بہانے کے بعد پریشانی سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھ کر گھر کے کاموں میں جٹ گئی۔ جنید مالی طور کافی خوشحال تھا لیکن انتہائی بگڑا ہوا، حسن پرست اور برے عادتوں کا شکار تھا جس وجہ سے شادی کے کچھ ماہ بعد ہی اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ممتاز کو چونکہ اللہ نے بے پناہ حسن و جمال سے نوازا تھا، اس کے وجود پر ہر وقت سپیدہ سحر کا ہالہ چھایا رہتا تھا، رنگ میں وہ سونے کی ڈلی تھی اور بڑی بڑی مخمور آنکھوں سے جیسے نور برستا تھا۔ جس بنا پر اس نے ممتاز کی شادی کے دن سے ہی اس پر ڈورے ڈالنے شروع کئے تھے، وہ اس کو اپنے جال میں پھنسانا چاہتا تھا اور طرح طرح کے حربے استمال کر کے اس کے قریب آنا چاہتا تھا لیکن ممتاز جو اس کی بری نیت سے اچھی طرح واقف تھی، نے کبھی اس کو معمولی سی اہمیت نہیں دی تھی۔ اب وہ ممتاز کی غربت اور مجبوری کا فائیدہ اٹھا کر اپنی آرزو پوری کرنا چاہتا تھا۔ گھر کی صفائی کے دوران ممتاز نے وہ اخبار اٹھایا جو جنید کل وہاں ہی بھول گیا تھا، وہ انتہائی نفرت سے اخبار کو کوڑے دان میں پھینکنے ہی والی تھی کہ دفعتاً اس کی نظر اخبار میں چھپے اشتہار پر پڑی جسے پڑھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں، پژمردہ آنکھوں میں ایک چمک سی عود آئی۔

''ببلو...... پیسوں کا انتظام ہو گیا''۔

اس نے خوشی سے اچھل کر اشتہار ببلو کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ببلو نے دیکھا تو کسی مریض کو اونگیٹیو o-ve خون کی اشد ضرورت تھی۔

''کیسی باتیں کرتی ہو، اب تم اپنا خون بیچو گی.....؟''

''اور نہیں تو کیا، خون بیچنے میں برائی ہی کیا ہے''۔

علی الصباح ہی وہ اشتہار پر لکھے پتہ پر پہنچ گئی اور اپنا خون بیچنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ خون کے ضرورت مندوں کے جیسے نصیب کھل گئے وہ اسے جلدی سے بلڈ بینک پر لے گئے اور اس کے ٹیسٹ وغیرہ کر کے اس کی رگوں سے خون نکال کر اس کو دودھ پلایا اور رقم اس کے ہاتھ میں تھمادی۔ وہ عجلت میں وہاں سے نکلی اور آٹو رکھشے میں سوار ہو کر گھر پہنچ

گئی جہاں مالک مکان مونچھوں کو تاؤ دیئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''یہ لیجئے بھائی صاحب آپ کی رقم''۔

ممتاز نے نم آنکھوں سے رقم اس کو دیتے ہوئے کہا۔ رقم لے کر وہ حیران ہوا اور شرمندہ ہو کر وہاں سے نکل گیا۔

''کیا ہوا جانی؟''

باہر نکلتے ہی جنید، جو اس کا منتظر تھا، نے پوچھا۔

''تمہاری دال گلنے والی نہیں ہے''۔

اس نے رقم کی گڈی دکھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن وہ رقم لائی کہاں سے؟''

جنید حیرت زدہ ہو گیا۔

''میں اپنا موبائیل اندر ہی بھول گیا میں لے کر آتا ہوں''۔

''میں بھی ساتھ چلتا ہوں، اسی بہانے چھمک چھلو کے درشن تو ہو جائیں''۔

وہ دونوں اندر کی طرف گئے......

''ممتاز......تم نے میری عزت بچانے کے لئے اپنا خون بیچ دیا''۔

ببلو گلوگیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''ارے روتا کاہے کو ہے، خون کیا چیز ہے، ممتاز تو تیرے لئے جان بھی دے گی، لیکن جنید جیسے کمینے بھیڑیوں سے مجھے بچا کے رکھنا''۔

ممتاز نے روتے ہوئے کہا۔

''ارے پگلی......وہ کمینہ تو اپنے کرموں کی سزا بھگت رہا ہے، اس کی بدچلنی کی وجہ سے ہی اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے''۔

دروازے پر پہنچ کر ممتاز اور ببلو کی باتیں سن کر جنید کے پورے جسم میں درد کی ایک تیز ٹیس اٹھ گئی اور وہ ایک دم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

''ببلو ...... بدچلن میں نہیں وہ تھی جو اپنی عیاشیوں میں میرا پیسہ پانی کی طرح

بہاتی تھی، جب میں نے پیسہ دینے سے منع کیا تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور میں سمجھنے لگا کہ ہر عورت ایسی ہی ہوتی ہے، لیکن آپ کا اور بھابھی کا پیار دیکھ کر آج میری آنکھیں کھل گئیں۔ اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا"۔

نم آنکھوں سے کہہ کر وہ شرمندگی کی حالت میں وہاں سے نکلا۔ جب کہ جانی کچھ دیر ان سے باتیں کرتا رہا۔

☆☆☆

کالی ناگن

''خدا کے لئے مجھے میرا بچہ لا کے دے دو......''۔

نوری اپنے شوہر کا گریبان پکڑ کر روتے ہوئے پاگلوں کی طرح زور زور سے چلا رہی تھی، جو بے بسی کے عالم میں نم آنکھوں سے اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نوری کے چلانے کی آوازیں سن کر اسپتال کے وارڈ میں لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا جب کہ پورے اسپتال میں نوزائیدہ بچہ چوری ہونے کی خبر کے ساتھ ہی سنسنی پھیل گئی اور لوگ چمہ گوئیاں کرنے لگے۔ دو دن قبل ہی نوری نے تین بیٹیوں کے بعد ایک پھول سے بیٹے کو جنم دیا تھا، اس کے جیسے بخت جاگ اٹھے تھے اور وہ دونوں میاں بیوی اور ان کے قریبی رشتہ دار خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے لیکن یاس و حسرت جیسے پھن پھیلائے ہوئے تھے اور آج یہ دلخراش واقع پیش آیا اور ان کے سارے سپنے خاک آلودہ ہو گئے۔ یہ کوئی پہلا واقع نہیں تھا اسے پہلے بھی شہر کے مختلف زچگی کے اسپتالوں سے کئی نوزائیدہ بچے چوری ہو چکے تھے لیکن کوششوں کے باوجود پولیس اس گتھی کو سلجھانے میں ناکام نظر آ رہی تھی۔

''ہمت رکھو نوری بہن.....اللہ سب ٹھیک کر دے گا، ویسے یہ سب ہوا کیسے.....؟''

دفعتاً مس لولی، روزی اور ان کی دیگر کچھ رشتہ دار خواتین وارڈ میں داخل ہو کر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے نوری، جس کا دل غم کے بوجھ تلے پسا جا رہا تھا، کو دلاسہ دینے لگیں جب کہ نوری کا شوہر واقع کے بارے میں انہیں تفصیل سے بتانے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی پولیس بھی آئی اور نوری اور اس کے شوہر کا بیان قلمبند کرنے لگی، نوری کا کہنا تھا کہ.....

''صبح میرا شوہر دوائیاں خرید نے باہر گیا تھا، میں اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی اس دوران درنرسیں آئیں اور میرا اور بچے کا چک اپ کرنے لگیں، میرا بی۔پی۔ چک کرنے کے بعد انہوں نے مجھے ایک گولی کھلائی اور یہ کہہ کر بچے کو اپنے ساتھ لے گئیں کہ اسے بڑے ڈاکٹر صاحب کو دکھانا ہے۔ گولی کھانے کے ساتھ ہی مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ کچھ وقت بعد میرا شوہر واپس آیا اور بچے کے بارے میں پوچھا میں نے غنودگی کی ہی حالت میں اسے بتایا کہ نرسیں اسے بڑے ڈاکٹر صاحب کے پاس چک اپ کرنے کے لئے لے گئیں ہیں.......''۔

''کب، کس ڈاکٹر کے پاس.....؟''

اس نے پوچھا۔

''ابھی، تھوڑی دیر پہلے''۔

میں نے کہا۔

نوری کے شوہر کا کہنا تھا کہ جب دس منٹ سے زیادہ وقت تک بھی نرسیں بچے کو لے کر واپس نہیں آئیں تو میں سخت پریشان ہو گیا تب تک نوری بھی ہوش میں آ گئی۔

''تم جا کر ڈاکٹر کے کمرے میں دیکھو کہ انہوں نے بچے کو واپس کیوں نہیں لایا.....؟''

''نوری نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور میں عجلت میں ڈاکٹر کے کمرے میں گیا۔ وہاں پتہ چلا کہ ڈاکٹر ابھی آیا ہی نہیں ہے جب کہ ڈیوٹی پر موجود نرس نے واقعے سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ میں نے پورے اسپتال کی نرسوں اور دیگر عملے سے بچے کے بارے میں دریافت کیا لیکن کئی سے بھی کوئی سراغ نہیں ملا اور نوری اور میں پر کٹے پنچھیوں کی طرح پھڑ پھڑانے لگے۔ کچھ دیر بعد ہی میں نے اپنے کچھ رشتہ داروں کو خبر کی جنہوں نے آپ کو مطلع کیا......''۔

کہتے ہوئے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں جب کہ نوری بھی زار و قطار روتے ہوئے لجاجت سے ہاتھ باندھ کر انسپکٹر کی منتیں کرنے لگی۔ پولیس نے ان سے وہاں موجود ان کے رشتہ داروں اور پچھلے دنوں ان سے ملنے آنے والوں کی تفصیلات بھی نوٹ کر دیں، جب کہ

وارڈ میں موجود دوسری زچہ عورتوں اوران کے تیمار داروں سے بھی سرسری پوچھ تاچھ کی۔

''آپ اوپر والے پر بھروسہ رکھیں، ہم آپ کے بچے کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کریں گے لیکن آپ کو بھی ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا''۔

رپورٹ مکمل کرنے کے بعد انسپکٹر نے انہیں کہا اور وہاں سے نکل گیا، نوری کا شوہر بھی اپنا ریزہ ریزہ وجود لئے اس کے پیچھے پیچھے نکلا، انسپکٹر نے باہر اکیلے میں اسے کچھ سوالات کئے اور اپنی نفری کو ہدایات دے کر گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ پولیس نے ہر زاویے سے واقعے کی باریک بینی سے تحقیقات شروع کی۔ شام کو تحقیقاتی ٹیم نے انسپکٹر کے سامنے چونکا دینے والے انکشافات کئے، جس کے بعد انسپکٹر نے نوری کے شوہر کو بلایا اور اسے کچھ ملنے والوں کے فون نمبر لئے۔ پولیس نے نوری کی تیمار داری کے لئے آنے والے کچھ لوگوں جن میں خواتین بھی شامل تھیں کی خفیہ نگرانی شروع کر دی اور ان کے فون کالز کا جائزہ لیا ،شک کی سوئی ایک خاتون پر ہی جا کر رکی، جس پر پولیس نے کڑی نظر رکھنی شروع کر دی۔

''آپ مطمعن رہیں، ہم چور کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں اور عنقریب ہی ہم اسے گرفتار کریں گے''۔

دوسرے دن دوپہر کو پولیس پھر اسپتال پہنچ گئی انسپکٹر نے سپاٹ لہجے میں نوری اور اس کے شوہر کو خوشخبری سناتے ہوئے کہا۔

''سچ کہتے ہو تھانیدار صاحب ...... میرا بچہ مجھے ڈھونڈ کے دے دو اللہ آپ کو بہت ترقی دے گا......''۔

انسپکٹر کو دعائیں ہوئے نوری کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ شبنم کے موتی گر کر اس کے پلو میں جذب ہونے لگے۔

''بائی دی وے، یہ خواتین کون ہیں؟''

انسپکٹر نے وہاں موجود خواتین، جو نوری کی خبر گیری کے لئے آئی تھیں، کے چہروں کے جغرافیہ کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''تھانیدار صاحب...... یہ میری بہن مغلی، یہ بہن سے بڑھ کر میری سہیلی لولی اور

یہ میری نند روزی......"۔

نوری، جس کی آنکھوں میں درد کا بحر بیکراں سا پنہاں تھا، نے ان سب کے بارے میں انسپکٹر کو جانکاری دی، جس کے بعد پولیس وہاں سے چلی گئی جب کہ کچھ دیر میں وہ خواتین بھی نوری سے رخصت لے کر اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں اور نوری، جسے بچہ واپس ملنے کی مدھم سی امید کی کرن جھلملاتی ہوئی نظر آئی من ہی من میں اوپر والے سے اپنے بچے کی سلامتی کی دعا کرنے لگی۔

شام کو انسپکٹر کے فون کی گھنٹی بجی تو دوسری طرف اس کے یک ماتحت کی آواز تھی۔

"سر......وہ بچے کو لے کر نکل گئے اور ایک گاڑی میں پرانے شہر کی طرف سفر کر رہے ہیں"۔

"ان پر خفیہ طریقے سے نظر رکھو، ساتھ میں اس عورت کے گھر کی نگرانی بھی رکھنا ،میں بھی وہیں آتا ہوں"۔

"اوکے سر......"۔

کچھ دیر بعد وہ گاڑی ایک ویران علاقے میں پہنچی اور اس میں سوار دو خواتین اور ایک مرد ایک نوزائیدہ بچے کو لے کر ایک پرانے مکان میں داخل ہو گئے اور سول کپڑوں میں پولیس اہلکار اس مکان کی نگرانی پر لگ گئے اور انسپکٹر کے وہاں پہنچتے ہی مکان پر چھاپہ ڈال کر ان تینوں کو بچہ سمیت گرفتار کر لیا، جنہوں نے پوچھ تاچھ کے دوران انکشاف کیا کہ وہ ایک گینگ کے لئے کام کر رہے ہیں اور رانی نامی خاتون اس گینگ کی سرغنہ ہے، جس کے کہنے پر ہی ہم نے اسی کے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق اس بچے کو اسپتال سے چرایا۔ان ہی کی نشاندہی پر پولیس نے رانی کے گھر، جس کی پولیس پہلے ہی نگرانی کر رہی تھی، پر چھاپہ ڈال کر رانی کو گرفتار کر لیا، ساتھ ہی بچے کے والد کو تھانے بلایا گیا تاکہ قانونی لوازمات پورے کرنے کے بعد بچہ اس کے سپرد کر دیا جائے۔ پوچھ تاچھ کے دوران رانی نے کئی بچوں کو چرا کر بیچنے کا جرم قبول کر لیا۔

"یہ لیجئے آپ کا بچہ......"۔

ایک خاتون اہلکار نے بچے کو اس کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔نوری کے شوہر نے جب اپنے بچے کو سلامت پایا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔اسنے بے اختیار بچے کو چوما اور نم آنکھوں سے انسپکٹر کا شکریہ کرتے ہوئے پولیس کو بے شمار دعائیں دینے کے بعد اجازت چاہی۔

''یہ نہیں جاننا چاہو گے کہ بچے کو کس نے چرایا تھا......؟''

انسپکٹر نے معنی خیز انداز میں اسے پوچھا۔

''ہاں صاحب میں اسے دیکھنا بھی چاہوں گا''۔

''حوالدار.....''۔

''جی صاحب.....اسے اس آستین کی ناگن چورنی کے درشن کراؤ''۔

انسپکٹر نے حوالدار کو حکم صادر فرمایا۔

''لولی صاحبہ...آپ یہاں......؟''

لولی، جسے وہ بڑی احترام کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کیوں کی اس نے ان کی کچھ مالی مدد کی تھی، کو حوالات میں دیکھ کر وہ حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا جب کہ لولی نے اسے دیکھ کر آنکھیں جھکائی۔

''صاحب.....یہ لولی صاحبہ.....''۔

''ہاں یہی لولی عرف رانی، کالے دل کی کالی ناگن، جو ایک کرائے کے مکان میں رہتی ہے اور خود کو ایک سوشل ورکر جتلاتی ہے، زچگی کے اسپتالوں میں جا کر مختلف بہانوں سے بھولی بھالی حاملہ خواتین سے دوستی اور ہمدردی کر کے، اپنی چرب زبانی کی چکناہٹ سے ان کے دل جیت لیتی ہے اور آخر پر اسی ہمدردی کے پردے میں اپنی گینگ کے ذریعے ان کے نوزائیدہ بچے چرا کر ان کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیتی ہے۔

انسپکٹر نے لولی پر ایک نفرت آمیز نظر ڈالتے ہوئے کڑک لہجے میں کہا''۔

انسپکٹر کے الفاظ نوری کے شوہر کے کانوں میں پگھلتے ہوئے سیسے بن کر اتر گئے۔

☆☆☆

چاند اور بادل

''اے......تم نے یہ پھول کیوں توڑا؟''

مسکان نے احتشام کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ احتشام نے مسکان کی ڈانٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دلیر ہو کر دوسرا پھول توڑا جس پر مسکان کو سخت غصہ آیا اور اس نے اپنے نازک ہاتھ سے احتشام کے گال پر تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ کھا کر احتشام نے آگ بگولہ ہو کر ایک ہاتھ سے مسکان کے بالوں کو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے بے تحاشا مارنا شروع کیا۔ مسکان اپنے آپ کو اس کے چنگل سے آزاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے زور زور سے رونے لگی۔ اسی کشمکش میں مسکان کی آنکھ کھلی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، اس کی سانسیں تیز تیز چل رہیں تھیں، اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور سرہانے رکھے پانی کے گلاس سے چند گھونٹ حلق سے اتارے جس دوران اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان نمودار ہوئی اور پورے وجود میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

''اوفو میرے خدا......پھر وہی خواب......''۔

ایک لمحے بعد ہی اس کے مُنہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے اور اس پر بے قراری طاری ہونے لگی۔ کمرے کی چاردیواری سانپ کی طرح بل کھا کھا کر اُسے اپنی لپیٹ میں جکڑنے لگی۔ اس نے بے چینی کی حالت میں کھڑکی کا پٹ کھولا اور بادلوں کی چادر اوڑھے آسمان کی طرف تکتے ہوئے گہرے سوچوں میں ڈوب گئی۔ کچھ مہینوں سے مسکان نے کئی بار یہی خواب دیکھا تھا، جو دراصل محض ایک خواب نہیں بلکہ اس کی زندگی کا ایک سچا واقعہ تھا۔

مسکان اور احتشام تب یہی کوئی چھ سات سال کے بچے تھے جب احتشام، جوان کے رشتے میں تھا، اپنے والدین کے ساتھ اس کی پھوپھی کی شادی میں دعوت پر آیا تھا۔ ان کے آنگن میں کھیلتے ہوئے احتشام نے ایک پھول توڑا تھا اور ہو بہو یہی واقعہ پیش آیا تھا۔

''تم تو ایسے بے مروت نہیں تھے ......اچانک اتنے کیسے بدل گئے......؟''

مسکان بادلوں کی اوٹ میں چھپے چاند کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں احتشام سے گلے شکوے کرتے ہوئے پریشان اور منتشر ذہن کی کتاب رفتہ رفتہ الٹنے لگی......مسکان اندر سے انتہائی درد و کرب میں مبتلا تھی کیوں کہ چند مہینے قبل اس کی زندگی میں ایک ایسا بھیانک موڑ آیا تھا کہ اس کے سارے سپنے ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکے تھے۔ یوں تو اس کی پوری زندگی ہی بے رنگ سی گزری تھی، لیکن اب اس کی زندگی میں ایک ایسا طوفان آیا ہوا تھا کہ زندگی ہی بے معنیٰ ہو کر رہ گئی تھی، لیکن وہ صبر کی مورت بن کر سب کچھ خاموشی سے سہتی رہی۔ وہ ایک باسلیقہ، بااخلاق اور ذہین لڑکی تھی، لیکن ہوش سنبھالتے ہی عجیب سی اُلجھن میں گرفتار ہو گئی تھی۔ کیا سکول، کیا گھر، کیا رشتہ دار ہر جگہ اس کو عجیب صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لوگوں کے عجیب روئے برداشت کرنے پڑتے تھے، لیکن اوپر والے نے اسے صبر و شکر کی نعمت سے نوازا تھا سو وہ اپنوں کی بے اعتنائی، بے گانوں کی تعنہ زنی، معاشرے کی کج ادائی غرض سب کچھ برداشت کرتے ہوئے زندگی کا سفر کامیابی کے ساتھ طئے کرتی رہی، یہاں تک کی تعلیم کی منزلیں طئے کرتے ہوئے وہ یونیورسٹی تک پہنچ گئی۔ یونیورسٹی کے پر جوش ماحول میں بھی وہ ایک خزاں رسیدہ پھول کی طرح بالکل الگ اور جدا اپنی تعلیم میں مگن رہی۔ نہ اس میں کوئی دلچسپی لیتا تھا اور نہ ہی وہ کسی کے قریب تھی، وہاں اس کے پڑوس میں رہنے والی اس کی ہم جماعت مہک نامی لڑکی اس کی واحد سہیلی تھی، وہ بھی اس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ یونیورسٹی کے دوسرے سال اس کی زندگی میں ایک خوش گوار موڑ تب آیا جب احتشام نے بھی وہاں داخلہ لیا اور اس میں دلچسپی لیتے ہوئے اس کے قریب آنے کی کوشش کرنے لگا۔ حالانکہ اس کو احتشام یا کسی اور لڑکے سے ایسے روئیے کی بالکل امید نہیں تھی اور نہ ہی اس کی بے رنگ زندگی میں کوئی رنگین خواب

شامل تھا۔ احتشام اس سے خوب باتیں کرتا تھا اور اس کو چھیڑنے کے لئے بار بار بچپن میں پیش آئے پھول توڑنے والے یادگار واقعہ کا ذکر بڑے ہی دلچسپ انداز میں کرتا تھا، کیوں کہ اس کے ذہن پر نہ صرف یہ واقع نقش ہو چکا تھا بلکہ مسکان کے لئے دل میں نرم گوشہ اور پیار کے جذبات بھی جنم لے چکے تھے، اس لئے جب بھی کسی خاندانی تقریب یا کئی اور جہاں وہ دونوں موجود ہوتے تھے احتشام بھنورے کی طرح اس کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا لیکن مسکان، جو اندر سے تکلیف دہ احساس کمتری میں مبتلا تھی، اس کے جذبات کو کبھی سمجھ نہ سکی۔ وقت گزرتا رہا احتشام نے پہلے پہل اسے اشاروں کنایوں اور مختلف ترکیبوں سے اپنے حال دل سے باخبر کرنا چاہا لیکن مسکان جان بوجھ کر انجان بنی رہی۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جو مسکان کی زندگی کا حسین ترین دن بن گیا۔ وہ دونوں یونیورسٹی کے خوب صورت لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ احتشام اچانک گویا ہوا۔

''مسکان......میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، ناراض تو نہیں ہو جاؤ گی؟''

''فرمایئے، میں بھلا ناراض کیوں ہو جاؤں''۔

اس نے اپنے اندر کی کیفیت چھپاتے ہوئے سمارٹ لہجے میں کہا۔

''مسکان......میں تم سے......میں تم سے پیار کرتا ہوں''۔

احتشام کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مسکان، جس نے اپنے لئے لفظ پیار زندگی میں پہلی بار سنا تھا، کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، دل دھک دھک کرنے لگا اور پورے وجود میں خوشی کی ایک لہر سرائیت کر گئی۔ اُسے لگا کہ جیسے سارا ماحول سرخ گلاب کی کلیوں اور ستارہ سحری کی کرنوں کا ایک ڈھیر ہے اور ہر طرف سے کہکشاں کا نور برس رہا ہے۔

''پیار اور مجھ سے؟ احتشام، آپ کی زبان سے ایسا مذاق اچھا نہیں لگتا ہے''۔

''مسکان......میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، میں تم کو دل سے چاہتا ہوں''۔

احتشام نے اس کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن اس کی آنکھوں کی گہری وادی میں رضامندی کے ان گنت جگنو چمکنے لگے۔ یہ لمحے اس نے

اپنے ذہن کے تہہ خانے ایسے میں محفوظ کر لئے تھے جیسے اس کی زندگی کے سب سے انمول لمحات ہوں۔ احتشام پہلا لڑکا تھا جس نے مسکان کے دل میں رنگین خواب جگائے ورنہ آج تک اس میں کبھی بھی کسی لڑکے نے معمولی دلچسپی بھی نہیں لی تھی، جس کا اس کو بے حد ملال تھا، لیکن اپنی صورت دیکھ کر وہ اندر ہی اندر اپنے تقدیر کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہرا رہی تھی۔ کیوں کہ اوپر والے نے اگرچہ اس کو تمام گن سلیقوں اور قابلیت سے نوازا تھا لیکن حسن اور خوبصورتی سے یکسر محروم رکھا تھا۔ معمولی ناک و نقش...... سانولی رنگت...... چھوٹا قد اور دائیں گال پر ایک بڑے سفید داغ کے سبب اس کی طرف آج تک کوئی بھی لڑکا مائل نہیں ہوا تھا، جب کہ بچپن سے ہی اس کو اپنی اس صورت کی وجہ سے مختلف اُلجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لوگوں کے طعنے سہنے پڑتے تھے یہاں تک کہ مشکل سے کوئی لڑکی بھی اسے دوستی کرتی تھی۔ ایسے حالات میں احتشام اس کی زندگی میں نئی بہار بن کے آگیا، اس کے دل و دماغ میں خوشیوں کے رباب بجنے لگے اور وہ پیار کے اڑن کھٹولے پر سوار ہو کر آسمانوں میں اڑتے ہوئے رنگین سپنے بننے لگی۔ اُسے احتشام کی محبت پر بے حد ناز تھا اور وہ مہک کو اپنا ہمراض سمجھ کر نہایت ہی فخر سے اُسے اپنے محبت کے راز شیر کرتی تھی۔ مہک اندر ہی اندر احتشام، جس کی شخصیت کو قدرت نے مردانہ وجاہت و جمال سے نہایت ہی فیاضی سے نوازا تھا، کے اس قدر مسکان پر فدا ہونے پر سخت حیران تھی، ایک دن اس نے احتشام سے پوچھ بھی لیا۔

احتشام...... مسکان میں ایسی کیا خاص بات ہے جو آپ اس پر مر مٹنے کو تیار ہو۔

مہک...... مجھے پوری یونیورسٹی میں مسکان جیسی دوسری لڑکی نظر نہیں آرہی ہے کیوں کہ میں اس کی صورت کا نہیں بلکہ سیرت کا دیوانہ ہوں۔

اس نے دو ٹوک الفاظ میں کہا تھا۔ بہر حال تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے والدین کی صلح پر مسکان گھر میں ہی بیٹھی لیکن اس دوران بھی وہ اور احتشام برابر ملتے رہے۔ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد احتشام کو کسی کمپنی میں نوکری مل گئی اور وہ بیرون ملک چلا گیا۔ ایک سال تک وہ فون کے ذریعے احتشام کے ساتھ برابر رابطے میں رہی پھر اچانک یہ رابطہ منقطع ہو گیا۔ احتشام نے فون کرنا ہی چھوڑ دیا، اس کی لاکھ کوششوں کے باوجود

احتشام کے نمبر پر رابطہ نہیں ہو سکا، لیکن اس نے امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس دوران ایک دن اس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی جب مہک نے اچانک یہ خبر اس تک پہنچائی کہ احتشام نے بیرون ملک ہی شادی کر کے گھر بسایا ہے اور ہمدرد سہیلی ہونے کے ناطے یہ نصیحت بھی دی کہ احتشام کو بھول کر اب اس کے خواب دیکھنا بالکل چھوڑے۔ یہ زخم کھانے کے بعد اس کا پورا وجود ہی درد کی شدت میں ڈوب گیا کئی دنوں تک وہ بہت روئی، تڑپی، سسکی لیکن آخر سنبھل گئی........ ایک دن اچانک ایک انجان نمبر سے اس کو فون آ گیا۔

''مسکان......میں احتشام بول رہا ہوں، تم.......''

اس نے فون رسیو کیا تو دوسری طرف لائین پر احتشام موجود تھا، لیکن اس نے احتشام سے بات کئے بغیر ہی فون کاٹ دیا۔ احتشام نے دوبارہ فون کیا لیکن اس نے رسیو نہیں کیا......کئی دنوں تک وہ لگاتار اس کے نمبر پر فون کرتا رہا لیکن مہک کی نصیحت کے پیش نظر اس نے ایک بھی بار اس کا فون رسیو نہیں کیا، لیکن وہ نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کر کے رکھا۔ آخر تھک ہار کر اس نے بھی فون کرنا بند کر دیا اور مسکان بھی اس کی بے وفائی پر سخت دل شکستہ ہو کر اس کو بھولنے کی کوشش کرنے لگی اور وہ کسی حد تک اس کو بھول بھی چکی تھی لیکن آج اچانک خواب دیکھ کر اس کے دل میں احتشام کی ایک ایک یاد تازہ ہو گئی، دل کے نہاں خانوں میں موجود احتشام کے پیار کے خوابدیدہ جراثیم نئے سرے سے جوش مارنے لگے، اس کا چین وقرار ہی لٹ گیا اور دماغ تیز رفتار موٹر کی پہیے کی طرح گھومنے لگا۔ یہ رات کا آخری پہر تھا، چاند کی کرنیں بادلوں کی اوٹ سے چھن چھن کر لحظہ بہ لحظہ رات کی تاریکی میں اپنا نور پھیلا رہیں تھیں، نہ جانے کیا سوچ کر اس نے بے چینی کے عالم میں سرہانے رکھا موبائل فون ہاتھ میں اٹھایا اور احتشام کا نمبر نکالا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کچھ لمحوں تک نمبر کو دیکھنے کے بعد دفعتاً اس نے نمبر ڈائیل کیا۔

''ہیلو مسکان......تم ٹھیک ہو نا......ہیلو......ہیلو......مسکان کچھ تو بولو......''

احتشام فون پر چلاتا رہا لیکن مسکان کچھ نہ بولی۔

''تم تو ایسے نہ تھے......بے وفا''۔

کچھ منٹوں بعد وہ پگھلی اور لب کھولے۔

''میں نے ایسا کیا کیا جو بے وفا ہو گیا''

''کچھ نہیں.....شادی ہی تو رچائی ہے''۔

''شادی...... کیسی باتیں کرتی ہو تم؟؟؟''

احتشام نے حیرت زدہ لہجے میں کہا، انہوں نے ڈھیر ساری باتیں کی، گلے شکوے ہوئے اور احتشام بڑی مشکل سے اُسے یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس نے کوئی شادی نہیں کی ہے اور نہ ہی وہ بے وفا ہے۔

''احتشام......گھر کب آرہے ہو؟''

مسکان نے قدرے مطمعن ہونے کے بعد پوچھا۔اس بار اس کی آواز میں ہجر کا غم چھلک رہا تھا۔

''مسکان......میں تم کو سرپرائیز دینا چاہتا تھا......اینی وے میں اگلے ہفتے آرہا ہوں۔

مسکان کے استفار پر کئی مہینوں تک فون پر رابطہ نہ کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے کہا۔

''مسکان......میرا فون گم ہو گیا تھا جس کے ساتھ ہی اس میں محفوظ تمہارے نمبر سے بھی محروم ہو گیا۔خوش قسمتی سے تمہاری سہیلی مہک نے کہیں سے میرا نیا نمبر حاصل کیا تھا اسی سے تمہارا نمبر لے کر تم سے بات کرنے کے لئے سینکڑوں بار تمہارے نمبر پر فون ملایا ،لیکن تم نے جیسے بات نہ کرنے کی قسم اٹھائی تھی۔

''مہک ......؟؟؟''

وہ زیر لب بڑبڑائی اس کے ماتھے پر کئی شکنیں نمودار ہوئیں اور کچھ پل کے لئے وہ سخت حیرت میں ڈوب گئی ،لیکن جلد ہی اس کے نفسیاتی زیر و بم میں عجیب سا سرور چھا گیا اور اس نے خوشی میں جھومتے ہوئے احتشام کو الوداع کہہ کر فون بند کیا اور مسکراتے ہوئے چاند کی طرف دیکھنے لگی جواب پورے آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔

☆☆☆

حئ علی الفلاح

میجر نیاز علی باتھ روم سے نہا کر تازہ دم ہو کر نکلا تو کمرے میں پھیلی خوشبو سے اس کے مُنہ میں پانی بھر گیا، کیوں کہ ٹیبل پر بھنے تلے گوشت سے بھری پلیٹیں اور اس کی من پسند ولایتی شراب کی بوتل اس کے منتظر تھے۔ وہ من ہی من میں طئے کر چکا تھا دو تین پیک ہلک سے اتار کر کچھ دیر آرام کر لے گا، کیوں کہ رات بھر ریل گاڑی میں محو سفر رہنے کے سبب اسے شدید تھکاوت محسوس ہو رہی تھی......ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ جونہی ناؤ نوش کی غرض سے صوفے پر بیٹھ کر بوتل کا ڈھکن کھولنے لگا تو نزدیکی مسجد شریف سے بھی موذن نے اللہ اکبر کی منادی کر دی، جسے سنتے ہی وہ رک گیا، اس کے ذہن نے نہ جانے کون سی کروٹ لی کہ چہرے پر اچانک فکر پریشانی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ حالاں کہ نماز روزہ تو دور کی بات رنگین مزاج میجر کو مسجد کا دروازہ تک معلوم نہیں تھا۔ اس کے مسلمان ہونے کے لئے صرف اتنا کافی تھا کہ اس نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا تھا اور کلمہ طیبہ یاد تھا۔ دین کے باقی تمام احکامات کو اس نے سرے سے ہی فراموش کر دیا تھا۔ اذان مکمل ہو گئی لیکن اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار اور گہرے ہو گئے۔ اس سے رہ رہ کر بزرگ قلی اور تھوڑی دیر پہلے اس کی کہی ہوئی وہ باتیں یاد آنے لگیں جن کی طرف اس نے کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا......دھیرے دھیرے اس کی بے چینی بڑھنے لگی۔ بھوک اور شراب کی شدید طلب ہونے کے باوجود وہ بغیر کچھ کھائے پیئے سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لیتے ہوئے گہرے سوچوں میں کھو گیا۔

نیاز علی آج ہی لمبا سفر کر کے گھر پہنچا تھا۔ جب وہ ریل گاڑی سے اترا تو دوپہر کا وقت تھا اور گرمی کا پارہ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ سورج جیسے آگ برسا رہا تھا، تیز دھوپ کی تپش سے بے حال لوگ بن جل کی مچھلیوں کی طرح تڑپ رہے تھے جبکہ ریلوے اسٹیشن پر خلاف معمول آج کوئی خاص گہما گہمی نہیں تھی۔ وہ خود بھی گرمی سے نڈھال ہو چکا تھا۔ اس نے سامان ایک طرف رکھا اور پیاسے اونٹ کی طرح پاس ہی موجود ایک دکان کی طرف لپکا اور ٹھنڈے مشروب کی بوتل خرید کر گھٹا گھٹ حلق سے نیچے اتار لی۔ سیر ہو کر اس کی نظریں کسی قلی کو ڈھونڈنے لگیں کیوں کہ آس پاس کوئی رکشا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسی لمحے ایک بزرگ شخص اس کے نزدیک آ کر بولا۔

''صاحب جی......سامان اٹھانا ہے کیا؟''

اس نے سر تا پاؤں بزرگ کا جائزہ لیا۔ جسم نحیف ہڈیوں کا ڈھانچہ جیسا......سفید داڑھی والا نورانی چہرہ......معمولی سا لباس......سر پر ٹوپی اور کندھوں پر لٹکی سفید چادر۔

''اگر یہ بزرگ شخص کسی یورپی ملک میں ہوتا تو اولڈ ایج پنشن حاصل کر کے نہ صرف آرام سے زندگی گزار رہا ہوتا بلکہ دنیا کے بزرگ شخص کے بطور اس کا نام گینز بک آف ورلڈ میں بھی درج ہوتا، لیکن ہمارے ملک میں......''۔

میجر من ہی من میں سوچتے ہوئے گویا ہوا۔

''بابا......مجھے رانی گڑھ جانا ہے''۔

''صاحب جی......یہاں کوئی رکشا بھی نہیں ہے، اگر آپ کہیں تو میں سامان پہنچا دوں گا......رانی گڑھ پاس میں ہی تو ہے''۔

رانی گڑھ اسٹیشن سے کوئی آدھا میل دور تھا......ادھر اُدھر نظریں دوڑانے کے بعد میجر نے حامی بھر لی اور بزرگ قلی بھاری بھر کم اٹیچی کندھے پر اٹھاتے ہوئے بھاری قدم اٹھاتے ہوئے میجر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جھلسا دینے والی دھوپ میں بوجھ اٹھائے چلتے چلتے قلی کا حال بے حال تھا۔ اس کے ماتھے سے پسینے کے قطرے ٹپ ٹپ گر کر زمین میں جذب ہو رہے تھے۔ اس کی حالت پر ترس کھا کر میجر گویا ہوا۔

''بابا......کچھ دیر رک کر دم لینگے''۔

''قلعی اٹیچی نیچے رکھ کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔اس کی سانسیں پھول رہی تھی اور وہ اوپر سے نیچے تک پسینے میں شرابور تھا''۔

''یہ لو بابا......تھوڑا پانی پی لو''۔

میجر نے بیٹھتے ہی پانی کے چند گھونٹ پی کر بوتل اس کی اور بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں صاحب جی نہیں''۔

اس نے آسمان کی اور دیکھتے ہوئے نادم سے لہجے میں کہا۔حالانکہ پیاس کی شدت سے اس کی زبان خشک ہو رہی تھی۔میجر نے یہ سمجھ کر زور نہیں دیا کہ شاید یہ آتے جاتے لوگوں سے شرما رہا ہو۔

''بابا......گرمی کی شدت نے لوگوں کا کچومر نکال کے رکھ دیا ہے،اور بارش بالکل نہیں ہوتی ہے......آسمان والا شاید ہم سے روٹھا ہے''۔

''نہیں صاحب جی......یہ قانونِ قدرت ہے۔جب زمین پر بسنے والے لوگ زکوات دینا بند کر دیتے ہیں،زمین کا سینہ گناہوں کے بوجھ سے بھر جاتا ہے تو آسمان والا بارشوں کو روک دیتا ہے''۔

''سو تو ہے بابا......پھر کیا بنے گا ہم گناہ گاروں کا؟ ہم تو تڑپ تڑپ کر مر جائینگے''۔

''نہیں صاحب جی......اللہ پاک کی رحمتیں بھی بے شمار ہیں......بندوں کو اس کی رحمتوں سے ہرگز ناامید نہیں ہونا چاہیے اور اس خاص بابرکت مہینے میں اللہ کی رحمتیں اس کے غصے اور غضب پر حاوی ہو جاتی ہیں''۔

قلی کی یہ باتیں سن کر میجر کو اندر ہی اندر خفت محسوس ہونے لگی۔کچھ دیر دم لینے کے بعد وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔راستے میں رمضان المبارک اور دیگر مذہبی امورات پر ان کی بات جاری رہی اور میجر بڑی دلچسپی سے قلی کی باتیں سنتا رہا......قریب ظہر کے وقت جب وہ میجر کے گھر پہنچے تو گرمی سے دونوں کا برا حال تھا۔میجر بھی پسینے میں

شرابور ہو چکا تھا، اس نے اپنے گھریلو ملازم کو آواز دے کر سامان اٹھانے کے لئے کہا اور قلی کو اپنے ساتھ اندر لے جا کر عالی شان ائیر کنڈیشنز والے ڈرائینگ روم میں بٹھایا اور خود بھی صوفے پر دراز ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ملازم نے ٹھنڈے مشروبات سے بھرے گلاس اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''صاحب جی...... میم صاحب اور بچے باہر گئے ہیں...... آپ کیا کھائینگے؟''

''ٹھیک ہے راجیو...... بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے...... تم تھوڑا سا گوشت فرائے کر کے لے آؤ...... تب تک میں نہاتا ہوں''۔

اس نے قلی کی اور مشروب سے بھرا گلاس بڑھاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''یہ لو بابا آرام سے پی لو...... یہاں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے''۔

''نہیں صاحب جی...... وہ دیکھ رہا ہے''۔

''بابا...... کون دیکھ رہا ہے؟''

میجر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''صاحب جی...... آسمان والا سب دیکھ رہا ہے...... اس سے کچھ بھی نہیں چھپا ہے''۔

اسی وقت کئی دور سے فضا میں اذان کی آواز گونجی۔

''اچھا صاحب جی مجھے اجازت دیجئے''۔

''ارے بابا...... کچھ دیر رکو باہر سخت گرمی ہے''۔

''نہیں صاحب جی بلاوا آ گیا''۔

''بلاوا...... کس کا بلاوا؟''

''صاحب جی اللہ بلا رہا ہے''۔

قلی مزدوری کے پیسے لے کر اللہ کا شکر بجالاتے ہوئے چلا گیا لیکن میجر کو بے چین کر کے چھوڑ گیا۔ اس کی باتوں سے میجر کے دل میں ایسی ہلچل مچ گئی جیسے برسوں سے ساکت وجامد کناروں پر کائی جمی جھیل میں کسی نے بلندی سے بھاری پتھر اچھال دیا ہو۔

میجر بہت دیر تک سوچ وفکر کی بھول بھلیوں میں اُلجھا سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہا۔

قلی کی باتیں ہتھوڑی کی طرح کھٹ کھٹ اس کے کانوں کے پردوں پر پڑ رہی تھیں۔ اپنی زندگی کی تمام ریاکاریاں اور سیاہ کاریاں ایک ایک کر کے اس کے سامنے رقص کر رہی تھیں ......اس کے وجود سے خفت وخجالت کی پیپ بہنے لگیں اور چہرے پر فکر و پریشانی کی برف جم گئی۔ دفعتاً پھر سے اللہ اکبر کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی جسے سن کر وہ سوچوں کے خول سے باہر آگیا۔ اس نے گھڑی دیکھی تو عصر کا وقت ہو چکا تھا، اطمینان سے پوری اذان سننے کے بعد قلی کی یہ باتیں اس کے ذہن کے پردوں پر گونجنے لگیں۔

''کائینات کے بادشاہ کا عظیم دربار ہر وقت سب کے لئے کھلا رہتا ہے، جہاں افو درگزر کی رحمتیں برستی رہتی ہیں۔ اس کے پھاٹک پر نہ کوئی پہرہ ہے......نہ پہرے دار......نہ کوئی دربان......نہ سیکریٹری اور نہ ہی کسی سے اجازت لینے کی ضرورت ہے''۔

اسی لمحے کسی غیبی طاقت نے اس کے وجود کو جھنجھوڑا......وہ ایک دم اٹھا اور شراب کی بوتل کا ڈھکن اٹھا کر سارا شراب باتھ روم کے کموڑ میں انڈیل کر بوتل ڈسٹ بن میں پھینک دی اور نادم ہو کر وضو بنا کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے مسجد شریف کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

عید

عید کی آمد آمد تھی اور لوگ باگ زور و شور سے عید کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر صبح صبح ہی ریشما نے بھی بازار کا رخ کیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ عرشی جو گھر میں اب اکیلی تھی، نے دروازہ کھولا تو باہر موجود برقعہ پوش خاتون نے اس کو بے ساختہ گلے لگایا، کئی بار اس کا ماتھا چوما اور چاولوں سے بھرا تھیلا جو وہ ساتھ لائی تھی اٹھا کر عرشی کے ساتھ ہی اندر داخل ہو گئی۔

''بیٹی ...... تمہاری امی کہاں ہے؟''

''وہ بازار گئی ہے ...... لیکن آپ کون ہو؟''

''تمہاری آنٹی ہوں نا کئی بار جو یہاں آئی ہوں ......''۔

''لیکن امی کہتی ہیں کہ میری کوئی آنٹی نہیں ہے''۔

عرشی نے اس کی بات کاٹ کر معصومانہ لہجے میں کہا تو وہ حقا بقا ہو کر رہ گئی۔

''نہ بیٹی ایسا نہیں کہتے''۔

کہہ کر اس نے پھر سے اس کا ماتھا چوما اور کاندھے پر لٹکے پرس سے کچھ رقم نکال کر اس کی اور بڑھاتے ہوئے گویا ہوئی۔

''یہ لو بیٹی ...... یہ روپے امی کو دے دینا''۔

''نہیں آنٹی ...... آپ خود ہی دو نا''۔

''وہ نہیں ہیں نا یہاں ...... تم رکھ لو''۔

کہتے ہوئے روپے عرشی کو تھما کر اپنی صورت دکھائے بغیر ہی وہ واپس جانے کے لئے مڑی تو سامنے ایک برقعہ پوش خاتوں کو کھڑی دیکھ کر شش و پنج میں مبتلا ہو کر ایک پل کے لئے اس کے قدم رک گئے۔

''رک جاؤ محترمہ''۔

وہ جونہی جانے لگی تو خاتون نے اپنے چہرے سے نقاب اُلٹتے ہوئے انتہائی مہذب انداز میں کہا۔

خاتوں کا چہرہ دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رہ گئی، اس کے ماتھے سے ٹھنڈے پسینے کی بوندیں چھوٹنے لگیں کیوں کہ خاتوں کوئی اور نہیں بلکہ ریشما ہی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر ہی اس کو نظر انداز کر کے عجلت میں جانے لگی۔

''کیوں محترمہ...... خیرات دینے جو آئی ہو تو اپنے درشن نہیں کراؤ گی''۔

ریشما نے طنزیہ انداز میں کہا تو اس کے قدم رک گئے لیکن وہ بدستور خاموش رہی۔

''آپ اپنی صورت نہیں دکھاؤ گی تو نہ سہی لیکن ایک منٹ میرے ساتھ چلئے''۔

ریشما نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک کمرے میں لے گئی۔

''بہت خیرات سے نوازا ہے آپ نے ہمیں...... یہ چاول...... یہ کپڑے...... یہ ضروریات کی دوسری چیزیں اور یہ نقدی......''۔

ریشما نے ایک ڈبے سے کچھ رقم نکالتے ہوئے کہا۔

خاتوں یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئی کہ آج تک وہ جو بھی چیزیں ریشما کے گھر چھوڑی کر گئی تھیں وہ بالکل اسی حالت میں سنبھال کے رکھیں ہوئی تھیں۔

''ہمیں آپ کے اس خیرات کی کوئی ضرورت نہیں ہے، نہ ہم دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنا چاہتے ہیں''۔

ریشما نے رقم اس کو تھماتے ہوئے کہا۔ عرشی نے بھی آگے بڑھ کر اس کی دی ہوئی رقم واپس کر دی۔

''میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ یہ ساری چیزیں ابھی واپس لے جائیں اور

آئیندہ ہمیں کوئی خیرات دینے کی تکلیف نہ کریں''۔

ریشما نے شان بے نیازی سے اس کی دی ہوئی چیزوں کو ٹھکراتے ہوئے کہا تو برقعہ پوش خاتون، جو خفت اور شرمندگی کے باعث سر سے پاؤں تک پسینے مین شرابور ہو چکی تھی، نے زبان سے بغیر کچھ کہے ریشما کے آگے معافی مانگنے کے انداز میں ایسے لجاجت کے ساتھ دونوں ہاتھ جوڑے جیسے اس کے ہونٹوں پر پیڑیاں پڑیں ہوں۔

''ٹھیک ہے......اگر آپ یہ چیزیں خود نہیں لے جا سکتی تو کسی اور کو بھیج دینا لے جانے کے لئے ورنہ یہ یہی پڑی سڑ جائینگی''۔

خاتون نے اس بات میں سر ہلایا اور ایسے چلی گئی جیسے اس کو زندان سے رہائی ملی ہو۔قریب ایک سال سے کوئی برقعہ پوش خاتون ریشما کی غیر حاضری میں ضروریات زندگی کی مختلف اشیا اور نقدی اس کے گھر چھوڑ جاتی تھیں لیکن کوشش کے باوجود آج تک ریشما کا اس کے ساتھ آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔آج ریشما حسب معمول گھر سے بازار کی طرف تو چلی گئی لیکن ایک چال چل کے تھوڑی دور جا کر دوسری گلی سے واپس آ گئی کیوں کہ اس سے یقین تھا کہ اس کے جاتے ہی وہ خاتون آئے گی۔اس کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا اور عزت نفس کو تسکین حاصل ہوئی۔خاتون کے جانے کے بعد ریشما گھر کے کاموں میں جٹ گئی اور دوپہر کے کھانے کے بعد چرخہ کاتتے ہوئے پریشان اور منتشر ذہن کی کتاب رفتہ رفتہ الٹنے لگی۔جب کہ عرشی کچھ دیر پڑھائی کرنے کے بعد آنگن میں کھیلنے لگی۔

ریشما ستی سر شہر کی ایک خوددار، خوب رو تعلیم یافتہ لڑکی تھی جو ہنسی خوشی مہارانی کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔اس کا شوہر کامران ایک نیک دل تاجر پیشہ انسان تھا جو اپنی محنت سے خوب کمائی کرتا تھا۔اچھی آمدنی کے سبب وہ اپنی بیوی اور بچی کو ہر سہولیت میسر رکھنے کے ساتھ ساتھ ہر ہفتے گھمانے لے جا کر مختلف صحت افزا مقامات کی سیر کراتا تھا۔ریشما کو ہر طرح سے خوش رکھنے کے ساتھ ساتھ لاڈلی عرشی کے لئے ڈھیروں کھلونے اور تفریح کا دوسرا سامان لاتا تھا۔انہیں کسی بھی قسم کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتا تھا۔اپنے پڑوسیوں اور رشتہ داروں کے دکھ سکھ میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتا تھا اور سماج میں عزت وتوقیر کی نگاہوں

سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن ریشما کی یہ خوشیاں جیسے ادھار کی تھی کہ ایک دن صبح کامران حسب معمول کام کے سلسلے میں گھر سے نکلا لیکن پھر کبھی نہیں لوٹا۔ عرصہ دراز سے سیاسی بے چینی اور تشدد کا شکار جنت نما بستی سرشہر کے ایک چوراہے پر آہن پوشوں کی دوطرفہ تصادم آرائی میں کئی نہتے انسان جاں بحق ہوگئے جن میں کامران بھی شامل تھا۔ شام کو جب زخموں سے چور کامران کی لاش گھر پہنچی تو ریشما پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ اس طرح عین شباب میں ہی موت نے اس کا سہاگ چھین لیا اور اس کی خوشیوں بھری زندگی تپتے صحرا کی طرح ویران ہو کر رہ گئی۔ شروع شروع میں قریبی رشتہ دار اور احباب اس کی ڈھارس بندھاتے رہے اور مالی معاونت بھی کرتے رہے جب کہ اپنائیت کا احساس دلاتے ہوئے عرشی کو باپ کی کمی بھی محسوس نہیں ہونے دیتے تھے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب اپنے اپنے جھمیلوں میں پھنس کر ان کو اس حد تک بھول گئے کہ ان کے گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی۔ ریشما نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ہی اپنی غیرت اور خودداری کو بیچ کر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارا کیا بلکہ گھر میں چرخہ کاتنے کے ساتھ ساتھ ایک پرائیوٹ ادارے میں بھی کام کرنا شروع کر دیا اور جوں توں کر کے گھر کا گزارہ چلاتی رہی۔ اپنا کچھ زیور بیچ کر عرشی کو ایک اچھے سکول میں داخل کرایا۔ عرشی جو اپنی ماں ہی کی طرح حساس ذہن لڑکی تھی خوب دل لگا کر پڑھائی کرتی تھی لیکن اپنے شفیق باپ کی جدائی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے ہمیشہ اُداس رہتی تھی، حالانکہ ماں محنت مشقت کر کے خوشی خوشی اس کی تمام ضروریات پوری کرتی تھی لیکن اس کے اندر جو درد چھپا تھا ماں کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ چھٹی کے وقت جب والدین پیار سے اپنے اپنے بچوں کو پکار کر گلے لگاتے تھے تو اس کے حساس دل میں کانٹے سے چبھتے تھے، آنکھیں بھر آتی تھی اور وہ بھی اپنے ابو کے منہ سے دو بول سننے کو ترستی تھی۔ لیکن جب رشتوں میں خلوص ہی نہیں رہا تو اس کو بیٹی کہہ کر کون پکارتا؟۔ وہ نیند میں اکثر ابو جان......ابو جان بڑبڑاتی رہتی تھی اور بیدار ہو کر دھاڑیں مار مار کر روتی تھی۔ عرشی کی یہ حالت اور اپنے سگے رشتہ داروں اور کرم فرماؤں کی بے اعتنائی سے ریشما کا دل آئینے کی طرح چکنا چور ہو گیا اور اس نے سب کے ساتھ ناطہ ہی توڑ دیا۔

''امی جان...... دیکھو تو میں نے کیا اٹھایا''۔

سوچوں کی بھول بھلیوں میں گم چرخہ کاتنے میں مصروف ریشما، جس کے ذہن میں خیالات پریشان کا چرخہ بھی چل رہا تھا، کی سماعت سے عرشی کی آواز ٹکرائی۔ عرشی کے ہاتھ میں ایک خوب صورت نقلی گلاب کا پھول، جو اس کو کھیلتے ہوئے آنگن میں ملا تھا، دیکھ کر وہ چونک گئی کیوں کہ ایسے ہی دو پھول برقعہ پوش خاتون کے پرس پر لگے تھے۔ ریشما نے گھڑی کی طرف دیکھا تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔

''عرشی بیٹا...... کل عید ہے نا، جلدی سے تیار ہو جاؤ ہم بازار جائینگے''۔

کچھ دیر بعد ریشما یتیم عرشی کی دل بہلائی کے لئے اسے لے کر بازار چلی گئی۔

عید کے دن ہر طرف گہما گہمی اور رونقیں تھیں لیکن ریشما کے گھر میں تنہائی اور ویرانی باہوں میں باہیں ڈالے اونگھ رہی تھی۔ سہ پہر کے وقت ریشما کی قریبی سہیلی شازیہ، جو اس کی ہمسائیگی میں ہی رہتی تھی، اپنے شوہر اور بچی کے ساتھ اچانک ان کے گھر وارد ہوئی۔ عرشی جو اپنے آنگن میں مٹی کے کھلونوں سے کھیل رہی تھی انہیں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سمائی۔ ریشما نے رسم دنیا نبھانے کی خاطر ان کا بھرپور استقبال کیا۔ انہو نے ریشما کے ساتھ ساتھ عرشی کے لئے بھی کچھ تحفے اور کھلونے لائے تھے۔

''یہ لو عرشی بیٹی...... یہ تمہارے لئے ہے''۔

شازیہ نے ایک قیمتی کھلونا عرشی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ کھلونا دیکھ کر عرشی، جس کا دل دھڑکنے لگا، حسرت بھری نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

تمہارے اجازت کے بغیر یہ نہیں لے گی''۔

شازیہ، جو ریشما کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی، نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لو بیٹی...... بڑا قیمتی کھلونا ہے''۔

ماں کی اجازت کے بعد عرشی نے کھلونا لیا اور خوشی میں جھومتے ہوئے شازیہ کی بچی، جو اس کی ہم عمر اور ہم جماعت تھی، کے ساتھ کھیلنے میں مگن ہو گئی، جب کہ ریشما مہمانوں کی خاطر داری میں لگ گئی۔ بہت دیر تک باتیں کرنے اور کھان پان کے بعد شازیہ اور اس کا

شوہر رازدارانہ انداز میں آپس میں کچھ باتیں کرنے لگے تو ریشما نے وہاں رہنا مناسب نہیں سمجھا۔

آپ لوگ باتیں کیجئے میں کچن سے ہو کے آتی ہوں۔

''تم بیٹھو ریشما...... دراصل یہ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں''۔

شازیہ نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اپنا پرس سامنے رکھ کر اس میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔

''ریشما بہن...... دراصل بات یہ ہے کہ میں...... میری بیٹی ہے نا عظمٰی......''۔

''ہاں ہے تو......''

''اگر آپ اجازت دیں تو میں.... میں عرشی کو اپنی دوسری بیٹی بنانا چاہتا ہوں....''۔

یہ الفاظ سنتے ہی ریشما، جس کا دھیان شازیہ کے پرس کی طرف تھا، کے غم زدہ چہرے پر مسکراہٹ پھیلی کیوں کہ شازیہ کے پرس پر دو کی جگہ ایک ہی گلاب کا پھول موجود تھا، اس نے عرشی، جو عظمٰی کے ساتھ کھیلنے میں مگن تھی، کی طرف نظریں اٹھائی اور اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

☆☆☆

سوشل ڈسٹنس

''شکر ہے تیرا میرے مولیٰ کہ تو نے مجھ پر رحم فرمایا، واقعی میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی.......''۔

راحیلہ، جو کئی دنوں بعد آج کسی حد تک پرسکون محسوس کر رہی تھی، خود سے بڑبڑاتے ہوئے اپنے آنگن میں کرسی پر بیٹھی اور موبائیل فون پر سوشل میڈیا کا نظارہ کرنے میں محو ہوگئی۔ راحیلہ کو اس واقعہ نے پریشان کر رکھا تھا، قریب پندرہ دن گزرنے کے بعد وہ آج اس پریشانی سے نکلی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ راحیلہ نے اپنی سہیلی قرعت کے گھر دودھ پیا تھا جس کے چند دن بعد قرعت کی بیٹی بخار میں مبتلا ہوئی تھی اور وہ اس شک میں مبتلا ہوگئی تھی کہ کئی وہ اس وبائی بیماری کرونا وائیرس میں مبتلا نہ ہو جسے بہت سے لوگ لقمہ اجل بن رہے ہیں اور اس دودھ کے ذریعے یہ وائیرس مجھ میں بھی منتقل نہ ہوا ہو۔ اسے اس بات نے اور زیادہ پریشان کر رکھا تھا کہ اگر راحیلہ کی بیٹی اس بیماری میں مبتلا پائی گئی تو ان کے گھر دودھ پینے کی وجہ سے اسے بھی پندرہ بیس دن اسپتال کے قید خانے کورنٹائین سنٹر میں گزارنے پڑیں گے۔ سو یہ پندرہ دن اس نے کانٹوں پر گزارے۔ اس کا دن کا چین اور راتوں کی نیند غائیب ہو چکی تھی حالانکہ قرعت کی بیٹی چند دنوں بعد ہی ٹھیک ہوئی تھی جب کہ راحیلہ بھی بالکل ٹھیک ٹھاک رہی۔

راحیلہ سوشل میڈیا دیکھنے میں محو تھی کہ گھر کے صدر دروازے پر دستک ہوئی، گھریلو ملازم نے دروازہ کھولا تو قرعت اندر داخل ہوگئی۔ راحیلہ، جو سوشل میڈیا پر کرونا وائیرس کے

بارے میں مختلف پوسٹس پڑھ کر کچھ پریشان سی لگ رہی تھی، کے چہرے کے جغرافیہ میں ہل چل مچ گئی۔ وہ جلدی جلدی مُنہ پر ماسک چڑھاتے ہوئے سرد لہجے میں گویا ہوئی۔

''قرعت......تمہاری بیٹی اب کیسی ہے؟''

''شکر اللہ کا، اب وہ بالکل ٹھیک ہے''۔

''اچھا آپ لاک ڈاون میں کیسے آ گئی؟ سوشل ڈسٹنس کا خیال رکھنا چاہیے۔

''مجھے معلوم ہے لیکن میں نے سوچا کہ بہت دنوں بعد آپ کی اور بچوں کی خیر وعافیت معلوم کرلوں''۔

''اچھا بیٹھو''۔

راحیلہ نے کچھ دوری پر ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور قرعت بادل ناخواستہ ہی کرسی پر بیٹھی اور کچھ دیر راحیلہ کے ساتھ باتیں کرتیں رہی جس دوران وہ اندر ہی اندر عجیب سی کشمکش میں مبتلا رہی۔

''نہیں...نہیں میں اسے کچھ نہیں بولوں گی''۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں''۔

آخر اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا اور اچانک راحیلہ کو خدا حافظ کہہ کر عالم یاس واضطراب میں بوجھل قدموں سے وہاں سے نکلی۔

''پتہ نہیں کیسے لوگ ہیں؟......ذرا بھی احتیاط نہیں کرتے''۔

راحیلہ ناک سکیڑ کر بڑ بڑاتے ہوئے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ دراصل قرعت، اس کی نزدیکی سہیلی تھی جو اس کے گھر سے کچھ دوری پر رہتی تھی اور لگاتار لاک ڈاون کی وجہ سے تنگ دستی کے سبب سخت پریشان تھی کیوں کہ اس کا شوہر جو ایک پرائیویٹ کمپنی میں کام کرتا تھا روزگار سے محروم ہوکر پچھلے دو مہینوں سے بالکل بے کار بیٹھا تھا اور ان کے گھر میں فاقوں کی نوبت آ چکی تھی۔ اب قرعت بڑی امیدیں لے کر آئی تھی کہ گھر اور بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے راحیلہ، جو مالی لحاظ سے کافی خوشحال تھی، سے کچھ رقم اُدھار لے گی لیکن اس کا بدلہ بدلہ رویہ دیکھ کر بنا کچھ کہے ہی چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد راحیلہ سینی ٹائیزر سے ہاتھ دھونے کے بعد واپس نکلی تو اس کی چھوٹی بیٹی ہاتھ میں آئیس کریم لئے باہر سے آ رہی تھی۔

''پاگل بچی...... تم نے یہ آئیس کریم کہاں سے لایا؟''

اس نے بچی کے ننھے گال پر زناٹے دار چانٹا مارتے ہوئے کہا اور اس کے ہاتھ سے آئیس کریم چھین کر دور پھینکتے ہوئے بات جاری رکھی۔

''جلدی سے واش روم جا کر اپنا منہ اور زبان زور سے رگڑ کر دھولو''۔

''مما...... یہ آئیس کریم مجھے ماموں نے لے کر دیا تھا اور میں نے آئیس کریم کو ابھی مُنہ نہیں لگایا تھا''۔

بچی نے روتے ہوئے کہا۔

''سچ ...... تم نے آئیس کریم کو مُنہ نہیں لگایا تھا۔ چلو پھر سینی ٹائیزر سے ہاتھ صاف کر لو''۔

بچی نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے سینی ٹائیزر اس کے ہاتھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو بچی کو گود میں اٹھا کر پیار سے سمجھانے لگی۔

''میری پیاری گڑیا...... میں نے آپ کو کتنی بار بتایا کہ آج کل بازار کی کوئی چیز نہیں کھانی چاہئے کیوں کہ ان سے وائیرس لگنے کا بہت زیادہ خطرہ ہوتا ہے''۔

بچی کو پیار کرنے اور منانے کے بعد وہ ریلیکس ہو کر پھر سے سوشل میڈیا کی سیر کرنے لگی۔ راحیلہ انتہائی قسم کی حساس عورت تھی اور سوشل میڈیا کا خوب استمال کرتی تھی۔ آئے روز سوشل میڈیا پر کرونا وائیرس بیماری کے متعلق پوسٹس پڑھ کر اور ویڈیوز دیکھ کر اکثر سوچوں میں گم اور پریشان رہتی تھی۔ خود بھی سخت احتیاط کرتی تھی، بچوں اور شوہر کو بھی ہر قسم کا احتیاط برتنے کی سخت تلقین کرتی تھی۔ لاک ڈاون کے چلتے وہ سوشل ڈسٹنس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس نے خود کو، اپنے شوہر اور بچوں کو پوری طرح سے گھر میں قید کر کے رکھا تھا اور گھر کا دروازہ دن رات بند رہتا تھا۔ ان کا گھریلو ملازم بمشکل دن میں ایک بار بازار جا کر گھر کی ضروریات کی چیزیں خرید کر لاتا تھا......

بہت دنوں بعد سرکار کی طرف سے لاک ڈاون میں نرمی کے بعد بھی وہ اپنے روش پہ قائم تھی لیکن ایک دن اس کا شوہر، جس کو گھر کی چاردیواری سانپ بن کر ڈس رہی تھی، اس کو چکمہ دیکر گھر سے باہر گیا، جب وہ واپس آیا تو اس کی شکل ہی بدلی تھی کیوں کہ دو مہینوں کے زیادہ وقفے کے بعد اس نے اپنے سر کے بال کٹوائے تھے۔

''یہ بال تم نے کہاں سے کٹوائے؟''

راحیلہ نے غصے بھرے لہجے میں پوچھا۔

''نائی کے پاس اور کہاں؟''

''ہائی میری قسمت......تو مجھے اور بچوں کو مار کے ہی دم لے گا، تمہیں نہیں معلوم کہ درجنوں نائیوں کے کرونا ٹیسٹ پازیٹیو آئے ہیں''۔

اس نے روتے ہوئے ماتھا پیٹنا شروع کیا۔

''ریلیکس راحیلہ......کچھ نہیں ہوگا، میں اور نائی دونوں ماسکس پہنے ہوئے تھے اور نائی دیگر احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرتے ہیں''۔

شوہر نے ایکٹنگ کے انداز میں اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''آپ جا کے واش روم میں نہاؤ اور کپڑے بھی بدلو''۔

''ٹھیک ہے''۔

''یہ کونسی بھلا میرے گلے پڑ گئی......''۔

بڑبڑاتے ہوئے اس کا شوہر واش روم کی طرف چلا گیا۔

اس واقع سے راحیلہ پھر سے پریشانی میں مبتلا ہوگئی، دن بہ دن اس کے اندیشے بڑھتے ہی چلے گئے لیکن دس بارہ دن گزرنے کے بعد جب اس کی پریشانی کم ہونا شروع ہوگئی تو وہ فیصلہ کن لہجے میں اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔

''اگر تمہیں میرا اور بچوں کی سلامتی کا ذرا بھی خیال ہے تو آج سے تم ذرا بھی بے احتیاطی نہیں کروگے، نہ گھر سے باہر قدم رکھو گے۔ ورنہ میں بچوں کو لے کر میکے جاؤں گی''۔

''ٹھیک ہے......تم بالکل پریشان نہ ہو''۔

شوہر کے جواب سے خوش ہو کر اس نے اطمینان کا سانس تو لیا لیکن سوشل میڈیا پر اس وبائی بیماری کے بارے میں پوسٹس پڑھ کر وہ اکثر پریشان ہی رہتی تھی اور گھنٹوں سوچوں میں گم رہتی تھی حالانکہ اس کا شوہر اس کو بار بار سوشل میڈیا سے دور رہنے کی فہمائیش کر رہا تھا لیکن وہ سنی ان سنی کر رہی تھی۔ کچھ دن بعد اسی پریشانی کے عالم میں واش روم میں اس کا پیر پھسل گیا اور وہ نیچے گر پڑی، اس کے پاؤں میں موچ آ گئی اور دائیاں ہاتھ زخمی ہو گیا۔ اس کا شوہر اس کو عجلت میں علاج کے لئے ایک نزدیکی پرائیویٹ کلنک پر لے گیا، جہاں اس کی مرہم پٹی کی گئی جس دوران اس کو یاد آیا کہ وہ ماسک پہننا بھول گئی ہے۔ گھر آ کر وہ اس بات سے سخت پریشان رہنے لگی۔ یہ سوچ کر اس کا دم گھٹ رہا تھا اور دل میں کانٹے سے چبھ رہے تھے کہ نہ ہی اس نے اور نہ ہی مرہم پٹی کرنے والے ڈاکٹر نے فیس ماسک پہنا تھا۔ کئی دنوں تک بستر پر آرام کرنے کے بعد اس کے زخم، جو معمولی نوعیت کے تھے، ٹھیک ہو گئے لیکن وہ بستر سے نہیں اٹھی اور سخت ذہنی دباؤ میں مبتلا ہو کر بیمار ہو گئی۔ اس کا انگ انگ درد کی شدت میں ڈوبنے لگا، وقفے وقفے سے بخار بھی ہونے لگا اور وہ خود سے کرونا کرونا اور دیگر اناپ شناپ بولنے لگی۔ جب اس کی حالت زیادہ بگڑنے لگی تو اس کا شوہر اس کو ایک مشہور ماہر نفسیات کے پاس لے گیا اور اس کی حالت کے بارے میں اسے تفصیل سے بتایا۔

''دیکھئے محترمہ ......آپ بالکل ٹھیک ہیں اور کسی پریشانی کی وجہ سے ذہنی دباؤ کا شکار ہوئی ہیں جس کا واحد علاج خوش رہنا اور لوگوں خاص طور اپنی سہیلیوں اور جان پہچان والوں سے گلے مل کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے رہنا ہے''۔

ڈاکٹر نے تفصیلی معائینے کے بعد نسخہ اس کو تھماتے ہوئے کہا۔ اس نے سوشل ڈسٹنس اور اپنے صحت کے بارے میں ڈاکٹر سے کئی سوالات پوچھے جن کے اس نے خندہ پیشانی سے جوابات دیکر اس کو مطمعن کر دیا۔ جب وہ کلنک سے باہر نکلے تو باہر ایک برقعہ پوش خاتون، جس کے برقعے کے دامن پر کئی سراغ موجود تھے، بھیک مانگ رہی تھی راحیلہ

نے پرس سے ایک نوٹ نکال کر اس کو دیتے ہوئے کہا۔

''بہن......کیا پریشانی ہے آپ کو؟''

لیکن بھکارن نے کوئی جواب نہیں دیا۔اس نے کئی بار اپنا سوال دہرایا لیکن بھکارن نے مُنہ نہیں کھولا اور اس کو نظر انداز کر کے اپنا ریزہ ریزہ وجود لئے وہاں سے چلی گئی۔

''شاید بہری ہے بے چاری''۔

کہتے ہوئے وہ بھی گاڑی میں بیٹھ گئی اور پرس سے فون نکال کر قرعت کا نمبر ملایا کیوں کہ آج وہ اپنی قریبی سہیلی قرعت سے خوب باتیں کرنا چاہتی تھی۔

''اس نمبر پر انکمنگ کال فیسلٹی بند ہے جو ریچارج کرنے کے بعد ہی بحال کی جائے گی''۔

اس نے بار بار قرعت کا نمبر ملایا لیکن ہر بار یہی جواب ملا۔دوسرے دن صبح اس نے جب اپنے شوہر کو بتایا کہ وہ قرعت سے ملنے اس کے گھر جا رہی ہے تو اس کے شوہر کو یقین نہیں آیا۔

''چلو میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا''۔

جب انہوں نے قرعت کے گھر کے سامنے گاڑی روکی تو قرعت برقعہ پہن کر گھر کے دروازے سے نکل رہی تھی،راحیلہ نے غور سے دیکھا تو یہ دیکھ کر درد کی ایک تیز ٹیس اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی کہ قرعت کے برقعے کے دامن پر کئی سراغ موجود تھے۔

☆☆☆

کھنڈر

موسم ابر آلود تھا ہلکی سی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ڈاکٹر عدنان اپنے کلینک میں بیٹھا کافی خوش نظر آر ہا تھا کیوں کہ آج مریضوں کی اچھی تعداد آنے کی وجہ سے اس کی اچھی خاصی کمائی ہوئی تھی۔شام کے دھند لکے چھانے کے بعد وہ اپنا کلینک بند کر کے اپنی رہائش پر جانے کی تیاری کرنے لگا......

''آداب......ڈاکٹر صاحب''۔

دفعتاً اس کی سماعتوں سے آواز ٹکرائی ،اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک بوڑھا شخص ،جس کے سر اور داڑھی کے بال اُلجھے ہوئے تھے ، پھٹے پرانے لباس میں ملبوس اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''بابا......کہیے کیا بات ہے؟''

اس نے انتہائی نرم لہجے میں پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب......میری بیٹی سخت بیمار ہے،آپ مہربانی کر کے چل کر اس سے دیکھ لیجئے''۔

اس کی بات سن کر ڈاکٹر اس کے حلیے کا جائیزہ لینے لگا تو وہ مسکین سی صورت بنا گویا ہوا۔

''ڈاکٹر صاحب......میں آپ کی پوری فیس ادا کروں گا''۔

''آپ کا گھر کہاں ہے؟''

ڈاکٹر نے پوچھا۔

''پاس ہی ہے ڈاکٹر صاحب، اُس بستی کے پیچھے''۔

اس نے بستی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد ڈاکٹر نے اپنے معاون کو آواز دی اور وہ دونوں اس کے ساتھ روانہ ہوئے اور قریب آدھے گھنٹے کا سفر طئے کر کے اس کے گھر پہنچ گئے۔ یہ ایک ویران سی جگہ تھی جہاں گھروں کے نام پر مٹی کے ٹوٹے پھوٹے ڈھوکے تھے اور ایسا ہی ایک ڈھوکا اس کا بھی تھا۔ بہر حال ڈاکٹر نے اس بات میں زیادہ دلچسپی نہ لیتے ہوئے مریضہ کا معائینہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ ایک بیس بائیس سال کی دوشیزہ تھی جو سخت بخار میں مبتلا تھی۔ اچھی طرح سے معائینہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے کچھ دوائیاں دیتے ہوئے اسے کہہ دیا۔

''آپ یہ دوئیاں اس کو کھلاتے رہنا، یہ ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی''۔

''مجھے نہیں لگتا ہے ڈاکٹر صاحب''۔

اس نے ناامیدی کے انداز میں کہتے ہوئے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر ڈاکٹر کو تھما دئے۔ ڈاکٹر نے حساب کر کے دیکھا تو رقم کچھ زیادہ تھی تو اس نے ایک نوٹ اسے واپس کرنا چاہا۔

''رکھیے ڈاکٹر صاحب......آپ کو بارش میں بھیگنا پڑا''۔

ڈاکٹر نے فاضل رقم اس کو واپس کرنا چاہا لیکن وہ بالکل نہیں مانا۔ بہر حال ڈاکٹر اور اس کا معاون دیر گئے وہاں سے واپس نکلے۔ جانے سے پہلے ڈاکٹر نے ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں پر ایک بھر پور نظر دوڑائی تو اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

''کتنے غریب لوگ ہیں بے چارے، دنیا کی آسائشوں سے بے خبر اور لوگوں نے اس بستی کے بارے میں کیسے بے پر کی افواہیں پھیلائی ہیں''۔

ڈاکٹر اس کھنڈر نما بستی کے بارے میں سوچتے ہوئے گھر کی طرف چلا۔ یہ جنگ سے سخت متاثر ایک شہر تھا اور ڈاکٹر عدنان نے کچھ مہینے پہلے ہی اس شہر میں ایک کلینک کھولا تھا تا کہ جنگ زدہ علاقوں کے لوگوں کی خدمت کے ساتھ ساتھ کچھ روزگار کا بھی

انتظام ہو جائے۔کھنڈر والی جگہ، جہاں وہ مریض کو دیکھنے گیا تھا، کے بارے میں مشہور تھا کہ دوران جنگ اس بستی پر ہوائی بمباری کے دوران درجنوں لوگ، جن میں بزرگ، معصوم بچے اور خواتین شامل تھیں، ہلاک ہو گئے تھے اور رہائیشی مکانات تہس نہس ہو گئے تھے۔اس جگہ کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہاں بدروحیں دن رات گھومتی رہتی ہیں اور لوگ وہاں جانے سے کتراتے تھے،لیکن ڈاکٹر کو ان باتوں پر ذرا بھی یقین نہیں تھا اور وہ اس کو لوگوں کا وہم سمجھتا تھا.....سوچتے سوچتے ڈاکٹر اپنی رہائیش گاہ پر پہنچ گیا۔وہ کافی تھکا ہوا تھا اور اس نے کپڑے بدلے اور صوفے پر دراز ہو کر ستانے لگا۔کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے آج دن کی کمائی گننے کا ارادہ کر لیا اور جیب سے سارے نوٹ نکالے لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کھنڈر والے بابا نے جو روپے دئے تھے وہ غائب تھے،اس نے اپنی ساری جیبوں کو ٹٹولا لیکن کچھ نہیں ملا......

''شاید کئی گر گئے ہوں''۔

وہ خود سے بڑبڑایا، رقم کھونے پر اسے زیادہ افسوس بھی نہیں ہوا کیوں کہ اس کی اچھی خاصی کمائی ہو رہی تھی۔اس کے بعد وہ دوائی والے بکسے کو چک کرنے لگا لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ اس نے جو ادویات بابا کو بیمار کے لئے دیں تھیں وہ بھی بکسے میں ہی موجود تھیں۔

''شاید میں نے ہی جلد بازی میں یہ دوائیاں واپس بکسے میں رکھ دی ہیں......
اب اس بیمار لڑکی کا کیا ہوگا، اسے تو شدید بخار ہے۔

ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے سوچتے ہوئے اس کے دل میں کانٹے سے چبھنے لگے اور وہ کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا تا کہ واپس جا کر اس کو دوائیاں دے آئے لیکن، باہر گھپ اندھیرا تھا اور زوروں کی بارش ہو رہی تھی جب کہ اس کا معاون بھی اپنے گھر جا چکا تھا اس لئے وہ باہر جانے کی ہمت نہیں جٹا پایا اور کچھ دیر بے چینی کے عالم میں رہنے کے بعد یہ سوچ کر کھڑکی بند کر کے بیٹھ گیا کہ بابا کل صبح آ کر ادویات لے گا۔لیکن بابا صبح نہیں آیا، کام میں اُلجھے رہنے کے باعث ڈاکٹر بھی اس واقعہ پر زیادہ دھیان نہیں دے سکا اور بات آئی گئی۔

قریب دس دن بعد ڈاکٹر شام کو کلینک بند کر کے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ بابا اچانک وارد ہو کر رونی سی صورت بنا کر ڈاکٹر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیا حال ہے بابا......آپ کی بیٹی ٹھیک ہو گئی؟"

"ڈاکٹر صاحب......وہ بے چاری کبھی ٹھیک نہیں ہو گی اور میرا بیٹا بھی سخت بیمار ہے۔آپ چل کر اسے دیکھ لیجئے......"۔

"بابا......آپ روز دیر سے ہی آتے ہو......"۔

"ڈاکٹر صاحب......خدا کے لئے چلئے، میں آپ کی پوری فیس دونگا"۔

وہ ہاتھ جوڑ کر ڈاکٹر کے سامنے گڑگڑایا جس دوران اس کی پژمردہ آنکھوں میں درد کا بیکراں سا ابھر آیا۔

"اچھا ٹھیک ہے"۔

ڈاکٹر جانے کے لئے تیار ہو گیا کیوں کہ ایک تو اس کے پیشے کا تکازا تھا اور اچھی فیس ملنے کی بھی امید تھی۔ڈاکٹر نے اپنے معاون کو آواز دی جس نے دوائیوں کا بکسا اٹھایا اور وہ دونوں بابا کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل نکلے۔

"ڈاکٹر صاحب......میں نے سنا ہے کہ اس کھنڈر والی بستی میں بدروحیں گھومتی رہتی ہیں اور وہاں بہت خطرہ ہے"۔

راستے میں چلتے ہوئے معاون نے رازداری کے انداز میں ڈاکٹر سے کہا۔

"سنا تو میں نے بھی ہے، لیکن پڑھے لکھے ہو کر بھی تم ان کہی سنی بے بنیاد باتوں پر یقین کرتے ہو......میں یہ سب نہیں مانتا ہوں"۔

ڈاکٹر نے جواباً کہا اور اسی دوران وہ بابا کے ٹوٹے پھوٹے مٹی کے مکان تک پہنچ گئے۔جب وہ اندر گئے تو کسی عورت کے سسک سسک کر رونے کی آوازیں آرہی تھیں اور چارپائی پر کوئی لیٹا ہوا تھا جس کے سر تا پا چادر اوڑھی ہوئی تھی۔

"ریشما کی اماں......ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں، ذرا ادھر تو آؤ"۔

"ڈاکٹر صاحب.....خدا کے لئے میرے جوان بیٹے کو بچاؤ......"۔

چند لمحوں بعد ہی میلے کچیلے بوسیدہ لباس میں ملبوس ایک عمر رسیدہ خاتون، جس کی آنکھیں خوف سے لرزی ہوئیں تھیں، کمرے میں داخل ہو کر روتے ہوئے لجاجت سے ہاتھ باندھ کر ڈاکٹر سے منتیں کرنے لگی۔

''اماں جی...... آپ فکر نہ کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا، کیسے... ہا... ہا... ہا''۔

ڈاکٹر نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

''ڈاکٹر صاحب...... آپ اس کا برا نہیں ماننا صدمے کی وجہ سے یہ پاگل ہو گئی ہے''۔

بابا نے ڈاکٹر سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گویا ہوا۔

'' بابا...... سنا ہے کہ جنگ کے دوران یہاں بہت تباہی ہوئی ہے۔

''ہاں ڈاکٹر صاحب...... یہی بات تو میں آپ کو بتانے والا تھا۔ صرف تباہی نہیں ہوئی اس بھیانک جنگ میں یہاں کچھ بھی نہیں بچا۔ یہ جو چارپائی پر میرا بیٹا لیٹا ہے نا، اس کے دو معصوم بچے پڑوس کے بچوں کے ساتھ باہر کھیل رہے تھے کہ فضا میں اچانک کچھ جہاز نمودار ہوئے اور بستی پر بم گرائے اور باہر کھیل رہے سارے بچوں کو ہلاک کر دیا۔ ہم نے ان کی لاشوں کو اٹھا کر اندر چارپائی پر رکھ دیا، دوسرے لوگوں نے بھی اپنے بچوں کی لاشوں کو اٹھایا۔ معصوم بچوں کی لاشوں کو دیکھ کر میری گھر والی پاگل ہو گئی اور بہو کا رو رو کر بڑا حال ہو گیا نیز سخت بخار میں مبتلا ہو گئی۔ بستی کے لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ بچوں کی تدفین کل کریں گے، لیکن اسی رات فضا میں پھر سے جہازوں کا شور سنائی دیا جنہوں نے بستی پر بے تحاشا بم برسائے۔ بمباری اتنی شدید تھی کہ یہاں کوئی زندہ نہیں بچ نہیں سکا، بچوں کے بعد ہم سب کو بھی مار ڈالا گیا''۔

''اچھا بابا...... پہلے بیمار کو دیکھتے ہیں''۔

''بابا کی جذباتی پر اسرار باتیں سن کر ڈاکٹر خوف و ہراس میں مبتلا ہو گیا اور یہاں سے جلدی جانے کے لئے سوچنے لگا''۔

بابا نے مُنہ سے کچھ نہیں کہا بلکہ ہاتھ کے اشارے سے چارپائی پر لیٹے بیمار کی طرف دکھایا۔

ڈاکٹر نے اس کے مُنہ سے چادر ہٹائی تو یہ دیکھ کر اس کے عقل کے طوطے اڑ گئے کہ اس کا آدھا سر ہی غائب تھا اور سینے پر ایک بہت بڑا سراغ تھا۔

ڈاکٹر نے اس کا نبض دیکھا تو وہ برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

''بابا...... یہ تو مر چکا ہے''۔

''مر چکا ہے...... ہا.... ہا.... ہا.....''۔

بابا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''بابا...... یہ مر چکا ہے اور آپ اس طرح ہنس رہے ہو''۔

''ڈاکٹر صاحب...... ورنہ یہاں زندہ ہی کون ہے، یہاں سب مر چکے ہیں، میں بھی مر چکا ہوں۔ امن اور ترقی کے نام پر ان پتھر دل درندوں نے یہاں سب کو مار ڈالا ہے ...ہا... ہا... ہا.....''۔

بابا کا ایک زور دار طنز سے بھرا قہقہہ فضا میں گونجا جس کے ساتھ ہی ایک بجلی سی چمکی اور چارپائی، اس پر پڑی زخموں سے چھلنی لاش کے ساتھ ساتھ ایک دم سب غائب ہو گیا اور ڈاکٹر اور اس کا معاون جن پر خوف دہیبت کی تھرتھری اور کپکپی چھا گئی بدحواسی کے عالم میں مٹھیاں بند کر کے وہاں سے بھاگنے لگے۔

☆☆☆

سپاری

ریل سے اتر کر ماجد کچھ لمحے ادھر اُدھر کے نظاروں سے لطف اندوز ہو کر خوش و خرم اپنے نئے دفتر کی طرف جانے لگا، اس کی نئی نئی ترقی ہوئی تھی اور نیا عہدہ ملنے کے ساتھ ہی اس کا تبادلہ دوسرے شہر میں ہوا تھا جہاں وہ آج ہی ڈیوٹی جوائین کرنے جا رہا تھا۔

''او مائی گارڈ...... یہ مصیبت یہاں بھی پہنچ گئی ہے''۔

چلتے چلتے دفعتاً ہاتھ میں لاٹھی لئے انسپکٹر شہباز کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے اور مُنہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے۔ اس نے گھبراہٹ کے عالم میں دائیں بائیں دیکھا اور چپ کے سے راستہ بدل کر نکل گیا، کیوں کہ وہ کسی بھی حال میں انسپکٹر کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال جوں توں کر کے وہ انسپکٹر کا سامنا کئے بغیر جب ریلوے سٹیشن سے باہر نکلا تو اس نے اطمینان کی سانس لی اور جلد ہی دفتر پہنچ گیا، جو یہاں سے تھوڑی ہی دوری پر واقع تھا۔

''اس دن تو اقبال ٹوپی والا کی مہربانی سے اس انسپکٹر سے میں بچ گیا تھا، اب اگر پھر سے اس کا سامنا ہو گیا تو کیا ہوگا......؟''

نصف دن تک دفتری معاملات میں اُلجھے رہنے کے بعد فارغ ہو کر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کو انسپکٹر یاد آ گیا اور وہ خود سے بڑبڑاتے ہوئے سوچوں میں گم ہو گیا، سال بھر پہلے کا واقع اذیت بن کر اس کے ذہن کے پردوں پر رقص کرنے لگا......

یہ ماجد کی شادی کا دوسرا ہی دن تھا کہ انسپکٹر شہباز، جو ان دنوں ان ہی کے علاقے میں تعینات تھا، اپنے چند محافظوں سمیت دندناتے ہوئے ان کے آنگن میں آ دھمکا اور ماجد کو ڈھونڈنے لگا۔

''انسپکٹر صاحب......کیا بات ہے؟''

ماجد کی ماں نے انسپکٹر کو غصے میں دیکھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ماجد کے چوروں کے ایک گروہ کے ساتھ روابط ہیں اُسے پوچھ تاچھ کے لئے پولیس سٹیشن لینا ہے''۔

''نہیں صاحب......میرا بیٹا ایسا نہیں ہے''۔

انسپکٹر کی بات سن کر اس کے پیروں تلے زمین شک ہونے لگی لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسا ہے کیا ہے؟ یہ سب پولیس سٹیشن میں پتہ چلے گا، جلدی سے لاؤ اس کو''۔

انسپکٹر نے سگریٹ کو شعلہ دکھا کر دھواں نتھنوں سے چھوڑتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے سر......؟''

اسی لمحے ماجد، جو ساری صورتحال سے بے خبر اپنے خواب گاہ میں فرط مسرت و انبساط میں اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ مستقبل کے خواب سجانے میں مصروف تھا، بھی باہر آیا اور انسپکٹر سے پوچھا۔

''اچھا تو تم ہی ماجد ہو......چلو ہمارے ساتھ''۔

اس نے بارعب لہجے میں کہا۔

''مگر سر......میں نے کیا......؟''

''اے......زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو، کال ریکارڈ سے ہمیں پتہ چلا ہے کہ تمہارے چوروں کے ایک خطرناک گروہ کے ساتھ روابط ہیں جو ڈکیتیوں کے علاوہ کئی قتلوں میں بھی ملوث ہے''۔

''یہ جھوٹ ہے سر، آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے''۔

انسپکٹر کی بات سن ماجد کے پسینے چھوٹنے لگے اور اس نے اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا۔

''ہر مجرم یہی کہتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں......چلو......''۔

انسپکٹر نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''ہم پہ رحم کیجیے صاحب...... میرا بیٹا ایسا نہیں ہے، کل ہی اس کی شادی ہوئی ہے''۔

ممتا کی ماری ماجد کی ماں پہلے لجاجت سے ہاتھ باندھ کر اس کی منتیں کرنے لگی پھر سر کی چادر اس کے قدموں میں ڈال کر گڑگڑانے لگی۔

لیکن انسپکٹر پر اس کی بے بسی کا کچھ اثر نہ ہوا اور وہ ماجد کو گھسیٹتے ہوئے لینے لگا۔ اس کی ماں، نئی نویلی دُلہن اور بہنوں نے رونا شروع کر دیا۔ اس دوران آس پڑوس کی کچھ عورتیں بھی جمع ہوگئیں جنہوں نے شور وغل بلند کر دیا لیکن انسپکٹر کے سنگ و آہن دل میں ذرا سا بھی رحم نہیں پھوٹا، اسنے کسی کی ایک نہیں سنی اور ماجد کو گھسیٹے ہوئے گھر سے باہر سڑک تک لے گیا جہاں ان کی گاڑی تھی۔

''کیا بات ہے انسپکٹر صاحب...... آپ اس کو کہاں لے جا رہے ہو''۔

یہ حاجی اقبال عرف اقبال ٹوپی والا، جو ایک سرمایہ دار اور علاقے کا کھڑ پینچ تھا، کی آواز تھی۔

''اقبال صاحب...... یہ ایک کیس کے سلسلے میں مطلوب ہے اور کچھ پوچھ تاچھ کرنی ہے''۔

''پوچھ تاچھ تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے، یہ بے چارہ تو کل ہی دولہا بنا ہے''۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں''۔

''کیسی مجبوری صاحب...... مرغی کو اپنی جگہ رکھ کر اس کے نیچے سے سارے انڈے نکالنے میں آپ بہت ماہر ہو۔ میں اسے ہرگز لے جانے نہیں دونگا''۔

اقبال ٹوپی والا نے مسکراتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ کہتے ہیں تو چھوڑ دیتا ہوں، لیکن چند دن بعد اس کو تھانے لے کر آجانا''۔

خدا خدا کر کے انسپکٹر کا دل پگھلا اور اس نے متبسم ہونٹوں سے کہتے ہوئے ماجد کو چھوڑ دیا تو اس کی ماں نے روتے روتے اقبال ٹوپی والا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ وقت پر نہیں پہنچتے تو ہم بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے۔ آپ کا یہ

احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی''۔

''نہیں ماں جی...... یہ تو میرا فرض تھا''۔

کہتے ہوئے اقبال اسے ایک طرف لے کر رازدارانہ انداز میں کچھ کہنے لگا، جس کے بعد اندر جا کر اس نے کچھ رقم لا کر اقبال کو تھما دی، کیوں کہ وہ کسی بھی صورت میں ماجد کو تھانے بھیجنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اسی لمحے ان کا پڑوسی خواجہ گل محمد بھی آ گیا اور انسپکٹر کے خلاف اونچی آواز میں واہی تباہی بولنے کے بعد اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔

''زیبا...... اگر ماجد نے چوری ہی کی ہے تو میں پھر بھی انسپکٹر کو آج اسے تھانے لے جانے نہیں دیتا''۔

اس مفلس گھرانے پر بہت دنوں بعد خوشیوں نے دستک دی تھی کافی پاپڑ بیلنے کے بعد دو سال قبل ماجد کو سرکاری نوکری ملی تھی اور نکاح کے بعد اس کی شریک حیات، جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی تھی، کو بھی مقامی سکول میں رہبر تعلیم کے زمرے میں نوکری ملنا طئے تھی۔ ماجد اور اس کے گھر والے اس واقعہ کی وجہ سے کئی دن سخت اذیت میں مبتلا رہے۔ ماجد کی قسمت اچھی تھی کہ اس کی بیوی سمجھدار نکلی ورنہ اس کی زندگی میں بڑا طوفان آ سکتا تھا کیوں کہ نامعلوم دشمنوں نے وقت وقت پر اس شادی میں اڑچنیں پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

''صاحب آپ کی ٹرین کتنے بجے آتی ہے؟''

پریشان سوچوں میں غلطاں و پیچاں ماجد چپراسی کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس کی گھڑی کی طرف دیکھا تو دفتر کا وقت ختم ہو چکا تھا اور دفتر کے دوسرے ملازم بھی جا چکے تھے۔ وہ عجلت میں اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ریلوے سٹیشن پہنچ گیا اور دائیں بائیں نظریں دوڑاتے ہوئے یہ دیکھنے لگا کہ کئی انسپکٹر شہباز تو نہیں ہے، جس سے وہ سخت خوفزدہ تھا......

''ہیلو مسٹر...... صاحب آپ کو بلا رہے ہیں''۔

دفعتاً اس کے شانے پر کسی کا ہاتھ پڑا اور سماعتوں سے آواز ٹکرائی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو پیچھے ایک پولیس کا جوان تھا۔ جسے دیکھتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے اور چہرے

کے جغرافیہ میں ہلچل مچ گئی۔

''کون صاحب......؟''

اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''وہ......''۔

پولیس والے نے انسپکٹر شہباز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو کچھ دوری پر ایک درخت کی چھاؤں میں کرسی پر بیٹھا تھا اور ماجد بادل ناخواستہ ہی خوف کی کیفیت میں من من بھاری قدموں سے اس کی طرف چلنے لگا۔

''سلام صاحب.....''

اس نے مریل سی آواز میں کہا۔سلام کا جواب دیتے ہوئے انسپکٹر نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا کر گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور خیر عافیت دریافت کرنے کے بعد گویا ہوا۔

''ماجد ......میں آپ کے علاقے میں دو سال تک تعینات رہا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ ایک شریف اور بہترین کردار کے مالک انسان ہو۔اس دن کے لئے مجھے معاف کرنا اور ماں جی سے بھی میرے طرف سے معافی مانگنا''۔

''سر......پھر اس دن آپ مجھے گرفتار کرنے کیوں آئے تھے''۔

''بیٹا......وہ اس بدبخت اقبال ٹوپی والا کا بچھایا ہوا جال تھا''۔

'' اقبال ٹوپی والا؟ ...... مگر سر میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟''

ماجد کے تن بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگیں اور اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''بات چھوٹی سی تھی کہ آپ نے اسے اپنی شادی میں مدعو نہیں کیا تھا،لیکن یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ تمہیں بدنام اور بے عزت کرنے کے لئے اسے خواجہ گل محمد نے سپاری دی تھی تاکہ اس شادی کے ٹوٹ جانے کے بعد وہ نوکری اس کے میٹرک پاس لڑکے کو ملے جو میرٹ کے حساب سے تمہاری بیوی کو ملنا طئے تھی''۔

انسپکٹر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

وارث!

’’او مائی گارڈ ......‘‘۔

شام کو دکان بند کرتے وقت غفور کا نسخہ اپنی میز پر دیکھ کر شاکر چونک پڑا، اس کے دل میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ وہ کچھ لمحے تذبذب کی حالت میں دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھتا رہا، پھر جلدی سے دکان بند کر کے غفور کے بارے میں ہی سوچتے ہوئے گھر کی طرف چلا گیا۔ غفور آج دوپہر کو نسخہ لے کر اس کے پاس آیا تھا......۔

’’شاکر بیٹا......خدا کے لئے مجھے دوائی کی ایک دو ٹکیا دے دو، بلڈ پریشر سے میرا سر گھوم رہا ہے......‘‘۔

نسخہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے وہ انتہائی لجاجت سے ہاتھ باندھ کر مریل سے لہجے میں منتیں کر رہا تھا۔

’’چل دفع ہو جاؤ یہاں سے ......کیوں دھندا خراب کرتا ہے.....ڈراما باز کئی کا......‘‘۔

دوا فروش شاکر، جو گاہکوں کے ساتھ مصروف تھا، نے تنگ آکر اس کو کرخت لہجے میں دھتکارتے ہوئے کہا۔ شاکر کی دھتکار سے غفور کا بلڈ پریشر اور بڑھ گیا، آنکھیں بھر آئیں اور وہ سخت بے دلی اور مایوسی کی حالت میں واپس پاس ہی واقع اپنی جھونپڑی ی کی طرف چلا گیا۔ وہ اکثر خالی ہاتھ آکر ایسے ہی منتیں کرتے ہوئے شاکر سے دوائیاں مانگتا تھا جو اس کو اکثر ٹوکتا بھی تھا، لیکن آخر ترس کھا کر دوائیاں بھی دیتا تھا لیکن نہ جانے کیوں آج وہ

خلاف توقع غفور پر ایسے برس پڑا کہ وہ برداشت نہیں کر پایا۔

معمولی جھونپڑی میں رہنے والا غفور گاؤں کے ایک بڑے سرمایہ دار خواجہ لالہ جُو کا اکلوتا بیٹا تھا، جو کبھی عالی شان بنگلے کا مکین تھا اور جس کا بچپن بڑے ہی نازنخروں اور عیش عشرت میں گزرا تھا۔ اس کے والدین اس کو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ جس چیز کی بھی فرمائش کرتا تھا چٹکیوں میں پوری کر دیتے تھے۔ اس کی ماں اس کو چاندی میں پالتی تھی، سجا سنوار کر خود سکول تک چھوڑنے جاتی تھی اور واپس آنے تک بے چینی سے اس کی راہ تکتی رہتی تھی۔ وہ ذہین بھی تھا اور خوب دل لگا کر پڑھائی بھی کرتا تھا سو ہر سال اچھے نمبرات لے کر پاس ہو جاتا تھا، یوں اس کی زندگی بڑے ہی عیش و آرام اور عزت سے گزر رہی تھی۔ لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا، ابھی وہ دسویں جماعت میں ہی زیر تعلیم تھا کہ اس کی ماں، جس نے اپنے لال کے بارے میں بڑے بڑے خواب سجائے تھے، چند دن بیمار رہ کر اللہ کو پیاری ہوگئی۔ ماں جیسے شاندار سائبان سے محروم ہونے کے بعد باپ نے اس کی طرف زیادہ دھیان دیتے ہوئے اس کے ناز اٹھانا شروع کئے اور ماں کی کمی کو زیادہ محسوس نہیں ہونے دیا، یوں اس کی زندگی دوبارہ پٹری پر لوٹ آئی۔ اس کے باپ کی خوشیوں کا تب کوئی ٹھکانہ نہیں رہا جب اس نے اچھے نمبرات سے دسویں کا امتحان پاس کر کے اس کی عزت بڑھا دی...... لیکن اس کے بعد ہی اس کی زندگی کا کٹھن سفر شروع ہو گیا۔ ہوا یوں کہ اس کے باپ نے اپنے یار دوستوں کے مشورے پر اپنے سے دس پندرہ سال کم عمر کی ایک خوب رو خاتون سے دوسری شادی رچائی۔ حالانکہ باپ کے اس قدم پر غفور بھی کافی خوش ہوا، کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ نئی ماں بھی اس کی اپنی ماں کی طرح ہی اس کے ناز اٹھائے گی لیکن برعکس اس کے اس محترمہ نے چند ماہ بعد ہی اپنے تیور دکھانا شروع کر دئے۔ وہ نہ صرف بات بات پر غفور کو ٹوکتی اور ذلیل کرتی تھی بلکہ اپنے شوہر کے کان بھر کے اس کو بھی اس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرتی تھی، جس کے سبب باپ نے بھی بات بات پر اس کی بے عزتی کرنی شروع کر دی۔ اس طرح کورے کاغذ کی مانند غفور سخت ذہنی تناؤ میں مبتلا ہو کر پڑھائی تک بھول گیا اور اپنے غم غلط کرنے کے لئے غلط صحبتوں کا شکار ہو کر آوارہ گردی کرنے لگا۔ غفور

کے اس رویے سے سخت ناراض ہو کر اس کا باپ، جو اس کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا تھا، اور زیادہ بھڑک اٹھا اور تیش میں آ کر اس کو پڑھائی سے اٹھا کر گھر میں بٹھا دیا۔ اب اچانک اس کی سوتیلی ماں نے بھی اپنے رویے میں قدرے تبدیلی لا کر اس کو اپنانا شروع کر دیا اور بڑی ہی فنکاری سے اس کو ایک نوکر کی طرح گھر کے کاموں میں اُلجھا کے رکھ دیا۔ وہ صبح سے شام تک گھر کے کاموں جیسے برتن مانجھنا، کپڑے دھونا، پانی بھرنا، گھر کی صفائی وغیرہ میں مصروف رہتا تھا اور بدلے میں اس کو دو وقت کی روٹی میسر ہوتی تھی۔ وقت کا پنچھی تیزی سے اپنا سفر طئے کرتا رہا۔ نئی ماں نے وقفے وقفے سے دو بیٹوں کو جنم دے کر غفور کی مصروفیات میں اور اضافہ کر دیا۔ ان کو جھولا جھلانا، ان کے کپڑے دھونا، ڈائپر تبدیل کرنا اور فرست کے اوقات ان کو گودی میں اٹھا کر کھلانا بھی اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہو گیا۔ جس کے بدلے میں ماں کبھی کبھی اس کو پیار کے دو بولوں سے نوازتی تھی۔ لیکن وہ دونوں جونہی چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو ماں کے رویے میں پھر سے تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ اب وہ پھر سے غفور کو بے عزت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے باپ کو بھی اس کے خلاف بھڑکانے لگی۔

گھر میں آئے روز لڑائی جھگڑے ہونے لگے اور بے چارہ غفور باپ کے ہاتھوں بری طرح پٹتا رہا۔ غفور، جو اب بالغ ہو چکا تھا، اپنے باپ کو اس کے کڑیل روئے اور اپنی بے گناہی کے بارے میں بتانے کی پوری کوشش کرتا تھا، لیکن بری طرح سے جوان بیوی کے زُلفوں کا اسیر باپ اس کی ایک بھی نہیں سنتا تھا اور شفقت پدری کو بھول کر آئے روز اس کو تشدد کا نشانہ بناتا تھا۔ اس طرح اپنے ہی گھر میں غفور کی زندگی ایک جہنم بن کر رہ گئی۔ غفور بھی یہ ظلم کب تک سہتا آخر ایک دن دل برداشتہ ہو کر گھر چھوڑ کر بھاگ گیا اور در در بھٹکنے لگا۔ اب وہ پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر دن کو ادھر اُدھر مزدوری کر کے رات کسی مسجد، فٹ پاتھ یا کسی پڑوسی یا رشتہ دار کے ہاں گزارتا تھا۔ کئی برسوں بعد اس نے اپنے باپ، جس کے پاس کئی تعمیرات کے ساتھ ساتھ درجنوں ایکڑ اراضی تھی، سے پراپرٹی میں اپنے حصے کا تکازا کیا لیکن اس نے پہلے کچھ بھی دینے سے صاف انکار کر دیا لیکن آخر محلے کے بزرگوں کی مداخلت کے بعد بڑی مشکل سے اپنے بنگلے کے متصل چند مرلے زمین دینے پر راضی ہو گیا

-

''غفور...... فلحال تو اس زمین پر اپنے لئے ٹھکانہ تعمیر کرلو اور شادی کر کے گھر بساؤ تیرے حصے کی پراپرٹی کئی نہیں جائے گی''۔

محلے کے ایک بزرگ نے غفور کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا۔کئی برسوں بعد غفور نے بھی اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے جوں توں کر کے دو کمروں پر مشتمل جھونپڑی تعمیر کی اور اس میں رہنے لگا۔ان ہی دنوں اس کا باپ بھی اس دنیا سے چل بسا۔کئی سالوں بعد اس نے ایک غریب طلاق شدہ خاتون سے شادی کر دی اور سوتیلے بھائیوں سے باپ کی جائیداد سے اپنے حصے کا تکازا کرنے لگا،لیکن اس دوران جب اس پر یہ راز کھلا کہ اس کے باپ نے اپنی ساری جائیداد اپنی دوسری بیوی کے نام کر دی ہے تو وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح خاموش بیٹھ گیا۔لیکن تب بھی دکھوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا،شادی کے دو سال بعد ہی اس کی بیوی اس کو چھوڑ کر چلی گئی۔اُس دن بھی غفور نے بہت ہاتھ پیر مارے،سوتیلے بھائیوں سے لے کر محلے کے سارے آسودہ حال گھرانوں سے مدد کی بھیک مانگی،لیکن کسی نے بھی اس کی مدد نہیں کی، یہاں تک کہ اس کی دردزہ میں مبتلا جوان بیوی اسپتال نہ پہنچ پانے کی وجہ سے گھر میں ہی، پیٹ میں پل رہے بچے سمیت،تڑپ تڑپ کر موت کا نوالا بن گئی اور وہ یک وتنہا ہو کر کسم پرسی کی حالت میں زندگی کے دن کاٹنے پر مجبور ہو گیا۔انتہائی بے کسی کی حالت میں جوان بیوی اور ہونے والے بچے کی موت کی وجہ سے غم میں ڈوبا غفور کئی مہینوں سے بیمار رہنے کے سبب کام کاج سے معذور ہو کر پائی پائی کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا، اب اکثر اس کا چولہا بھی ٹھنڈا ہی رہتا تھا۔بار بار کے فاقوں اور علاج نہ ملنے کی وجہ سے وہ سخت کمزور ہو کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ کر بستر پر دراز ہو کر رہ گیا تھا۔آج وہ کئی دنوں بعد بڑی مشکل سے گھر سے نکل کر شاکر کے پاس گیا تھا۔

رات بھر شاکر غفور کے بارے میں ہی سوچتے ہوئے سخت اذیت میں مبتلا رہا اور صبح جلدی تیار ہو کر دکان کے لئے چل نکلا لیکن شومئی قسمت کہ اچانک حالات بگڑنے ،کرفیو اور بندشوں کے سبب وہ سخت کوشش کے باوجود دکان پر نہیں جاسکا۔تیسرے دن جب وہ

دکان پر آیا تو اس کو یقین تھا کی غفور دوائی کی ٹکیا مانگنے ضرور آئے گا، لیکن وہ نہیں آیا یہاں تک کہ دو پہر بھی ڈھل گئی اور شاکر، جس کے دل پر ایک بھاری بوجھ سا تھا، جھنجھلا کر دوائیاں لے کر اس کے جھونپڑی کی طرف گیا۔ جھونپڑی کے پاس ہی واقع اس کے سوتیلے بھائیوں کے بنگلے میں بڑے ہی دھوم دھام سے کوئی تقریب چل رہی تھی اور صحن میں لگے شامیانے میں مہمان دعوت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شاکر نے رک کر غفور کے باپت اس کے بھائی سے دریافت کیا۔

''پتا نہیں کہاں گیا ہے؟''

اس نے ناگواری کے انداز میں جواب دیا۔ شاکر نے آگے بڑھ کر جھونپڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ پریشانی کی حالت میں اس نے غفور کے بھائی کو بلایا، اس دوران محلے کے کچھ لوگ بھی آ گئے اور وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے جہاں غفور بے حس و حرکت اوندھے مُنہ پڑا تھا...... کچھ دیر میں ہی جھونپڑی کے صحن میں بہت لوگ جمع ہو کر مختلف چہ میگوئیاں کرنے لگے لیکن غفور کی موت پر، اس کے مردہ جسم پر بھنبھنا رہیں بے شمار مکھیوں کے سوا، ماتم کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

''تم بازار جا کر غفور کے لئے اچھا سا کفن خرید لاؤ اور کچھ مزدور لے کر اس کے لئے قبر تیار کراؤ۔ آخر یہ ہمارا پڑوسی ہے اور ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم بہترین طریقے سے اس کی آخری رسومات انجام دیں''۔

محلّہ کمیٹی کے صدر نے کچھ لڑکوں کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا۔

''نہیں حاجی صاحب...... غفور کوئی لاوارث نہیں بلکہ ہمارا بھائی ہے اس کے کفن دفن کے سارے انتظامات ہم خود کرینگے۔

اس کے سوتیلے بھائی نے جھونپڑی پر ایک شاطرانہ نظر دوڑاتے ہوئے اونچے لہجے میں کہا''۔

☆☆☆

عدالت

''ڈاکٹر صاحب......کچھ دنوں سے میرے انگ انگ سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی ہیں، علاج معالجہ اور بہت سی دوائیاں لینے کے بعد بھی کوئی افاقہ نہیں ہورہا ہے......''۔

مریض نے ادویات سے بھرا لفافہ ڈاکٹر کے سامنے رکھتے ہوئے بے بسی کے انداز میں فریاد کرتے ہوئے کہا۔

''گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ یہ دوائیاں لے لیجئے کچھ دنوں میں آپ بالکل ٹھیک ہوجائینگے''۔

ڈاکٹر نے اس کا طبعی ملاحظہ کرنے کے بعد نسخہ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا اور دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہوا۔

اسی لمحہ کلینک کے سامنے نئے فیشن کی ایک کوری چماچم پرکشش گاڑی رک گئی، جسے دیکھ کر ڈاکٹر کی آنکھیں چوندھیا سی گئی۔اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب اس نے سلیم کو گاڑی سے باہر آتے ہوئے دیکھا، جو بڑی ادا سے فلمی ہیرو کی طرح چابی انگلی میں گھماتے ہوئے کلینک کے اندر داخل ہوا۔ڈاکٹر نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا اور مریضوں سے فارغ ہوکر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کہیے مسٹر سلیم......آج کیسے یہاں کا راستہ بھول آئے۔ بڑی زبردست گاڑی خریدی ہے آپ نے''۔

''ڈاکٹر صاحب......یہ گاڑی تو آپ کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہے، یہ لیجئے

آپ ہی رکھ لیجئے''۔

سلیم نے چابی اس کے سامنے رکھتے ہوئے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں کہا۔

''شکریہ سلیم......''۔

ڈاکٹر، جس کو دل ہی دل میں سلیم پر رشک آرہا تھا، مذاق سمجھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگا تو سلیم اس کی بات کاٹ کر سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا۔

''ہاں ڈاکٹر صاحب......آپ یوں اس گاڑی کے مالک بن سکتے ہیں، چٹکیوں میں''۔

''سلیم......تم کو بھی کیسا مذاق سوجھا ہے، اتنی قیمتی گاڑی بھلا میری کیسے ہوسکتی ہے؟''

''ہوسکتی ہے جناب، بالکل ہوسکتی ہے......''۔

کہتے ہوئے سلیم ڈاکٹر کے قریب جاکر رازدارانہ انداز میں بغیر کسی وقفے اپنی زبان چلانے لگا......ڈاکٹر بھی سنجیدہ ہوکر اس کو سنتا رہا۔

''ڈاکٹر صاحب......ہے ناپتے کی بات، آم کے آم گھٹلیوں کے دام''۔

کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد مطمئن ہوکر سلیم فخریہ انداز میں کہتے ہوئے جانے کے لئے اٹھا تو ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلا کر گویا اپنی رضامندی کا اقرار کرلیا۔

''اینی وے......فلحال آپ یہ گاڑی رکھ لیجئے، میں چلتا ہوں''۔

سلیم، جو خوش آمد اور چاپلوسی میں یدطولیٰ رکھتا تھا، نے دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ ڈاکٹر کو پوری طرح قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ سلیم کی اس دلفریب ادا سے ڈاکٹر کچھ دیر کے لئے سخت تذبذب میں مبتلا ہوکر گہری سوچوں میں ڈوب گیا۔ حرص کی بٹی اس کے اندر شعلے بن کر سلگنے لگی۔ اس کے چہرے بشرے سے سلیم کو یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ ڈاکٹر اس کی اداکاری کے جالے میں مکڑی کی طرح فٹ ہوگیا۔

''سلیم صاحب......گاڑی آپ فلحال ساتھ ہی لے جایئے میں اس ڈیل کے بارے میں سوچوں گا اور کل ہم اس کو ضرور فائینل کرینگے''۔

نہ جانے کیا سوچتے ہوئے اس نے چابی سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب......گھوڑے کو دریا تک تو لیا جا سکتا ہے لیکن پانی پینے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ان کاغذات کو غور سے دیکھ لینا، میں کل پھر حاضر ہو جاؤنگا، خدا حافظ''۔

سلیم نے جیب سے کچھ کاغذات نکال کر ڈاکٹر کو دیتے ہوئے کہا اور چلا گیا۔

سلیم کئی سال تک ڈاکٹر ریاض کے دوائیوں کے دکان پر سیلز مین کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ بعدازاں اس نے اپنی دکان کھولی اور کچھ عرصہ بعد ہی ادویات کی ہول سیل تجارت شروع کردی۔ اب اس کا نام شہر کے بڑے بڑے نامی تاجروں میں شمار ہوتا ہے ،جس کے پاس عالی شان بنگلہ اور دفتر ،نوکر چاکر ،ٹھاٹھ باٹھ ،غرض عیش و آرام کا ہر سامان موجود ہے۔ ڈاکٹر سوچوں کی بھول بھلیوں میں کھو کر قلم سے سر کھجاتے ہوئے کلینک کے سامنے پارک کی ہوئی اپنی پرانی ماڈل کی کھٹارہ گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ کھیل تماشہ......آنکھوں کا دھوکہ.....رہے نام بس اللہ کا......اللہ ہو......''۔

دفعتاً سُلہ نامی دیوانہ، جو ایک فقیر تھا اپنے مخصوص انداز میں ان الفاظ کا ورد کرتے کلینک میں داخل ہو گیا تو وہ سوچوں کے خول باہر آیا۔ دن بھر مریضوں کو دیکھتے دیکھتے ڈاکٹر کے دل و دماغ میں عجیب سی ہل چل مچی رہی تھی۔ شام کو وہ گھر پہنچ کر حسین خوابوں کے تانے بانے بنتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا، لیکن نیند نے جیسے نہ آنے کی قسم کھائی تھی۔ رات بھر وہ میٹھے خوابوں کے اڑن کھٹولے پر سوار ہو کر آسمانوں کی سیر کرتا رہا اور صبح جلدی اٹھ کر نیا سوٹ بوٹ اور نکٹائی زیب تن کئے فرط نشاط و انبساط میں جھومتے ہوئے کلینک پہنچ گیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک تھی کیوں کہ آٹھ لاکھ کی گاڑی کا مالک بننے کے فراق میں وہ اپنے دل کی منڈھیر سے رحم کے سارے پرندوں کو آزاد کر کے سلیم کے ساتھ ڈھیل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ کرسی پر براجمان ہوتے ہی سلیم کے دئے ہوئے کاغذات دیکھنے لگا۔ کچھ لمحوں بعد ایک خاتوں اپنی معصوم بچی، جس کی شکل و صورت بالکل ڈاکٹر کی بچی سے ملتی تھی، کو

لے کر اندر داخل ہوگئی۔

''اب کیسی حالت ہے بچی کی؟''

''شکر اللہ کا.....اب بہت حد تک سدھر گئی ہے......''۔

''ٹھیک ہے ......اس کے کچھ ٹیسٹ کرانے ہیں اور میں کچھ نئی دوائیاں لکھ دیتا ہوں آج کے بعد وہی کھلانا''۔

ڈاکٹر نے عجلت میں کہتے ہوئے قلم اٹھا کر لکھنا شروع کر دیا۔

''رک جاؤ ڈاکٹر......''۔

اس کی سماعت سے ایک چیخ سی ٹکرائی۔اس نے قلم روک کر دائیں بائیں دیکھا تو بچی اور اس کی ماں کے سوا کوئی نہیں تھا۔آواز کو وہم سمجھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی اور اس نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔

''یہ کیا کرنے جا رہے ہو ڈاکٹر......مردخوری کے نیلام گھر میں بک گئے کیا؟''

''کون ہو تم......؟''

ڈاکٹر سخت لہجے میں گرجا،اس کے ماتھے پر پسینے کی سرد بوندیں نمودار ہوگئیں۔

''ڈاکٹر صاحب......آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں......طبیعت ٹھیک تو ہے نا؟''

خاتون نے ڈاکٹر کی بوکھلاہٹ دیکھ کر پوچھ لیا۔

''میں......میں ٹھیک ہوں......آپ باہر جا کر بیٹھیں،میں کچھ دیر بعد بلاؤ نگا''۔

ڈاکٹر خود پر قابو پاتے ہوئے کھسیانے سے انداز میں بولا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر آنکھیں بند کر کے آرام دہ کرسی کے ساتھ ٹیک لگائی......

''آڈر...آڈر...تمام گواہوں اور ثبوتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ عدالت ڈاکٹر ریاض کو مجرم قرار دے کر سزائے موت سناتی ہے''۔

''یہ جھوٹ ہے یور آنر،میں نے کچھ نہیں کیا ہے،میں بے قصور ہوں......''۔

جج نے بھری عدالت میں فیصلہ سنایا تو کٹہرے میں کھڑے ڈاکٹر،جس کے

سامنے کفن میں لپٹی بے بس انسانوں کی لاشیں اس کے جرم کی چغلی کھا رہی تھی، بیوہ عورت کی طرح رونے چلانے لگا۔

''تم زندہ ہی کہاں ہو ڈاڈاکٹر جو اپنی موت پر چلاتے ہو......تمہاری موت تو کب کی ہو چکی ہے''۔

ڈاکٹر کے سامنے ایک سایہ نمودار ہو کر ہنستے ہوئے ڈاکٹر پر طنز کرنے لگا......

''کون ہو تم؟''

''ہا... ہا... ہا... مجھے نہیں پہچانا......''۔

''تو......تو......کیا غلط کیا ہے میں نے؟''

ڈاکٹر جھنجھلا کر ہڑبڑانے لگا۔

''ڈاکٹر......تم طبیب کی ایپرن پہن کر گورکن ہو......گورکن۔ غریب بے سہارا مریض ہل کا بیل فروخت کر کے، اپنی بیویوں کے زیور گروی رکھ کر، اپنے ارمانوں کو نیلام کر کے بڑی امیدیں لے کر تمہارے پاس آتے ہیں۔ تم ان ہی سادہ لوح بے وسیلہ مریضوں کی زندگیوں سے کھیل کر اپنے خوابوں کے محل تعمیر کرنا چاہتے ہو۔

''بس......بس......بس......''۔

کٹہرے میں کھڑا ڈاکٹر کھری کھری سن کر ماہی بے آب کی طرح تڑپ اٹھا اور اسی لمحے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اوپر سے نیچے تک پسینے سے شرابور ہو چکا تھا، اس کا سر چکرانے اور بدن کانپنے لگا۔ اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر گھٹا گھٹ پی لیا اور رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگا......دفعتاً ہوا کا ایک لطیف سا جھونکا ڈاکٹر کو چھو کر گیا۔

''علاج معالجہ اور بہت سی ادویات لینے کے باوجود کوئی افاقہ نہیں ہو رہا ہے''۔

مریض کے یہ الفاظ بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندنے لگے۔

''آئی ایم سوری یور آنر......''۔

سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ڈاکٹر نے اپنے دونوں کان پکڑے ہوئے خود کلامی

کرتے ہوئے سلیم کے دئے ہوئے کاغذ ایک طرف پھینک دئے اور ایک بڑے بوجھ سے آزاد ہوکر ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے اطمینان سے مریضوں کا علاج کرنے میں محو ہو گیا۔

کچھ دیر بعد سلیم کلینک کے سامنے گاڑی کھڑا کر کے فاتحانہ انداز میں لہراتا گنگناتا بے اعتنائی سے اندر داخل ہوکر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''یہ لیجئے سلیم ...... مجھے یہ ڈیل منظور نہیں''۔

ڈاکٹر نے ایک پل ضائع کئے بغیر اس کے دئے ہوئے کاغذ، جن میں اس کی سکیم کے تفصیلات درج تھیں، اس کو لوٹاتے ہوئے اس کی سنہری پیش کش کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ ڈاکٹر صاحب......؟''

ڈاکٹر کی بات سن کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''میں ٹھیک کہتا ہوں...... مجھے اس گاڑی یا کسی تحفے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

''ڈاکٹر صاحب ......آپ ٹھنڈے دماغ سے سوچئے، قسمت آپ کے در پہ دستک دے رہی ہے اور آپ کے تقدیر کے ستارے چمکنے والے ہیں''۔

میں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلیا ہے۔

''ڈاکٹر صاحب...... یہ دوائیاں تو......''۔

''یہ دوائیاں نقلی ہیں...... دوا کے نام پر زہر ہے یہ...... زہر......''۔

ڈاکٹر، جس کے جسم کا سارا خون چہرے پر سمٹ آیا، نے اس کی بات کاٹ کر کرخت لہجے میں کہا۔ اور سلیم اپنا سا منہ لے کر ہارے ہوئے جواری کی طرح وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆

جنگلی آدم

''بابا...... یہ کون سی ذات کے جانور ہیں، میں نے پہلے کبھی انہیں اس جنگل میں نہیں دیکھا ہے''۔

جنگلی جانور کے بچے نے گھپا کے سامنے سے چند آدمیوں کو گزرتے ہوئے دیکھ کر اپنے دادا سے پوچھا۔

''ہششش......''۔

دادا، آدمیوں کو دیکھ کر جس کے کان سرخ ہو گئے، نے انگلی کے اشارے اسے چپ رہنے کو کہا، وہ خاموش ہو کر تب تک ان آدمیوں کو دیکھتا رہا جب تک نہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

''بابا...... تم نے مجھے خاموش رہنے کو کیوں کہا؟ یہ جانور کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟''

''بچہ...... یہ جانور نہیں بلکہ اس سنسار کے سردار آدم زاد ہیں اور یہ جنگلوں میں نہیں بلکہ شہروں اور دیہاتوں میں رہتے ہیں''۔

''سردار...... آدم زاد...... بچے کی سمجھ میں بات بالکل نہیں آئی''۔

''بابا...... سردار تو شیر چاچا ہوتا ہے پھر......؟ اور یہ شہر اور دیہات......''۔

''بچہ...... شیر تو ہمارے جنگل کا سردار ہوتا ہے، یہ آدم زاد سارے دنیا پر راج کرتے ہیں۔ ہمارے جنگل سے دور جن بستیوں میں رات کو ٹمٹماتی روشنیاں دکھائی دیتی ہیں،

یہ وہیں رہتے ہیں ان ہی جگہوں کو شہر کہتے ہیں، لیکن تم ان بستیوں کی طرف جانے کی غلطی ہر گز نہیں کرنا اور جب بھی کبھی جنگل میں آدم زاد نظر آئیں تو ان سے دور رہنا''۔

بابا نے بچے کو نصیحت کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''وہ کیوں......؟''

بچے نے معصومیت سے پوچھا۔

''کیوں کہ...... تجھے جو بولا وہ کرو''۔

بابا نے کڑک لہجے میں کہہ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ آدم کی مشابہت کا وہ بے لباس بوڑھا جنگلی جانور جس کے جسم پر لباس کے بدلے لمبے لمبے بال تھے سینکڑوں سالوں سے اسی جنگل میں رہتا تھا، اس کا اپنا بڑا اور خوشحال کنبہ تھا جو محض جنگلی پھلوں اور سبزیوں پر گزارہ کرتا تھا، غاروں اور گھپاؤں میں رہتا تھا۔ دو ٹانگوں پر چلنے والے جنگلی جانورروں کی وہ واحد ذات تھی جو کم وبیش انسانوں کی طرح بولتے بھی تھے۔ اس بنا پر سارے جنگلی جانور اس کنبے کا احترام کرتے تھے۔ قوی اور طاقت ور ہونے کے باوجود اس کنبے سے تعلق رکھنے والے جانور کبھی کسی کمزور جانور کو نقصان یا تقلیف نہیں پہنچاتے تھے بلکہ ایسا کرنا گناہ سمجھتے تھے اور اپنی نسلوں کو بھی یہی تربیت دیتے تھے۔ بوڑھا جنگلی جانور شہروں اور قصبوں میں رہ رہے آدم زاد کی کرتوتوں سے اچھی طرح واقف تھا اور جانتا تھا کی آدم زاد حرص ولالچ کے کیچڑ میں اس قدر لتھڑا ہوا ہے کہ اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے اپنے ہی نسل کا صفایا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ کچھ دیر سوچوں میں گم رہنے کے بعد بابا غذا کی تلاش کے لئے نکلا اور اس کا پوتا ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر انسانوں کی بستی کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گہرے سوچوں میں ڈوب گیا۔

''آخر یہ ہماری شکل وصورت والی کون سی ذات ہے، دیکھنے میں تو بڑے اچھے لگتے ہیں لیکن بابا ان سے کیوں اتنا ڈر رہے ہیں؟''

اس کے ذہن میں کئی سوالات کلبلانے لگے۔ کافی دیر تک بستی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچوں میں کھوئے رہنے کے بعد اچانک نہ جانے اس کے سوچ کے ظلمت کدے

میں کون سا نیا روشن دان کھل گیا کہ وہ مطمعن ہو کر اپنی گھپا میں چلا گیا اور کچھ جنگلی پھل کھا کر ستانے بیٹھ گیا۔ اب وہ روز طفلانہ انداز میں گھنٹوں ٹیلے پر بیٹھ کر ہنستے مسکراتے بستی کی طرف دیکھتا رہتا تھا، وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا۔

ایک دن شام کو حسب معمول بوڑھے جنگلی جانور کے کنبے کے سارے جانور گپھا میں آ گئے لیکن اس کا پوتا نہیں آیا۔ کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی جب وہ نہیں آیا تو وہ اس کی تلاش میں نکلا اور سارا جنگل چھان مارا لیکن اس کا کئی اتہ پتہ نہیں ملا، وہ تھکا ہارا اپنا ریزہ ریزہ وجود لئے من من بھاری قدموں سے واپس آیا اور پریشانی کی حالت میں گپھا میں بیٹھ گیا۔ گپھا میں ماتم کا سماں تھا، کنبے کے سارے جانور اور دوسرے پڑوسی جانور بھی اس کے غائب ہونے پر سخت پریشان تھے، کیوں کہ اس کا باپ سولہ سال پہلے جب اس بچے کی عمر صرف ایک سال تھی، بھی اسی طرح غائیب ہو گیا تھا......اور دوسرے دن انسانی بستی کے نزدیک اس کی لاش ملی تھی۔ آدھی رات کے بعد اچانک بچے کے کراہنے کی آوازیں آنے لگیں جنہیں سنتے ہی بابا تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گپھا سے باہر گیا، جس کے پیچھے ان کے گھر کے دوسرے جانور بھی گئے۔ کچھ دور انہوں نے دیکھا کہ بچہ زخموں سے چور خون میں لت پت پڑا ہوا درد سے کراہ رہا تھا، اس پر خوف ہیبت کی تھرتھری اور کبھی چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں سے موٹے موٹے آنسوں نکل رہے تھے، جب کہ شیر اس کے پاس خشم ناک نگاہوں سے بستی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بچے کی یہ حالت دیکھ کر بابا کے دل پر چھریاں چلنے لگیں۔ انہوں نے بچے کو اٹھایا اور گپھا میں لے گئے جب کہ شیر غصے کی حالت میں اپنی گپھا میں چلا گیا۔ بابا نے اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی اور کچھ جنگلی جڑی بوٹیاں کھلائی جسے اس کو کچھ افاقہ ہوا اور اس کو آرام آ گیا۔

"بچہ ہمارے اس خوب صورت جنگل میں لڑائیاں جھگڑے تو ہوتے نہیں اور نہ ہی ہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے ہیں پھر تمہاری یہ حالت کس نے بنائی؟"

صبح جب بچہ بیدار ہو گیا تو بابا نے اسے پیار سے پوچھ لیا۔ اس نے پہلے کوئی جواب نہیں دیا لیکن آخر بول پڑا۔

''بابا...... میں کل بڑے شوق سے بستی کی طرف گیا تھا تاکہ وہاں رہ رہے آدم زاد سے دوستی کرلوں، لیکن مجھے دیکھتے ہی درجنوں آدم زاد جنگلی آدم... جنگلی آدم... چلاتے ہوئے قہر بن کر مجھ پر ٹوٹ پڑے اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کر نکل تو گیا لیکن کچھ دور چل کر بے ہوش ہو کر گر پڑا، پھر شیر چاچا مجھے وہاں سے اٹھا کر لے آیا''۔

''بچہ...... میں نے تجھے کہا تھا کہ وہاں جانے کی غلطی ہر گز نہیں کرنا...... تو خوب صورت لباسوں میں چھپے ان بے رحم وحشیوں کی اصلیت نہیں جانتا ہے۔ وہ جنگلوں اور جنگلی مخلوق کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں اور شوق سے ہمارا شکار کرتے ہیں.....''۔

''بابا...... مجھے بستی کے آدم بہت اچھے لگے تھے اسی لئے چلا گیا۔ حالانکہ ان کا رویہ دیکھ کر مجھے ان سے سخت نفرت ہوگئی اور اگر میں چاہتا تو میں کئی آمیوں کو مار سکتا تھا لیکن میں نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا''۔

بچے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں بچہ...... تم نے ٹھیک کیا ایسا کرنا بھی نہیں چاہئے۔ ویسے بھی یہ لوگ بغض عناد اور اپنی خود غرضیوں کی بنا خود ہی ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں''۔

''کیا.....؟''

بچہ یہ سن کر حیرت زدہ ہوگیا۔

''ہاں بچہ...... دنیا میں کسی جانور یا دوسری مخلوق نے انسان کا اتنا خون نہیں بہایا ہے جتنا کہ انسان نے خود بہایا ہے''۔

''مگر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ایک دوسرے کو کیوں مارتے ہیں؟''

''بیٹا...... مالک نے انہیں سارے مخلوقات سے افضل بنایا تھا لیکن مالک کی نا فرمانی اور اپنے کالے کرتوتوں کی وجہ سے وہ یہ مقام کھو چکے ہیں۔ انسانیت اور محبت کی تعلیم کو بھول کر اور اپنی انا کو تسکین پہنچانے کے لئے ایک دوسرے کو لڑائیوں میں مارتے ہیں، جنگوں میں مارتے ہیں، رشتوں میں مارتے ہیں، نفرتوں سے مارتے ہیں، محبت کے نام پر مارتے ہیں، دشمنی میں مارتے ہیں، دھوکہ دہی سے مارتے ہیں، غرض یہ انسان کائینات کی

واحد مخلوق ہے جو اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے مختلف بہانوں سے اپنے ہی نسل کا خون بہانے میں فخر محسوس کرتی ہے۔

بابا......وہ مجھے جنگلی آدم... جنگلی آدم... کہہ کر کیوں پکار رہے تھے؟''

''یہ وحشی آدم زاد خود کو ترقی یافتہ، عقل مند چالاک جب کہ دوسری مخلوقات کو بے کار سمجھتے ہیں رہی بات ہماری تو ہماری اور ان کی مشابہت ایک جیسی ہے لیکن ہمارے حصے میں جنگل آئے اسی لئے یہ اپنی سیاہ کاریوں کو بھول کر اپنے گریبانوں میں جھانکے بغیر ہمیں وحشی سمجھ کر جنگلی آدم کہتے ہیں''۔

☆☆☆

علی بابا!

فاطمہ نماز فجر سے فارغ ہو کر تلاوت کلام پاک میں مصروف تھی کہ دروازے پر دستک سن کر وہ گھبرا سی گئی۔

''یا اللہ۔۔۔۔۔۔۔خیر کرنا۔۔۔۔۔۔۔اتنی صبح صبح کون ہو سکتا ہے؟''

خود کلامی کرتے ہوئے وہ اٹھی اور دروازہ کھولا، باہر محمد جلیل کا بیٹا شارق کھڑا تھا۔

''فاطمہ آپا۔۔۔۔۔۔۔ پاپا کی حالت بہت خراب ہے اور مرنے سے پہلے وہ ایک بار آپ سے ملنا چاہتا ہے''۔

اس نے بغیر کسی تمہید کے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مرے اس کے دشمن، تم کیوں اتنے گھبرائے ہوئے ہو، اندر آ کر چائے پی لو پھر جائیں گے''۔

''نہیں آپا۔۔۔۔۔۔۔اتنا وقت نہیں ہے۔آپ جلدی چلیں تا کہ اس کی آخری تمنا پوری ہو جائے''۔

کہتے ہوئے شارق کی آنکھیں نم ہوئیں۔

''اچھا بیٹا۔۔۔۔۔۔۔تم دو منٹ رکو۔۔۔۔۔۔۔''

کہہ کر وہ اندر گئی، پیرہن زیب تن کیا اور گھر والوں سے کہہ کر پریشانی کی حالت میں شارق کے ساتھ چلی گئی۔وہ جلیل کی بے حد احسان مند تھی۔یوں سمجھو کہ جلیل نے اسے نئی زندگی دی تھی۔جلیل اگر چہ کچھ عرصے سے بیمار تھا لیکن فاطمہ کی دانست میں اس کی حالت

اتنی خراب بھی نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی انتقال کر جائے کیوں کہ ایک دن قبل ہی فاطمہ اس کی خبر گیری کے لئے گئی تھی اور اس کی حالت مستحکم تھی۔

''پاپا۔۔۔۔۔۔ یہ دیکھو فاطمہ آپا آگئی ہیں۔۔۔۔۔۔ آنکھیں کھولو پاپا۔۔۔۔۔آپ اس سے ملنا چاہتے تھے نا۔۔۔۔۔۔؟''

وہاں پہنچتے ہی شارق نے جلیل کے سرہانے بیٹھ کر کئی بار فاطمہ کی آمد کے بارے میں بتا کر اسے اٹھانا چاہا تھا لیکن وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں نہ جانے خود سے کیا بڑ بڑا رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر فاطمہ کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں اور وہ ماضی کی یادوں میں کھو کر دل ہی دل میں جلیل کے احسانوں کو یاد کرنے لگی۔۔۔۔

پندرہ سال پہلے قسمت نے فاطمہ کو ایک سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کا جوان بیٹا کالج سے گھر لوٹتے ہوئے نامساعد حالات کا شکار ہو کر اچانک زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جوان بیٹے کی اچانک اور المناک موت سے فاطمہ کی دنیا ہی لٹ گئی۔ بیٹے کی جدائی کے غم سے وہ سہم کر رہ گئی، اس نے کھانا پینا، بولنا، چلنا پھرنا سب چھوڑ دیا، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں کے آنسوں بھی خشک ہوگئے اور وہ کمرے کی چار دیواری کے اندر بُت بن کے رہ گئی۔ کچھ دنوں تک رشتہ دار اور ہمسائے اُس کے دکھ میں شریک رہتے ہوئے اُس کی ڈھارس بندھاتے رہے لیکن آخر سب اپنے اپنے مسائل میں اُلجھ کے رہ گئے، لیکن خلوص اور انسان دوستی کی شبنم سے لبریز جلیل، جوان کا ہمسایہ تھا اور کافی عرصہ تک ان کا گھریلو ملازم رہا تھا اور فاطمہ نے اسے اپنے بھائی کی طرح مانا تھا، فاطمہ کی اس حالت پر سخت فکر مند اور پریشان ہو گیا۔ وہ کسی بھی طرح فاطمہ کو اس غم سے نکالنا چاہتا تھا اور ہر شام ان کے گھر آکر اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے مختلف طریقوں سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا تھا لیکن فاطمہ کی حالت دن بہ دن خراب ہی ہوتی جارہی تھی۔ گھر والوں نے بڑے بڑے ماہرین نفسیات سے فاطمہ کا علاج کروایا لیکن اس کی حالت میں رتی بھر بھی فرق نہیں آیا۔ فاطمہ کی اس حالت سے بے چین جلیل نے اس کے زخموں پر مرہم کا پھاہا رکھنے کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں آزمائیں لیکن اس کی کوئی بھی ترکیب کام نہیں آئی۔

''فاطمہ۔۔۔۔۔۔۔میری بہن، اب یہ رونا دھونا بند کرو اور خوش ہو جاؤ''۔

ایک شام جلیل قسم بہ قسم کے میوے لے کر کافی خوش و خرم فاطمہ کے گھر میں وارد ہوا اور ہنستے ہنستے پر اعتماد لہجے میں فاطمہ سے کہا۔

''کیسے خوش ہو جاں میرے بھائی۔۔۔۔۔۔۔میرے دل کا قرار تو۔۔۔۔۔''۔

''آج کے بعد تیرے سارے دکھ اور پریشانیاں رخصت''۔

جلیل نے ایک ادا سے کہا۔

''وہ کیسے؟''

فاطمہ، جس کی آنکھوں میں درد کا بیکراں سمندر پنہاں تھا اور چہرے سے کرب و اضطراب پسینے کی قطروں کی طرح ٹپک رہا تھا، نے حیران ہو کر رندھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بتاؤں گا، لیکن کسی سے کہنا مت''۔

کہتے ہوئے جلیل نے فاطمہ کے نزدیک بیٹھ کر راز داری کے انداز میں اسے کچھ کہا اور وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے، جس کے ساتھ ہی کئی مہینوں بعد فاطمہ کے غمزدہ چہرے پر خوشی کی ہلکی سی پرچھائیاں نمودار ہونے لگیں اور اس نے افراد خانہ کے ساتھ کھانا بھی کھایا، کچھ دیر ان سے ادھر اُدھر کی باتیں بھی کیں اور جلدی سو گئی۔ اس دن کے بعد ہی اس کی حالت دھیرے دھیرے سدھرنے لگی اور وہ معمول کی زندگی کی طرف واپس لوٹنے لگی۔ فاطمہ کے افراد خانہ اس بات پر حیران تھے کہ آخر جلیل نے فاطمہ سے ایسا کیا کہا کہ کئی مہینوں کے بعد اس کی حالت اچانک سدھرنے لگی۔ کئی بار اس کے شوہر اور بھائی بہنوں نے اس سے اس بارے میں پوچھ کر جاننا بھی چاہا لیکن اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ یہ ایک راز ہے جو میں کسی سے نہیں کہہ سکتی۔ اس دوران جلیل فاطمہ کے گھر آکر اس سے ملتا تھا اور اس کی حالت میں سدھار دیکھ کر کافی خوش ہوتا تھا۔

وقت کا پرندہ پر لگا کر جس تیزی سے اپنا سفر طئے کرتا رہا اسی تیزی سے فاطمہ کے زخموں پر بھی مرہم کا پھاہا لگتا گیا یہاں تک کہ وہ بالکل ٹھیک ہو گئی اور اس کے اندر جینے کی نئی

امیدیں جاگ اٹھیں۔

''کوئی فاطمہ بہن کو بلاؤ۔۔۔۔۔۔''

فاطمہ دل ہی دل میں ماضی کی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھی کہ دفعتاً جلیل نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑایا۔

''میں یہاں ہوں میرے بھائی، کہو میں تمہارے لئے کیا کرسکتی ہوں؟''

فاطمہ کی آواز سن کر جلیل نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد مریل سے لہجے میں فاطمہ سے مخاطب ہوا۔

''بہن۔۔۔۔۔۔ میرے دل پر ایک بڑا بوجھ ہے، مرنے سے پہلے میں اس بوجھ کو اتارنا چاہتا ہوں''۔

اس نے اشارے سے کمرے میں موجود دوسرے لوگوں کو باہر جانے کے لئے کہا اور فاطمہ سے گویا ہوا۔

''فاطمہ بہن۔۔۔۔۔۔ علی بابا کے وہ مٹی کے دانے اور تعویز۔۔۔۔۔۔''

کہتے ہوئے اس کا دم گھٹ کر کانٹے کی طرح گلے میں پھنس گیا۔ وہ پھر سے بے ہوش ہوگیا اور فاطمہ کے ذہن میں پندرہ سال پہلے جلیل کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے اور آنکھوں میں آنسوؤں کے ڈورے تیرنے لگے۔۔۔۔۔۔

''دیکھو بہن۔۔۔ اللہ کچھ بھی کرسکتا ہے جیسے آگ میں انسان جل جاتا ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ اسلام کو آگ نے نہیں جلایا یا، انسان اس دنیا میں ماں اور باپ کے واسطے سے پیدا ہوتا ہے لیکن اللہ کے چاہنے سے حضرت عیسیٰ علیہ اسلام صرف ماں کے ذریعہ پیدا کیئے گئے۔ اللہ پاک کے اس غیبی نظام پر آپ کو یقین ہے؟''

''ہاں۔۔۔۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے''۔

''شاباش میری بہن، تو سنو۔۔۔۔۔۔ آج میں ایک بڑے پیر صاحب کے پاس گیا تھا جس نے یہ مٹی اور تعویز دیئے ہیں۔ آپ اللہ کا نام لے کر یہ تعویز گلے میں باندھنا اور یہ مٹی تکیئے کے نیچے رکھ کر سو جانا، پھر خواب میں اپنے بیٹے سے مل کر جتنی باتیں چاہو کر

لینا اور ہاں اس بات کا ذکر کبھی کسی سے ہر گز نہیں کرنا''۔

اس نے تاکید کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کون پیر صاحب؟ اس کا نام کیا ہے؟''

فاطمہ نے پوچھا تھا۔

''اس کا نام ------ہاں یاد آیا------علی بابا------''۔

اس نے سر کھجاتے ہوئے کہا تھا------ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا ہی کافی کے مانند فاطمہ نے بڑے یقین کے ساتھ تعویز گلے میں باندھا اور مٹی تکئے کے نیچے رکھ کر سوگئی۔ اللہ کا کرنا تھا کہ وہ مٹی اور تعویز فاطمہ کے لئے نعمت غیر مترکبہ ثابت ہوئے۔ اس رات اُس نے خواب میں بیٹے کی زیارت کر کے اس سے ڈھیر ساری باتیں کیں اور اس کے دل کو سکون مل گیا۔ اس کے بعد جب بھی اس کو بیٹے کی جدائی کا غم ستاتا تھا تو وہ مٹی کے دانے تکیے کے نیچے رکھ کر سو جاتی تھی تو اس کے من کی مراد پوری ہو جاتی تھی۔ فاطمہ کے دل میں علی بابا کا بے حد عقیدت واحترام تھا اور اس نے بہت دفعہ جلیل سے اُسے علی بابا کے پاس لے جانے کے لئے کہا تھا لیکن جلیل اس کو ہمیشہ ٹالتا تھا۔

''فاطمہ بہن------فاطمہ بہن------مجھے معاف کرنا------

اس دن میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔ میں کسی پیر صاحب کے پاس نہیں گیا تھا، وہ مٹی میں نے آپ کے ہی آنگن سے اٹھائی تھی اور وہ تعویز میں خود ہی کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچ کے بنایا تھا اور یہ سب کچھ میں نے صرف اس لئے کیا تھا کہ تمہاری حالت سدھر جائے کیوں کہ تمہارا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ معاف کرنا بہن------معاف------''۔

دفعتاً جلیل نے بے قراری کی حالت میں دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور تھکے سے لہجے میں فاطمہ سے مخاطب ہوا لیکن بات پوری ہونے سے پہلے ہی پھر بے ہوش ہو گیا اور چند لمحوں بعد ہی اس کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

☆☆☆

آئینہ

راشداوراس کی بیگم نے صبح صبح ہی شہر کے بڑے بازار کا رخ کیا اور ایک مشہور شاپنگ مال کے سامنے گاڑی پارک کر کے اندر جا کے خریداری کرنے میں مصروف ہو گئے۔ دوپہر کے وقت وہ ڈھیر سارے مہنگے کپڑوں، جوتوں، چپلوں، پرفیوم اور گھر کی سجاوٹ کے قسم بہ قسم سامان کی خریداری کرنے کے بعد مال سے واپس نکلے اور سامان کو گاڑی میں رکھنے لگے، لیکن سامان اتنا زیادہ تھا کہ گاڑی میں سمیٹ نہیں پا رہا تھا......

''صاحب......اللہ کے نام پر کچھ دے دو''۔

ایک عمر رسیدہ خاتون نے راشد، جو سامان گاڑی میں رکھنے میں مصروف تھا، کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا، لیکن اس نے خاتون کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ چند ساعتوں بعد خاتون نے پھر اپنا سوال دہرایا تو وہ غصے میں آ کر جنگلی بلے کی طرح غرایا۔

''نان سنس......تمہیں دکھ نہیں رہا ہے کہ میں کام کر رہا ہوں، مفت کی روٹیاں توڑنے کی عادت ہو گئی ہے تم لوگوں کو......دفع ہو جاؤ یہاں سے''۔

راشد کی اس بے عزتی سے بزرگ خاتون کے آنکھوں کے تالاب بھر گئے......

''اوہو راشد......کیوں ٹوک رہے ہو بے چاری کو، یہ لیجئے ماں جی''۔

راشد کی بیگم نے خاتون کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے کہا اور وہ اسے دعائیں دیتے ہوئے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی مسٹر اینڈ مسز راشد بھی گاڑی میں بیٹھ کر خوشی خوشی گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد گھر کی سجاوٹ

اور دوسری تیاریوں میں جٹ گئے کیوں کہ اگلے ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔

راشد ایک اچھے سرکاری عہدے پر فائیز تھا۔ اچھی تنخواہ کے ساتھ ساتھ چائے اور تحفوں کی آڑ میں اچھی خاصی اوپری کمائی بھی ہو رہی تھی، وہ نہات ہی ٹھاٹھ سے زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے پاس اچھا اور ہر سہولیت سے مزین گھر اور اعلیٰ قسم کی قیمتی گاڑی تھی، جب کہ وہ نہایت ہی قیمتی لباس اور قیمتی جوتے استمال کرنے کے ساتھ ساتھ بہترین سے بہترین غذائیں کھانے کا دیوانہ تھا۔ غرض وہ نہایت ہی عیش پرست انسان تھا اور اپنی اور بیوی بچوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی دیر گئے تک سالگرہ کی تیاریوں میں مصروف رہے۔

صبح جب راشد نیند سے جاگا تو کچھ پریشان سا دکھ رہا تھا۔ اس کی حالت کو بھانپتے ہوئے بیگم نے اُسے پوچھا۔

''راشد......کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو''۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن آج رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے جسم پر بالکل بھی لباس نہیں تھا......میں بالکل ننگا اور پریشان تھا، بھوک اتنی لگی تھی جیسے میں نے بہت دنوں سے کچھ نہ کھایا ہو''۔

''اچھا تو یہ بات ہے......کہہ کر بیگم کھلکھلا کر ہنسنے لگی''۔

''تم ہنستی کیوں ہو؟''

''تمہاری باتوں پر......خواب میں انسان کچھ بھی دیکھتا ہے اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے''۔

بیگم نے ایک ادا سے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا جسے وہ مطمئن ہو گیا اور بات آئی گئی۔ کچھ دیر بعد ہی مہمان آنا شروع ہو گئے اور وہ ان کے استقبال اور خاطر تواضع میں جٹ گئے۔ سہ پہر تک ان کی سالگرہ کی شاندار تقریب چلتی رہی جس دوران رقص و سرور کی محفلوں کے ساتھ ساتھ شرکائے تقریب قسم بہ قسم کی ضیافتوں سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔ مہمانوں کے چلے جانے کے بعد وہ دونوں تھکان دور کرنے کے لئے صوفے پر ستانے بیٹھ گئے۔

شام کو وہ تیار ہو گئے اور بچوں کو ساتھ لے کر گھر سے فرط نشاط و انبساط میں جھومتے ہوئے بازار کی طرف نکلے کیوں کہ سالگرہ کی خوشی میں انہوں نے شام کا کھانا کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانے کا پروگرام بنایا تھا۔ شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں راشد، جو اچھے کھانوں کا رسیا تھا، نے انواع قسم کی ضیافتیں منگائیں، انہوں نے خوب کھایا پیا اور سیر ہو کر دیر رات واپس گھر پہنچ گئے۔

''صاحب ...... پڑوس میں رہنے والی آنٹی آئی تھی کہتی تھی کہ اس کا شوہر بیمار ہے......''۔

''گھر پہنچتے ہی نوکر نے راشد سے کہا''۔

''تو......؟''

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

''صاحب......وہ کہتی تھی کہ اگر صاحب میری کچھ مدد کریں تو میں اپنے شوہر کا علاج کر سکوں۔ صاحب وہ بہت روتی تھی''۔

''صاحب کے پاس کیا کوئی نوٹ چھاپنے کی مشین ہے، جو میں لوگوں میں بانٹتا پھروں''۔

اس نے مغرور لہجے میں نوکر کو ٹوکتے ہوئے کہا، تکبر کے پہاڑ لئے اپنی خواب گاہ میں داخل ہو کر ٹیلیویزن آن کیا اور کچھ دیر نظارے دیکھنے کے بعد دوسری موج مستیوں میں لگ گیا.....

''ارے یہ کیا ......؟''

راشد، گھر کے صحن میں اپنے سامنے سفید لباس میں ملبوس ایک مریل سے شخص جو بالکل اس کا ہم شکل تھا، کو دیکھ کر چونک گیا۔

''اے......کون ہو تم ؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں......میں......''۔

وہ مسکراتے ہوئے بڑبڑایا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

''کیا چاہیے، کپڑے، کھانا، روپے......؟''

راشد نے بھکاری سمجھ کر اسے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

لیکن اسنے نفی میں جواب دیا اور کچھ دیر حقارت بھری نظروں سے راشد کو گھورنے کے بعد دوسری طرف مُنہ پھیرلیا۔

''دیکھو آج میری شادی کی سالگرہ ہے اور میں بہت خوش ہوں، چلو میں تجھے اچھا سا کھانا کھلاؤں اور پہننے کے لئے نئے کپڑے بھی دے دوں''۔

اس پر ترس کھا کر راشد کا رویہ اچانک بدل گیا۔

''ان لذیز ضیافتوں سے میرا نہیں اس خاکی وجود کا پیٹ بھرتا ہے جس پر تم ناز کرتے ہو اور سجانے سنوارنے کے لئے دن رات ایک کرتے ہو، لیکن......؟''

اس نے معصوم سے انداز میں شان بے نیازی سے راشد کی پیش کش کو ٹھکرادیا۔

''لیکن کیا......؟''

''تم نے اپنے جینے کا جو مقصد بنایا ہے، میں ان چیزوں سے بالکل بے پرواہ ہوں میری غذا ڈھونڈنے کی فکر کرو فائیدے میں رہو گے ورنہ تمہارا خاکی پتلا ایک دن مٹی میں مل جائے گا اور تم ہمیشہ بھوکے ننگے ہاتھ ملتے پریشان رہو گے''۔

اس نے دوٹوک انداز میں کہا جس دوران اس کی آنکھیں بھیگ گئی۔ جب کہ اس کی بات سن کر راشد کے چہرے پر بھی پشانی کے آثار نمودار ہوگئے۔ اُسے لگا جیسے اس کے مُنہ میں زبردستی کڑوی گولیاں ٹھونسی جارہیں ہوں۔

''تم کیا کہتے ہو میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ سیدھی طرح سے کہو کیا کہنا چاہتے ہو''۔

''تو سنو...... مختصر بات یہ ہے کہ تم نفس پرستی کی نیلام گاہ میں نیلام ہو کر لذت پرستی کے ظلمت کدے میں بٹک رہے ہو، لیکن ابھی بھی مہلت ہے کہ کچھ اپنے ہوش وحواس سے کام لے لو ورنہ...... خیر اس سے زیادہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا''۔

''لیکن......لیکن......''۔

چلاتے ہوئے راشد اپنا سر پکڑ کر اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

''شکل وصورت سے تو تم بالکل میرے جیسے ہو، لیکن تم ہو کون؟''

''میں ......میں تمہارے ہی وجود کا حصہ ہوں، لیکن تم فنا ہونے والے مٹی کے پتلے کے ناز اٹھاتے اٹھاتے امر رہنے والے اس وجود کو بالکل فراموش کر چکے ہو۔ مجھے پہچاننے کی کوشش کرو اور اس آئینے میں اپنی اصلی صورت دیکھو۔ اچانک وہ ایک بڑے آئینے میں تبدیل ہو گیا جس میں راشد کو اپنی رزالت، خباثت اور بگڑی ہوئی صورت صاف نظر آنے لگی۔ اپنے وجود پر لگے تکبر، ریاکاریوں اور سیاہ کاریوں کے بدنما داغ دبوں کو دیکھتے دیکھتے درد کی ایک تیز ٹیس اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی، اس نے چیخنا چلانا چاہا لیکن اس کا دم گھٹ کر کانٹے کی طرح گلے میں پھنس گیا جس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

☆☆☆

خواجہ صاحب

''خواجہ صاحب...... چوک میں وہ ایک معذور ٹھیلہ لگا کر بیٹھتا ہے، اس کے لئے بھی کچھ دے دیں، بے چارے کا ایک بازو بے کار ہے''۔

عنایت نے دھیمے لہجے میں خواجہ صاحب سے کہا لیکن اس نے عنایت کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ عید کی آمد آمد تھی اور خواجہ صاحب صبح سے ہی غریبوں میں صدقہ زکوات بانٹ رہا تھا۔ ابھی بھی خواجہ صاحب کے سامنے چار پانچ خواتین بیٹھی تھیں اور خواجہ صاحب ان میں فی کس تین سو روپیہ بانٹ رہا تھا۔ خواجہ صاحب کا شمار شہر کی معروف تجارتی شخصیات میں ہوتا تھا۔ اس کے پاس کافی سرمایہ بھی تھا، وہ ہر سال عید کے موقعے پر غریبوں مسکینوں کی مدد کرتا تھا اور یہ بات مشہور تھی کہ خواجہ صاحب بڑا ہی دیالو اور دریا دل انسان ہے۔ خواجہ صاحب کا منشی عنایت ایک نیک دل انسان تھا۔ آتے جاتے اس معذور ٹھیلے والے کو دیکھ کر اس کو ترس آتا تھا جو اپنا ایک بازو بے کار ہونے کے باوجود صبح سے شام تک مشقت کرتا تھا۔ وہ انتہائی با اخلاق اور نرم دل انسان تھا، ہر ایک سے انتہائی محبت سے پیش آتا تھا۔ عنایت کبھی کبھی بلا ضرورت بھی اسے کچھ نہ کچھ خریدتا تھا اور اکثر اُسے پوچھتا تھا۔

''بھائی صاحب...... کیسا کام چل رہا ہے؟''

''شکر اللہ کا، بہت اچھے سے گزارہ ہو رہا ہے''۔

اس کا ہمیشہ یہی جواب ہوتا تھا۔

''حبلہ...... یہ لے اور جا کے پہلے پارک کی صفائی کرنا پھر گھر جانا''۔

عنایت اس ٹھیلے والے کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ خواجہ صاحب، جواب تک فون پر کسی سے بات کر رہا تھا، نے ایک بیوہ کے ہاتھ میں تین سو روپے رکھتے ہوئے مغرور سے لہجے میں کہا۔

''جی خواجہ صاحب''۔

حبلہ نے کہا اور خواجہ کو دعائیں دیتے ہوئے پارک کی صفائی کرنے چلی گئی۔

''زونی.....آج بہت دنوں بعد نظر آئی، کہاں غائب تھی؟''

''خواجہ صاحب......میں بہت دنوں سے بیمار ہوں......''۔

''ڈیڈی.....ہم بازار جا رہے ہیں، مجھے اپنے لئے کپڑے خریدنے ہیں، وہیں سے عید کے لئے بیکری اور دوسری چیزیں بھی خریدیں گے''۔

دفعتاً خواجہ صاحب کی لاڈلی بیٹی آ کر بیچ میں بولی۔

''یہ لو بٹیا، شوق سے جاؤ''۔

خواجہ نے دائیں جانب رکھی الماری سے نوٹوں کی گڑی نکال کر اس کو دیتے ہوئے کہا۔

''ڈیڈی......صرف دس ہزار، مجھے اپنے لئے کپڑے خریدنے ہیں''۔

''یہ لو بیٹا......''۔

اس نے دوسری گڑی نکال کر اس کو دیتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو ڈیڈی......یو آر گریٹ''۔

کہہ کر وہ چلی گئی۔

''یہ لو زونی، باغیچے کے لئے دس پندرہ بوریاں گوبر بھیجنا''۔

بیٹی سے فارغ ہو کر خواجہ صاحب نے تین سو روپے زونی کو دیتے ہوئے کہا جس کے بعد رحمی کا نمبر تھا، جو اٹھ کر خواجہ صاحب کے سامنے آ گئی۔

''سلام خواجہ صاحب.....''۔

اسی وقت ایک نوجوان آیا اور ایک بند برتن، جس سے پکے ہوئے گوشت کی

خوشبو آ رہی تھی، خواجہ کے سامنے رکھتے ہوئے گویا ہوا۔

''میں الکریم ہوٹل سے آیا ہوں۔ سیٹھ نے یہ تحفہ خاص آپ کے لئے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ عید کے لئے اپنا آڈر بک کرائیں''۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے میں تو اس بارے میں سیٹھ کو فون کرنے ہی والا تھا۔ عنایت، ذرا مالکن کو بلاؤ''۔

''جی خواجہ صاحب......''۔

چند لمحوں بعد مالکن آ گئی۔

''بیگم......تم اس کو بتاؤ کہ عید کے لئے کون کون سا پکوان بنانا ہے؟''

خواجہ نے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اجی بتانا کیا ہے، بیٹیاں اور داماد بھی آ رہے ہیں۔ پورے گیارہ اقسام کا وازہ وان ہونا چاہیے اور ساتھ میں تندوری مرغ بھی اور ہاں سمبندیوں کے لئے تندوری مرغوں کا ایک بڑی سی دیگ الگ سے''۔

بیگم نے ہوٹل سے آئے ہوئے لڑکے کو تفصیل سے عید کے لئے پکوانوں کا آڈر دیا جب کہ خواجہ صاحب نہ جانے کن سوچوں میں گم ہو گیا۔

''خواجہ صاحب......مجھے......''۔

''رحمی نے خواجہ صاحب کی نظر کرم حاصل کرنے کے لئے کچھ کہنا چاہا''۔

''عنایت......ان سب کو تین تین سو روپے دے دو''۔

خواجہ نے رحمی کی بات کاٹ کر وہاں بیٹھی عورتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ رقم عنایت کو دی اور اٹھ کر جانے لگا۔

''خواجہ صاحب......میرا شوہر سخت بیمار ہے، اس کے علاج پر بہت رقم خرچ ہو رہی ہے اور میں بڑی امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں، کچھ زیادہ......''۔

رحمی نے انتہائی عاجزی سے کہا۔

''یہاں کیا پیڑوں کو روپے پڑتے ہیں جو میں تم لوگوں میں بانٹتا پھروں۔ اگر یہ

تین سو لینے ہیں تو لے لو نہیں تو مجھے تنگ مت کرو اور اپنا راستہ ناپو"۔

خواجہ نے غصے بھرے لہجے میں رحمی کی بے عزتی کرتے ہوئے کہا، غربت کی تپش میں نڈھال رحمی کی آنکھیں درد کے بیکراں ساغر میں تبدیل ہو گئیں اور وہ بغیر کچھ کہے وہاں سے چلی گئی۔ جب کہ خواجہ کے اس رویے سے عنایت کے وجود میں بھی درد کی ایک تیز ٹیس دوڑ گئی، لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

"چلو بند کرو یہ بہی کھاتہ، اب اگر کوئی مانگنے آئے تو کہنا خواجہ صاحب یہاں نہیں ہیں"۔

"بہتر جناب، خواجہ صاحب میں نے آپ کو اس معذور ٹھیلے والے کا کہا تھا۔ بہت غریب ہے بے چارہ"۔

"غریب ہے تو خود کیوں نہیں آیا؟"

"خواجہ صاحب......وہ بڑا خوددار ہے، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا"۔

"چلو یہ دو سو روپے اس کو بھی دے دو"۔

خواجہ نے الماری سے دو سو کا نوٹ نکال کر عنایت کو دیتے ہوئے کہا اور الماری کو تالا لگا کر چلا گیا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد عنایت نے بے دلی سے نوٹ جیب میں رکھا اور کھاتے پر حساب دیکھ کر گننے لگا......

"حبلہ......زونی......مختی......رحتی......وغیرہ"۔

صدقہ زکوات کے نام پر دیا لو خواجہ صاحب نے کل ملا کر پانچ ہزار سے کچھ کم رقم بانٹی تھی۔ عنایت نے بہت کوشش کی کہ وہ جا کے معذور ٹھیلے والے کی کچھ مدد کرے لیکن کام میں الجھا رہنے کی وجہ سے نہیں جا سکا۔ یوم عرفہ کے دن افتیاری سے پہلے ہی وہ گھر کے لئے نکلا اور اس جگہ پہنچا جہاں وہ معذور ٹھیلہ لگا کر بیٹھتا تھا لیکن وہ ٹھیلہ بند کر کے چلا گیا تھا۔ عنایت تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے پاس ہی دوسری گلی میں واقع اس کے گھر پہنچا، وہاں اس کے پاس تین چار خواتین بیٹھی تھی۔

''ارے صاحب......آپ اس غریب خانے پر کیسے، کوئی حکم؟''

معذور نے عنایت کو دیکھ کر بے اختیار پوچھا۔

''کوئی حکم نہیں، میں نے سوچا آپ سے ملاقات کروں''۔

''زہے نصیب.....اس نے خوش ہو کر کہا''۔

اسی لمحے وہ خواتین رخصت لے کر اسے دعائیں دیتے ہوئے چلیں گئیں۔ جانے سے پہلے اس نے ان خواتین سے کہا۔

''جب بھی کوئی ضرورت ہو تو بلا جھجھک اس غریب بھائی کے پاس آیا کرو''۔

عنایت مخمصے میں پڑ گیا کہ اب کیا کرے، چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کے لئے رکھی ہوئی تھوڑی سی رقم نکالی اور واپس نکلنے کے لئے اٹھا لیکن اس نے بالکل نہیں مانا اور ہاتھ پکڑ کر اس کو بٹھایا۔ عنایت نے یہ سوچ کر رقم واپس رکھی کہ جاتے وقت ہی دینا ٹھیک رہے گا۔ اسی لمحے اس کی بیوی مشروبات اور میوے سے بھرے پلیٹ لے کر آ گئی، افتیاری کا وقت بھی ہو گیا اور دونوں روزہ کھولنے کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کچھ منٹوں بعد ہی رحمی کمرے میں داخل ہوگئی جس سے دیکھ کر عنایت حیرت زدہ ہو گیا۔

''رحمی بہن.....خیریت اس وقت کیسے آنا ہوا، اب کیسی طبیعت ہے تمہارے شوہر کی؟''

اس معذور نے انتہائی شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے، آج کافی افاقہ محسوس ہو رہا ہے۔ یہ کچھ پیسے بچے ہیں......''۔

''اجی......آپ ایک منٹ یہاں آئیں''۔

اسی وقت اس معذور کو بیوی نے بلایا اور وہ کچن میں چلا گیا۔

''رحمی بہن......یہ کیسے روپے ہیں؟''

عنایت نے رحمی سے پوچھا۔

''کیا بتاؤں منشی جی، کل جب خواجہ صاحب کے گھر سے بے عزت ہو کر نکلی تو

پریشانی کے عالم میں سیدھے اس کے پاس پہنچ گئی اور اس کو اپنا حال سنایا۔ اس کے جیب میں اس وقت جتنی رقم تھی اس نے سب مجھے تھمادی، اپنے شوہر کا علاج معالجہ کر کے یہ دو ہزار بچے ہیں اور میں نے سوچا اس کو واپس کر دوں......"۔

رحمی کی بات سن کر عنایت کے عقل کے طوطے اڑ گئے، اس لمحے وہ کچن سے واپس آ گیا اور عنایت اس سے اجازت لے کر خواجہ صاحب کی دریا دلی پر ماتم کرتے ہوئے انتہائی شرمندگی کی حالت میں وہاں سے واپس نکلا۔

☆☆☆

سُرخ بادل

کئی روز بعد ٹینکوں کی گڑ گڑاہٹ، توپوں اور گولیوں کی دھنا دھن اب بند چکی تھیں، فضا میں اڑ رہے جنگی طیاروں کی چنگھاڑ بھی کسی حد تک خاموش ہو چکی تھی۔ سارے شہر میں اگر چہ ہر طرف قبرستان کی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور شہر کے لوگوں کے ساتھ ساتھ خوش گلو پرندے بھی خوف سے سہمے ہوئے تھے لیکن شہر کے اسپتالوں میں ہو کا عالم تھا، جہاں ہر طرف شور شرابہ اور چیخ و پکار سنائی دے رہی تھیں۔ زخموں سے چور سینکڑوں مرد و زن اور معصوم بچے درد سے کرا رہے تھے، کئی زخموں کی تاب نہ لا کر دم توڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر ریتا، جو اس خوفناک صورتحال سے سخت پریشان اور مغموم تھی، دن بھر مریضوں کے علاج و معالجے میں میں مصروف رہنے کے بعد تھکی ہاری شام ڈھلتے اسپتال سے گھر کی طرف نکلی۔ اس کا انگ انگ جیسے درد میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ گاڑی بھی ٹھیک سے نہیں چلا پا رہی تھی۔ ہر طرف بارود کی بو اور ویرانی پھیلی ہوئی تھی اور شہر کی ویران اور سنسان سڑکیں اُسے کاٹنے کو دوڑ رہیں تھیں۔ آسمان پر چھائے کالے بادلوں کو دیکھ کر اسے اور زیادہ خوف اور گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی اور اس کے جسم سے ٹھنڈے پسینے کے قطرے چھوٹ رہے تھے......

''میڈم......آج آپ کو اتنی دیر کیوں ہوگئی؟''

گھر میں قدم رکھتے ہی اس کی خادمہ سیما نے اُسے پوچھا۔

''کچھ نہ پوچھو سیما......بہت برا حال ہے''۔

اس نے اداس لہجے میں جواب دیا اور صوفے پر بیٹھ کر ٹیلیویزن آن کیا......

''اُف......اس بکواس کے سوا نہیں دکھانے کے لئے کچھ نہیں ہے''۔

کچھ دیر ریموٹ ہاتھ میں لئے چینلیں بدلنے کے بعد اس نے جھنجھلا کر ٹیلیویزن، جہاں نیوز چینلوں پر جا بجا لڑائی کے خون ریز اور تباہ کن مناظر دکھائے جا رہے تھے اور چرب زبان اینکر خوب نمک مرچ لگا کر خبروں کی تشہیر کر کے بڑی فنکاری اور چابک دستی سے جنون کو ہوا دینے کی کوشش کر رہے تھے، بند کیا اور صوفے پر دراز ہو کر گہرے سوچوں میں ڈوب گئی۔اس کے ذہن پر اسپتال کے کربناک مناظر سوار تھے، زخموں سے چور درد سے کراہتے ہوئے انسان......کسی کی ٹانگ نہیں تو کسی کا بازو کٹا ہوا......کسی کے سر تو کسی کے پیٹ میں گہری چوٹ......کئی معصوم انسان ریتا کی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ریتا جو ایک حساس ذہن لڑکی تھی یہ سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ تعلیم وترقی کی حیرت انگیز بلندیوں کو چھونے، ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے ساتھ ساتھ نسل آدم ترقی کے ہر زینے پر اپنی ہلاکت کا سامان بھی نصب کر رہا ہے اور انسان ہی انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔مرد وزن اور معصوم بچوں کو بے دردی سے جرم بے گناہی کی پاداش میں موت کے مُنہ میں دھکیل دیا جاتا ہے۔دھرتی پر نئے نئے قبرستان سج رہے ہیں، بے وقت کی چتائیں اٹھ رہی ہیں، سہاگنیں بیوہ اور بچے یتیم ہو رہے ہیں۔بزرگ اپنے جوان ویروں کے جنازوں کو کندھا دینے اور چتاؤں کو آگ دینے پر مجبور ہو رہے ہیں...... جائیدادیں تباہ وبرباد ہو رہی ہیں......

''یہ کیسا جنون ہے......؟ کیا دشمنی کی ان دیواروں کو مسمار کر کے دوستی اور محبت کی قندیلوں کو روشن نہیں کیا جا سکتا؟''

سوچتے سوچتے دفعتاً ریتا کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور وہ خود سے بڑبڑائی۔

''ہاں ایسا ہو سکتا ہے لیکن......؟''

اس کے اندر سے آواز آئی اور وہ پھر سے سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی۔

مردار خوری کی جبلت رکھنے والے گدھ اپنے گندے مفادات کے حصول کے لئے اس جنون

کو ہوا دینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے ہیں، بھائی کو بھائی سے لڑا رہے ہیں، دھرتی پر خون کی ندیاں بہانا چاہتے ہیں۔ایسا جنون رکھنے والے سیاہ کار شاید ماضی کی خوفناک تاریخ کی تلخ یادوں سے کوئی سبق حاصل نہیں کرنا چاہتے۔اسی جنوں کے سبب دھرتی کے کئی حصے ویران صحرا کا روپ دھارن کر چکے ہیں، جو اب بھی بھانجھ عورت کی طرح اپنے نصیب کو کوس رہے ہیں، جہاں نہ کوئی سبزہ اگتا ہے، نہ پیڑ اور نہ ہی کسی قسم کا اناج، جہاں اب بھی اپاہج بچے پیدا ہوتے ہیں۔قریب ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی ایک لمحے کی جنوں کی بھرپائی نہیں ہو پا رہی ہے۔اس صورتحال سے باخبر ہونے کے باوجود تباہی کے تاجر حکمران کرہ ارض پر اپنے طاقت کا سکہ جمانے اور ایک دوسرے پر سبقت لینے کے لئے اپنی اپنی سلطنتوں میں زیادہ سے زیادہ تباہی پھیلانے والے ہتھیار جمع کر رہے ہیں جنہوں نے دنیا کو خطرناک بارود کے ایک ایسے ڈھیر پر لا کھڑا کر دیا ہے جسے بھسم کرنے کے لئے صرف ایک چنگاری ہی کافی ہے۔انسانیت پر منڈلا رہے جنگ کے بادلوں کی تباہ کاریوں سے فکرمند سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن ریتا، جس کا سر تیز رفتار موٹر کے پہیے کی طرح گھوم رہا تھا، پر دفعتاً غنودگی سی چھا گئی......

"آسمان پر یہ خون جیسے سرخ بادل.....اے اوپر والے رحم فرماؤ......"۔

آسمان پر چھائے سرخ بادل دیکھ کر ریتا کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہا... ہا... ہا... یہ سرخ بادل جب برسیں گے تو دھرتی اور یہاں موجود سب مخلوقات آن کی آن میں بھسم ہو کر رہ جائینگے اور یہی ہمارا مقصد ہے..... ہا... ہا... ہا..."۔

ایک کالے رنگ کا بدصورت ہیولا جس کی آنکھیں سرخ انگارے جیسی تھیں نے اس کے سامنے نمودار ہو کر زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے بولا۔

"نہیں......نہیں.....ایسا نہیں ہوگا، ہرگز نہیں......"۔

"تو پھر کیسا ہوگا......ساری دھرتی جو ہمارے سرخ بادلوں کے سائے میں ہے ......ایک دن یہ بادل برس کے ہی رہینگے ... ہا... ہا... ہا......"۔

"کون ہو تم......ایسا نہیں ہوگا......ہرگز نہیں......ہرگز نہیں......"۔

بڑبڑاتے ہوئے اس کی آنکھ کھلی اور وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ اوپر سے نیچے تک پسینے میں شرابور ہو چکی تھی، اس نے پانی کے چند گھونٹ ہلک سے نیچے اتارے اور اپنے آپ کو سنبھالنے لگی۔ کئی دنوں سے اسے یہی سپنا آرہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بار بار اسے یہی ڈراونا سپنا کیوں آرہا ہے؟

''میڈم......آپ ہاتھ مُنہ دھو لیجئے، میں کھانا لگا دیتی ہوں''۔

سیما کی آواز سے وہ سوچوں کی دنیا سے باہر آگئی۔

''سیما...... پاپا آگئے کہ نہیں''۔

''میڈم......صاحب تو کب کے آگئے''۔

''اچھا تم جاؤ میں ابھی آتی ہوں''۔

اب اس کے ذہن پر حالات کی سنگین صورتحال اور سرخ بادلوں والے ڈراونے سپنے کی دوہری مار ہتھوڑے بن کر برس رہیں تھیں۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے وہ یہ ساری باتیں اپنے پاپا سے شیر کرے گی، وہ اکثر پاپا کے ساتھ دنیا کے موجودہ حالات پر گفتگو کررہی تھی اور موجودہ سیاسی نظام کی بھی کافی حد تک جانکاری رکھتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر فریش ہونے کے لئے واش روم کی طرف گئی۔

''سر......بہت خون خرابہ ہو چکا ہے، عوام کی حالت دن بہ دن خراب ہورہی ہے اور غیر یقینی حالت کے چلتے ہر طرف قحط جیسی صورتحال ہے......''۔

دفعتاً اس کی سماعتوں سے اس کے پاپا، جو ایک بڑا سیاستدان تھا، کے اسسٹنٹ کی آواز ٹکرائی۔

''یہ سب کرنا ہماری مجبوری ہے اور مجبوری میں ایسی قربانیاں دینی پڑتی ہیں''۔

اس نے اسسٹنٹ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ پاپا کی بات سن کر وہ رک کر ڈرائینگ روم کی طرف کان لگا کر سننے لگی۔

''سر......ہمارے ساتھ ساتھ دشمن کے پاس بھی بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں......''۔

''تو کیا ہوا، دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں ہمارے ساتھ ہیں اس لئے ہمیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

''سر......ان کے ساتھ بھی کئی بڑی طاقتیں ہیں''۔

''وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور ہم ان سب کو ملیامیٹ کر کے رکھ دینگے''۔

اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

''اور وہ تماشہ دیکھیں گے......؟''

اسسٹنٹ پہلے طنزیہ انداز میں دیرے سے بڑبڑایا اور پھر گویا ہوا۔

''مگر سر......ہمارا بہت زیادہ سرمایہ اس مجبوری کی نظر ہو رہا ہے اور کروڑوں ڈالر کے تباہ کن ہتھیار خریدنے سے عوام بنیادی سہولیات سے محروم ہو کر بھکمری کا شکار ہو رہا ہے''۔

''بھاڑ میں جائے تمہاری عوام ......ساری دنیا پر اپنی طاقت کا سکہ بٹھانے کے لئے ہمارے لئے ایسا کرنا ضروری ہے، ورنہ ہماری ناک کٹ جائے گی اور ہاں، تمہیں ان مسئلوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، اپنے کام سے کام رکھو''۔

اس نے ناک سکیڑ کر سخت لہجے میں کہا۔ پاپا، جو ہر وقت محبت اور امن و شانتی کی گل افشائیاں کرتا رہتا تھا، کی یہ جنونی باتیں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح ریتا کے کانوں میں اتر گئی اور اس کے چہرے کے جغرافیہ میں ہل چل مچ گئی۔

''پاپا......ریتا نے اس پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالی اور چند سیکنڈ گھورنے کے بعد زور زور سے ہنسنے لگی''۔

''ریتا بیٹی......کیا بات ہے، تم ٹھیک تو ہو نا......''۔

''پاپا...... یہ سرخ بادل جب برسیں گے نا تو کچھ بھی نہیں بچے گا......تم بھی نہیں اور ہم بھی نہیں، کیوں کہ گیہوں کے ساتھ ساتھ گھن بھی پسے جاتے ہیں...... ہا... ہا... ہا...''۔

''سرخ بادل؟......کیسے بادل، کون سے بادل......؟''

وہ اپنی لاڈلی بیٹی، جس کے چہرے پر تناؤ کی گہری لکیریں صاف دکھائی دے رہیں تھیں، کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھا۔

"پاپا......آپ بہت سیانے ہیں... ہا... ہا... ہا......."۔

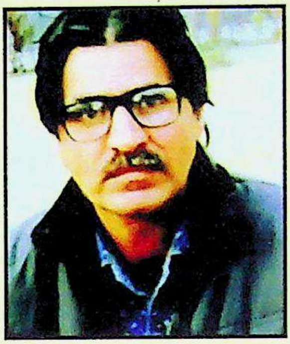
کہتے ہوئے ریتا پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی اور سرخ بادل، سرخ بادل رٹتے ہوئے عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگی۔ کچھ دیر تک ریتا کی حرکتوں کو غور سے دیکھنے کے بعد پاپا سخت پریشانی اور بے چینی کی حالت میں نفسیاتی امراض کے ماہر ڈاکٹر کو فون کر کے ریتا کی حالت کے بارے میں بتاتے لگا۔

☆☆☆

BE SIMT QAFLE

(Short Stories)

by : Tariq Shabnam



طارق شبنم (بانڈی پورہ کشمیر) کئی برسوں سے افسانے لکھتے آئے ہیں۔ ان کے افسانے رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اردو زبان وادب سے محبت رکھتے ہیں۔ ایک ادبی فورم ''ولرار دوادبی فورم'' کے صدر بھی ہیں، جس کے ذریعے کئی پروگرام بھی منعقد ہوئے ہیں اور اسی فورم کا ایک فیس بک گروپ بھی ہے، جس پر سال میں ایک بار افسانوی ایونٹ کا انعقاد بھی ہوتا ہے۔ آج تک اس ایونٹ میں پیش ہوئے افسانوں کی تین کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ طارق شبنم کو اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ اس طرح سے عیاں ہے کہ طارق شبنم فکری اور عملی طور پر ادب سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گمشدہ دولت'' 2020ء میں منظر عام پر آچکا ہے جس کو کافی سراہا گیا۔ پیش نظر مجموعہ ''بے سمت قافلے'' ان کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جو کہ چوالیس (44) افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں سے ظاہر ہے کہ افسانہ نگار کا مشاہدہ کافی وسیع ہے کیونکہ ان افسانوں میں مقامی موضوعات پر عمدہ کہانیاں موجود ہیں اور ساتھ ہی کئی افسانوں میں عالمی سطح کے موضوعات اور تہذیبی واخلاقی پیام کی حامل کہانیاں بھی نظر آتی ہیں۔ جیسے 'ٹھنڈا جہنم' 'اڑن طشتری' 'نیا شہر' 'ڈینجر زون' 'شکور بھنگی' 'سونے کا پیالہ' 'بے سمت قافلے' 'حی علی الفلاح' 'سوشل ڈسٹنس' وغیرہ۔

افسانہ ''نیا شہر'' کسی حقیقی واقعہ کی فنی پیش کش نہیں ہے بلکہ فنی طور پر یہ ایک ایسا افسانہ ہے جو خواب یا تمنا کے تخیل آمیز خیالات کا تخلیقی اظہار ہے۔ اس کے برعکس سماجی مشاہدے کی بات کریں تو افسانہ ''شکور بھنگی'' سماجی نوعیت کا ایک ایسا افسانہ ہے جو مرکزی کردار ''شکور بھنگی'' کی کردار نگاری میں حقوق العباد کی اہمیت وقبولیت کا متاثر کن تاثر چھوڑ رہا ہے۔ اسی طرح دوسرے کئی اور افسانے فنی اور پیامی ترسیل میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ امید ہے' قارئین اس مجموعے کو پسند فرمائیں گے۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

9906834877

GNK PUBLICATIONS
Website : www.gnkpublications.com
Email : gnkpublications@gmail.com
Mob : 7006738304, 9541123110

ISBN 978-81-19991-51-8
978-81-19991-51-8

₹400.00

GNK Publications GNK URDU gnk.publications GnkPublications